''چہارسُو''

..... کلیاتِ جاوید .....

عبداللہ جاوید کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر ہیں۔ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کی شاعری روایت اور جدت کا امتزاج ہے۔اظہار کا قرینہ اور دروبست کا شعور انہوں نے روایت سے لیا ہے جب کہ ذات اور اپنے سماج کی عصری کیفیات کے بیان کا رویہ عہدِ جدید کی دین ہے۔ان کے شعر میں تخلیقی برجستگی نمایاں ہے۔قدرت نے انہیں جو اظہار کی صلاحیت عطا کی ہے وہ ایک سے زائد اصناف میں بروئے کار آئی ہے۔انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ان کا مطالعہ وسیع ہے اور ماشاءاللہ حافظہ بھی قوی ہے،اس لیے دوسرے اساتذہ کے اشعار اور دوسری زبانوں کے ادبی حوالوں کو بھی برمحل استعمال کرتے ہیں۔

.....ڈاکٹر جمیل جالبی

مجھے آپ کی غزل اور نظم دونوں میں بہت کچھ لطف اور ذہنی اور روحانی بالیدگی کا سامان ملا۔آپ نے اپنے وسیع مطالعے کو بھی اپنی شاعری میں جگہ جگہ سمویا ہے۔

.....شمس الرحمٰن فاروقی

محترم عبداللہ جاوید ہمارے ان لکھنے والوں میں ہیں جنہوں نے حرف کو اعتبار اور معیار بلند عطا کیا ہے۔وہ معروف شاعر،صاحبِ دل افسانہ نگار، ژرف نگاہ ناقد اور باشعور کالم نگار ہیں۔اردو میں اس طرح کی ''معاونِ مطالعہ کتب'' کی کوئی روایت ہی نہیں تھی کہ اس افادیت کا اردو قارئین کو علم و اندازہ ہوتا۔آپ نے ایک منفرد خدمت اس طرح اردو زبان وادب کی انجام دی ہے اور قارئین اور قلم کاروں کو راستہ دکھایا ہے کہ مغربی زبانوں کی طرح اردو میں بھی اس طرح کی کوشش ہونا چاہئیں تا کہ ایک جانب قارئین اس طرح کے مواد سے استفادہ کر سکیں اور دوسری جانب اردو زبان وادب کا دامن بھی مزید وسیع تر ہو سکے۔آپ کی ایسی کوشش پر،آپ ساری اردو دنیا کی جانب سے شکریے اور استحسان کے مستحق ہیں۔یقیناً اس نوع کی کاوشوں کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اردو زبان وادب کا دامن یوں ہی مالا مال ہوتا رہے گا۔

.....عقیل دانش

اشاعت:۲۰۲۲ء، قیمت:۔/۲۵۰۰ روپے، دستیابی:اکادمی بازیافت،اردو بازار،کراچی

..... نقشِ برآب .....

شہناز خانم عابدی کہانی سلیقے سے لکھتی ہیں،کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔کہیں جھول کا احساس نہیں ہوتا۔نہ یہ شک گزرتا ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نہیں۔واقعہ جس طرح بیان ہوتا ہے،وہ ہمیں یقین دلاتا نظر آتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔کردار بھی صحیح طور پر نشو ونما کرتے ہیں۔ہر کردار اپنی پہچان الگ کراتا ہے۔

.....انتظار حسین

طبع زاد کہانیاں زندگی کرنے کے باب سے بھی زیادہ کٹھن اور محنت طلب ہوتی ہیں۔شہناز خانم عابدی کی موجودہ تخلیقی شرکتیں گواہی دیتی ہیں کہ وہ اوّل بھی تخلیق کار ہے اور آخر بھی۔خدا اُسے لکھنے کی صعوبت سے عہدہ برا ہو پانے کے ذرائع اور ہمت عطا کرتا رہے۔

.....جوگندر پال

میں آپ کے افسانوں سے،لکھنے کے انداز اور زبان سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔بہت صاف زبان ہے،اس میں وہ سادگی اور روانی ہے جو مغربی ممالک میں رہنے والے افسانہ نگاروں کی تصنیف میں اکثر نہیں ہوتی ہے۔۔۔میں سمجھتی ہوں کہ آپ کے افسانوں کو نا صرف کینیڈا کے اردو ادب میں بلکہ پوری اردو نثر میں ایک خصوصی جگہ حاصل ہے۔

.....لڈمیلا ویسلوا

اشاعت:۲۰۲۲ء، قیمت:۔/۵۰۰ روپے، دستیابی:اکادمی بازیافت،اردو بازار،کراچی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۱،شمارہ:نومبر،دسمبر ۲۰۲۲ء

بانی مدیر اعلیٰ
سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل
گلزار جاوید

مدیرانِ معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق
عروب شاہد
آمنہ علی

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ:1-D/537، گلی نمبر18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔
فون:(+92)-51-8730633-8730433
موبائل:(+92)-336-0558618
ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق — شعیب حیدر زیدی
تزئین — عظمیٰ رشید
کمپوزنگ — محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز

حرفِ دعا — قیوم طاہر ۵
عظمت کا اعتراف — محمد انعام الحق ۶
خالقِ کون ومکاں — نسیم سحر ۸
منظر سے کوئی بولتا ہے — فاری شا ۹
مردانہ ڈبے کی زنانہ سواری — نسیم سحر ۱۳
براہِ راست — گلزار جاوید ۱۶
خاموشی کی تقدیر — عطیہ سکندر علی ۲۲
نسیمِ ازحجاز — شوکت واسطی ۲۷
حرف حرف روشنی — محسن احسان ۲۹
محورِ دوجہاں — خورشید رضوی ۳۰
عنوان بدل ڈالے — جمیل یوسف ۳۱
خودشناسی کے مراحل — پروفیسر اقبال واجد ۳۲
مدینہ یابی کا ایک سفر — ڈاکٹر احسان اکبر ۳۷
خواب سب سے الگ — حسین سحر ۳۹
کتنا مشکل ہے زندگی کرنا — خاور اعجاز ۴۱
مسند نشیں — شاہد انوار ۴۶
وقت سے آگے کی زباں — نسیم سحر ۴۸
میرا بہادر دوست — نسیم سحر ۵۱

افسانے

مٹی دادا — اسد محمد خاں ۵۵
دیش دروہی — شموئل احمد ۶۱
شیشے کا گھر — دیپک کنول ۶۴
آنسو کیوں — وحشی سعید ۶۹

الفت کے تقاضے

شان الحق حقی، محمود شام، اعتبار ساجد، ناصر علی سید، اشرف جاوید، آفتاب مضطر، ڈاکٹر ریاض احمد، ارشد مرشد، جنید آزر، نبیل احمد نبیل ۷۰

جیت — تابش خانزادہ ۷۵
آدھی موت کا جشن — مشتاق احمد وانی ۷۶
طرفہ تماشا — وسیم عقیل شاہ ۷۸
گُم گُم — ارم نعیم ۸۰

شیشے کا شہر

نوید سروش، ڈاکٹر ریاض ساغر، مادھو کوشک، احمد سراج فاروقی، شبہ کوثر، جبیں نازاں، تسنیم بخاری، انجم جاوید، رئیس صدیقی، فطین اشرف صدیقی، محبوب اصغر، ذکی طارق، نوید ظفر، فیض الامین فیض، کامران غنی صبا۔ ۸۵

ناول

خاکِ شفا — پیرزادہ آلِ انوار ۹۰

خاکہ

ہجرتوں کا عذاب — جمیل عثمان ۹۹

اُفق کے اُس پار

برف — رینو بہل ۱۰۱

مثلِ زنداں

عبداللہ جاوید، چندر بھان خیال، ساگر ترپاٹھی، زہرہ نگاہ، فیض منصور فیض۔ ۱۰۵

نشانِ راہ

انسانیت کی شاعرہ — ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی ۱۱۰

زندگی نایاب ہے

کائنات میں جنس کا کردار — فیروز عالم ۱۱۲

ایک صدی کا قصہ

شیاما — دیپک کنول ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین — وجیہ الوقار ۱۱۸

•
○○
•••
○○○○

قرطاسِ اعزاز

○••

نسیمِ سحر

○•○

کے نام

○○○○
•••
○○○
•

حرفِ دعا

وہی مانوس، وہ جاں سوز صدا زندہ ہے
تیرے شعروں میں مِرا حرفِ دُعا زندہ ہے

پہلے جیسا ہے یہاں جبر کا موسم اب بھی
حبس کے شہر میں آشوبِ ہوا زندہ ہے

اپنے ہونے کا کوئی خواب بھی آنکھوں میں نہیں
صرف سینہ ہے جہاں شورِ اَنا زندہ ہے

سُونی گلیاں بھی وہی، شب کے دریچے بھی وہی
کوئی آواز سلامت، نہ دِیا زندہ ہے

سبز شہروں کو اُجڑنے سے بچا لے کوئی
بارشِ سنگ، تعصُّب کی گھٹا زندہ ہے

اپنے اشکوں کی کوئی بوند سمندر نہ بنی
اپنے جینے کی یہاں کون ادا زندہ ہے

قیوم طاہر
(راولپنڈی)

''عظمت کا اعتراف''

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

خاندانی نام: محمد نسیم ملک
قومی شناختی کارڈ نمبر: 37405_0795611_5
والد کا نام: محمد امین ملک
ادبی نام: نسیمؔ سحر
خاندانی پس منظر: ذات: ملک اعوان

پانچویں پشت کے بزرگ فتح جنگ کے ایک گاؤں ماڑی سے آ کر راولپنڈی میں آباد ہوئے تھے۔

تاریخِ پیدائش: ۱۵فروری ۱۹۴۴ء
مقامِ پیدائش: شہر راولپنڈی، صوبۂ پنجاب (پاکستان)
تعلیم:

۱۹۶۰ء میں مسلم ہائی سکول نمبر دو راولپنڈی سے میٹرک، ایف اے (انگریزی) کے بعد پنجابی فاضل کی ڈگری، بی اے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء۔طویل وقفے کے بعد ایم اے (اردو) سرگودھا یونیورسٹی سے ۲۰۱۶ء۔

وُسیلۂ رزق:

۱۹۶۲ء سے مختلف حیثیتوں میں حکومتِ پاکستان کے اداروں اور وزارتوں میں ملازمت کا آغاز کیا۔۱۹۷۲ء میں قومی اسمبلی میں بطور آفیشل رپورٹر (انگلش) ۱۹۸۰ء میں ڈیپوٹیشن پر اسلامی ترقیاتی بنک، جدہ، سعودی عرب میں انگلش رپورٹر کے طور پر تعینات، اور ۳۱ برس کی ملازمت کے بعد چیف انگلش رپورٹر کی حیثیت میں ۲۰۱۱ء میں ریٹائر۔تب سے اپنے آبائی شہر راولپنڈی میں ہی رہائش پذیر ہیں، اور زیادہ تر وقت ادبی کاموں میں صرف کر رہے ہیں۔

پتہ (مستقل): مکان نمبر ۱۸۱۔اے ۴۲۹۔سید پور سکیم نمبر دو۔نزد گورنمنٹ کالج فار کامرس، اعظم چوک، سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی۔

موبائل: 0092 - 333-541-5091
ای میل: naseemesehar@gmail.com

اصنافِ سخن:

حمد، نعت، غزل، نظم، افسانہ، ہائیکو، رباعی، ماہیے، خاکہ نگاری، تنقید، تبصرے، مزاحیہ شاعری، انگریزی سے کہانیوں، ناولوں، سائنس اور نفسیات کے موضوعات پر کئی کتب کا ترجمہ، ادبی رپورٹنگ، انٹرویو وغیرہ، دیگر صحافتی سرگرمیاں، کالم نگاری۔یہ سلسلہ ۱۹۶۲ء سے جاری ہے۔

تصنیفات:

۱۔	پہلی اڑان (غزلیں)	۱۹۷۷ء
۲۔	ہر بوند سمندر (غزلیں)	۱۹۸۱ء
۳۔	دریچۂ شب (نظمیں)	۱۹۸۲ء
۴۔	روشندان میں چڑیا (ہائیکو)	۱۹۸۶ء
۵۔	جگنو، دیئے، ستارے (غزلیں)	۱۹۹۰ء
۶۔	اک لطیف سرگوشی (ہائیکو)	۱۹۹۲ء
۷۔	یہ جو سلسلے ہیں کلام کے (حمد و نعت)	۱۹۹۶ء
۸۔	اتنے اچھے موسم میں (غزلیں)	۱۹۹۸ء
۹۔	پس انداز (غزلیں)	۲۰۰۲ء
۱۰۔	چہرۂ خواب (غزلیں)	۲۰۰۳ء
۱۱۔	لائن کٹ گئی (مزاحیہ کلام کا مجموعہ)	۲۰۰۴ء
۱۲۔	خواب سب سے الگ (غزلوں کا مجموعہ)	۲۰۰۵ء
۱۳۔	ترا ملنا ضروری ہے (شائع شدہ کلام کا انتخاب)	۲۰۰۷ء
۱۴۔	نعت نگینے (حمد و نعت)	۲۰۱۴ء

نعت نگینے کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۸ء میں کلیاتِ نسیمؔ سحر میں شامل ہوا، جبکہ تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا۔

۱۵۔	مجھے ٹوٹنے نہ دینا (غزلیں، نظمیں، قطعات)	۲۰۱۵ء
۱۶۔	آسماں زیرِ زمیں (منتخب شاعری، مرتب: خاور اعجاز)	۲۰۱۶ء
۱۷۔	خاکہ گردی (خاکوں کا مجموعہ) پہلا ایڈیشن	۲۰۱۶ء
۔۔	خاکہ گردی دوسرا ایڈیشن جون	۲۰۲۱ء
۱۸۔	رشحاتِ نسیمؔ سحر (تنقیدی مضامین اور دیباچے)	۲۰۱۷ء
۱۹۔	کلیاتِ نسیمؔ سحر (تیرہ شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی جس کے صفحات کی تعداد ۱۷۴۰ سے زائد ہے۔)	
۲۰۔	مطالعاتِ حمد و نعت (تنقیدی مضامین)	۲۰۲۰ء
۲۱۔	محورِ دو جہاں (نعتیہ مجموعہ)	۲۰۲۰ء
۲۲۔	'شذراتِ نسیمؔ سحر'۔(مضامین اور دیباچے) جولائی	۲۰۲۱ء
۲۳۔	تقاریظ و مضامینِ حمد و نعت	۲۰۲۱ء

ہائیکو، غزلوں، نظموں، اور کالموں کے دیگر مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔''منتخب ہائیکو'' کے عنوان سے بہترین ہائیکو نگار شعراء کے ہائیکو کا انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے۔

تراجم:

ڈیل کارنیگی کی دو کتابوں کا اُردو ترجمہ۔سینکڑوں کہانیاں اور درجنوں ناولوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

ادارتی سرگرمیاں:

پاکستان اور سعودی عرب سے بیک وقت سہ ماہی ادبی مجلّہ ’سحاب‘ کے عنوان سے جاری کیا جس کے تاحال پندرہ شمارے شائع ہو چکے ہیں پاکستان واپسی پر چند شمارے نکالنے کے بعد فی الحال یہ سلسلہ موقوف ہے۔

سیّاحت:

فرائضِ منصبی کے سلسلے میں بیشمار مسلمان ممالک میں ایک سے زیادہ مرتبہ جانے کے علاوہ تقریباً ۴۴ مسلم ممالک میں جا چکے ہیں۔ خالص نجی سیر و سیاحت یا مشاعروں میں حصہ لینے کے لئے امریکہ کناڈا انگلستان فرانس سوئٹزرلینڈ اور یونان بھی جا چکے ہیں۔ سعودی عرب میں بھی ادبی سرگرمیوں اور مختلف ادیبوں کی کتابوں کی رونمائی کی تقریبات میں مضامین و مقالات پیش کرنے کے سلسلے یا مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے ریاض، دمام، الخبر وغیرہ جانے کے مواقع ملتے رہے۔ بحرین، دوحہ قطر، متحدہ عرب امارات کے کئی مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ بیرونِ ملک بہت سے شعرائے کرام کی کتب کی تعارفی تقریب کی صدارت کا اعزاز بھی حصے میں آتا رہا۔

فیضان: اِس وقت جدہ، دمام، الخبر، طائف، بحرین وغیرہ کے کئی شعراء اپنے کلام پر ای میل اور ٹیلیفون کے ذریعے اصلاح (اعلانیہ یا غیر اعلانیہ) لے رہے ہیں۔ راولپنڈی اور گردونواح کے کچھ شعراء بھی اپنے کلام پر اصلاح اور مشورہ لے رہے ہیں۔

تحقیق۔

۱۔ معروف نقاد سید اذلان شاہ (گوجرہ) نے نسیمِ سحر صاحب کی شاعری کے فکروفن کے جائزے پر مشتمل کتاب ’’آوازہ‘‘ کے عنوان سے شائع کی۔

۲۔ سحر صاحب پر تاحال درجِ ذیل ایم فِل کے مقالے لکھے جا چکے ہیں:

i علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے فرزند علی ہاشمی ۲۰۱۷ء میں

ii الخیر یونیورسٹی، بھمبر، آزاد کشمیر کے طالب علم نے ’مجلّہ‘ ’سحاب کی ادبی خدمات: تحقیقی جائزہ‘‘ کے عنوان سے ۲۰۱۲ء میں مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔

iii رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس میں اپریل ۲۰۱۷ء میں محمد عزیز نے ’’نسیمِ سحر کی غزل گوئی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ‘‘ کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔

iv رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس میں ستمبر ۲۰۱۷ء میں محمد عدنان اختر نے ’’نسیمِ سحر کی نعت گوئی کا فکری وفنی جائزہ‘‘ کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔

v رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس ستمبر ۲۰۲۰ء میں اقرا حنیف نے ’’نسیمِ سحر کی نظم گوئی کا فکری وفنی جائزہ‘‘ کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔

Development

Some new words are being proposed for inclusion in the Oxford English Dictionary??

Errorist :

Someone who repeatedly makes mistakes.

Askhole :

A person who constantly asks for your advice, yet always does the opposite of what you adviced.

Dudevorce :

When two male best friends officially end their friendship over a lame disagreement, usually concerning a girl.

Nonversation :

A completely worthless conversation, wherein nothing is illuminated, explained or otherwise elaborated upon. Typically occurs at parties, bars or other events.

Destinesia :

When you get to where you were intending to go, you forget why you were going there in the first place.

Cellfish :

Those who continue to talk on their cell phone, oblivious to the effect on others around them.

Textpectation :

The anticipation one feels when waiting for a response to a text message.

Carcolepsy :

The inability to stay awake and alert when in a car, or any other thing that moves, such as trains, planes, and buses.

Hiberdating :

Someone who ignores all their other friends when they are dating a boyfriend/girlfriend.

Dejapoop :

The feeling that the same shit keeps happening over and over to you.

" خالقِ کون ومکاں "

حمدِ باری تعالیٰ

اَور کوئی بھی کہاں ہے بیکنار و بیکراں
خالقِ کون و مکاں ہے بیکنار و بیکراں
یہ تو اس کی بیکرانی کا فقط اک جزو ہے !
کائناتی کہکشاں ہے بیکنار و بیکراں
بیکرانی کی حدوں سے ماورا بھی ہے وہی
وہ جو اِن کے درمیاں ہے بیکنار و بیکراں
اُن زمینوں کی بھی کوئی حد نہیں جو اُس کی ہیں
صاحبِ ہفت آسماں ہے بیکنار و بیکراں
'کُن' سے پہلے بھی وہی تھا، بعد میں بھی ہے وہی
از مکاں تا لامکاں ہے بیکنار و بیکراں
اَور تو کوئی نہیں جائے پنہ اپنے لیے
ایک اُس کا سائباں ہے بیکنار و بیکراں
ہر گھڑی کرتے ہیں وہ اللہ کی حمد و ثناء
حلقۂ کرّوبیاں ہے بیکنار و بیکراں
روشنی ہے سلسلہ در سلسلہ در سلسلہ
نور کا اک کارواں ہے بیکنار و بیکراں
کب سمٹ پائی بڑائی اُس کی لفظوں میں نسیم
داستاں در داستاں ہے بیکنار و بیکراں

نعتِ رسول ﷺ

بلند اُن ﷺ سے کسی کا مقام تھوڑی ہے !
مرے لبوں پہ کوئی اَور نام تھوڑی ہے
ہماری روح بھی کرتی ہے وردِ صلِ علیٰ
فقط لبوں پہ درود و سلام تھوڑی ہے!
عطا ہوا ہے نبی ﷺ کے کرم سے لفظ بہ لفظ
سُنا رہا ہوں جو، میرا کلام تھوڑی ہے !
مقامِ عالیِ نعلینِ مصطفیٰ پہ ہوں مَیں!
جہاں کھڑا ہوں مَیں، میرا مقام تھوڑی ہے!
غلام ہوں مَیں اُنہی کا، وہی کفیل مِرے
کچھ اپنی فکر کروں، میرا کام تھوڑی ہے !
نہ پوچھو کیسے مدینے سے لوٹ کر آیا !
وہاں سے لوٹ کے دل شادکام تھوڑی ہے
خدا کے بعد جو زندہ ہے تو حضور ﷺ کا نام
وگرنہ اور کسی کو دوام تھوڑی ہے
ہر اِک رسول کا رتبہ عظیم ہے، لیکن
کوئی حضور ﷺ سا خیر الانام تھوڑی ہے !
نبی کریم ﷺ سا آقا بھلا نصیب کسے؟
بلال جیسا بھی کوئی غلام تھوڑی ہے
خدا کے بعد رسولِ کریم ﷺ ہیں، اور بس !
نسیم اِس میں کسی کو کلام تھوڑی ہے !

''منظر سے کوئی بولتا ہے''

فاری شا

(اسلام آباد)

۵/جولائی ۱۹۹۱ء

برادرِ عزیز نسیم سحر۔

خط پچھلے مہینے ہی مل چکا تھا۔لیکن مصروفیات اور پھر کچھ سُستی۔ بہرحال یہ پڑھ کرخوشی ہوئی کہ مضمون پسند آیا۔

میں نے صریر کے مدیر فہیم اعظمی صاحب سے (جو میرے بھی اچھے دوست ہیں) بات کی تھی، وہ سالنامے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اس مضمون کے بارے میں بتایا ہے کہ موصول ہو گیا ہے۔سالنامے کے بعد والی اشاعت میں ہی لگایا جا سکے گا۔میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ میں نے تخلیق لاہور کو بھی ارسال کر دیا ہے۔کہنے لگے اچھا کیا۔اور پھر اسی شام تخلیق کو بھیج دیا۔امید ہے کہ آیندہ شمارے میں آجائے گا۔

کتاب کب تک آرہی ہے،ضرور بھجوانا۔

ہاں بھئی دوبئ تک پہنچا تھا،ایک ہفتے قیام بھی رہا لیکن حج کی وجہ سے ویزا ملنا ناممکن تھا۔اب اگست یا ستمبر میں انشاءاللہ لندن جانا ہوا تو جدہ یقیناً رُکوں گا۔اور روانگی سے آپ کو اور صرف آپ کو مطلع کروں گا۔میرے داماد میر انور علی تو اب دمّام میں ہیں،پچھلے ہفتے سے یہ لوگ یہاں ہیں،بیٹے ارشد محسن کی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ارشد ماشاءاللہ کوئٹہ سنٹر (پی ٹی وی) میں انجینئر ہے۔

آپ کا دفتر کا فون نمبر تو ہے میرے پاس،گھر کا ضرور لکھ دیجیے،اب میرے گھر کا نمبر بھی بدل گیا ہے۔نوٹ کر لیجیے۔

محسن بھوپالی

۱۸/نومبر ۱۹۹۱ء

برادرم،سلام مسنون۔

والدۂ محترمہ کے انتقال کی خبر تمہارے خط سے ملی۔اللہ تعالی انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور تمہیں اس غم کو صبر سے جھیلنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔میں خود اس منزل سے گزر چکا ہوں۔کسی حد تک تمہارے دکھ کو میں سمجھ سکتا ہوں۔مجھے معلوم ہوتا کہ تم گھر آئے ہوئے ہو تو اس سانحے کے موقع پر ضرور تمہاری طرف آتا۔

خالد اقبال یاسر کی کتاب انہیں دے دی ہے اور خبرنامے کے سلسلے میں متعلقہ شعبے کو کہہ دیا ہے کہ تمہیں پرچہ بھجوا دیا کریں۔

نئی کتاب پر مبارکباد دینے کا یہ موقع نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ہائیکو کی سمت میں تم نے جو اضافہ کیا ہے وہ یقیناً اربابِ علم میں لائقِ تحسین واعتبار گردانا جائے گا۔

افتخار عارف

۷۔جنوری ۱۹۹۲ء

بھائی سحر صاحب۔

آج فون پر آپ سے گفتگو کر کے بے حد فرحت اور خوشی محسوس ہوئی۔ملک کی تقسیم کے باوجود دلوں میں محبت کی اپنی جگہ اہمیت مسلّم ہے، بہر کیف۔میں اپنی حالیہ دو کتابیں غرفۂ غیب اور چشمۂ چشم آپ کے مطالعے کے لیے بھجوا رہا ہوں۔انہیں پڑھیے اور محظوظ ہوئیے۔گلِ گفتار کا کوئی نسخہ فی الحال میرے پاس موجود نہیں ہے، دستیاب ہونے پر فوراً آپ کی خدمت میں روانہ کروں گا، یہ میرا وعدہ رہا۔اور ہاں، سرسبز کے تازہ شمارہ کی ایک کاپی میں روانہ کر رہا ہوں،اس درخواست کے ساتھ کہ اپنا ڈھیر سارا کلام بھجوانے کی زحمت کریں، میں اسے جستہ جستہ ہر شمارے میں شاملِ اشاعت کرتا رہوں گا۔ان دو کتابوں پر علیٰحدہ علیٰحدہ اگر آپ کے خیالات اور تأثرات مجھے مضمون کی صورت میں دستیاب ہو جائیں تو یہ میرے لیے ازحد مسرت کا سامان ہوگا۔

کرشن کمار طور

۲۸/نومبر ۱۹۸۸ء

محترم نسیم سحر صاحب،السلام علیکم۔

۲۴/نومبر کو واپس پہنچی۔سفر کی تکان اترنے بھی نہ پائی تھی کہ سالنامہ ۸۸ء کا کام شروع کر دیا۔حالانکہ ۲۳/نومبر کو میرے چھوٹے داماد بابر کا پتّے کا آپریشن بھی ہوا ہے مگر شکر ہے وہاں پہ میری زیادہ ضرورت نہیں ہے۔یا یوں کہہ لیں کہ میں بے کار اور بے مصرف ہوں۔

حیرت ہے کہ ستمبر اکتوبر کا شمارہ آپ کو نہیں ملا۔یورپ میں بھی کسی کو بھی نہیں ملا تھا۔البتہ انڈیا سے جو خط آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً سب کو پرچہ مل گیا ہے۔آپ کی کتابوں کا اشتہار شاملِ اشاعت ہو جائے گا۔آپ کا لکھا مضمون بھی ۸۹ء میں اگر میری زندگی رہی تو چھپ جائے گا۔

اکتوبر میں بار بار خیال آتا تھا کہ آپ کو فون کروں، پھر یاد آجاتا تھا کہ آپ تو اسلام آباد میں ہوں گے۔نومبر میں میڈیکل چیک اَپ میں اتنی مصروف اور حیران رہی کہ سب کچھ بھول گیا۔مرے لیے سردی بھی بہت تھی۔رش کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا تھا لندن میں،اور سرمایہ ختم ہو گیا تھا۔گھر سے اَور پیسے منگوانے پڑے۔رش شاید یورپ کے دوسرے ممالک سے آنے والے لوگوں کا تھا! کرسمس کی شاپنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔

سالنامہ اُمید تو ہے کہ دسمبر ہی میں چھپ جائے گا۔کتابت مکمل ہے، پروف ریڈنگ ہو رہی ہے،اشتہاروں کی آس نہیں ہے اس لیے کوشش ہی نہیں ہوگی۔

میں اٹلی نہیں گئی، ہمت اور وقت کی کمی کی وجہ سے، مراکو میں میرا قیام رباط میں رہا، لیکن Fez، مراکش اور کیسابلانکا گئی، واقعی اس ملک کا حسن ناقابلِ فراموش ہے، آیندہ برس ضرور جایئے اور میرے لیے دعا کیجیے۔ میں جنوری میں دو ہفتوں کے لیے سڈنی (آسٹریلیا) جاؤں گی، غیر ادبی کانفرنس میں۔ عمرہ کے لیے ویزہ نہ ملنے کا اب ملال نہیں رہا، ورنہ کافی upset ہوگئی تھی۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، ضِد چھوڑ دی ہے،

صدیقہ بیگم

۸/نومبر ۱۹۸۶ء

برادر محترم نسیم سحر صاحب۔ سلام ورحمت۔

گذشتہ دنوں ''اخبار البنغلا دیش'' کی تیاری میں مصروف تھا کہ عنایت نامہ ملا۔ افسوس ہے بروقت حاضری نہ دے سکا۔ امید کہ کچھ خیال نہیں کریں گے۔

''اخبار البنغلا دیش'' آپ کو بھیج چکا ہوں۔ امید کہ مل گیا ہوگا۔ ضروری عرض یہ ہے کہ ''انکشاف'' کی خصوصی اشاعت کے سلسلے میں خاکسار نے گزارش کی تھی کہ براہِ کرم جدہ کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق کوئی تفصیلی مضمون تحریر فرمائیں، نیز وہاں کے اُردو شعراء وادباء حضرات کی تخلیقات مع ان کی تصویر کے 'انکشاف' کے لیے بھجوائیں، اور اگر ممکن ہو تو چند ادبی شخصیتوں پر خاکے یا مقالات بھجوائیں۔ دراصل میرا مقصد جدہ سے متعلق اپنے قارئین کرام کو زیادہ سے زیادہ ادبی معلومات فراہم کرنا ہے۔ اور اس سلسلے میں اگر آپ احباب تعاون نہیں کریں گے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ امید کہ آپ فوری توجہ دیں گے اور 'انکشاف'' کے خصوصی نمبر کو اپنی کوششوں اور محبتوں سے چار چاند لگائیں گے، اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ برادرِ عزیز شاہد نعیم شاید مجھ سے ناراض ہیں اُن کا کوئی خط نہیں آیا، آخر کچھ تو علم ہو کہ وجہِ ناراضگی کیا ہے۔ ملیں تو خیریت پوچھیں اور میری دعائیں کہیں۔ اعتماد صدیقی کی کوئی تخلیق مجھے نہیں ملی۔ اور نہ ہی سید ابوظفر صاحب کی کوئی محبت، ان دونوں شخصیتوں کی خدمت میں میرا سلام عرض کریں۔ امید کہ بفضلِ تعالیٰ آپ تمام احباب مع الخیر ہوں گے۔

ایوب جوہر

۲۹/جولائی ۱۹۹۳ء

گرامی قدر نسیم سحر صاحب۔

کس طور آپ کے کرم ونوازش کا شکریہ ادا کروں۔ میں اپنی دانست میں سب سے افضل تحفہ کتاب کو سمجھتا ہوں، اور آپ کی سلیم نوازی کا یہ عالم کہ دو خوبصورت کتابوں سے سرفراز کیا۔ آپ کے غائبانہ نیاز تو پہلے ہی سے حاصل تھے۔ جس کے لیے مَیں مشفق ومخلص جناب ڈاکٹر امجد پرویز کا ممنونِ کرم ہوں۔ ہائیکو کا تذکرہ تو بہت سنا تھا، اس صنفِ سخن سے متعارف آپ کے توسّط سے ہو رہا ہوں۔ یوں بھی شاید اِس صنف میں مجموعے کم ہی سامنے آئے ہیں۔

جو خوش گمانی آپ میری ادیبانہ حیثیت کے ضمن میں رکھتے ہیں، کیا عرض کروں، دل تو بہت خوش ہوا۔ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔ میں نہ شاعر، نہ نثر نگار، اور نہ ہی نقاد وصحافی۔ بس خدمتِ اُردو وفروغِ اردو کو شعوری طور پر اپنی بے توقیری شناخت کا حوالہ بنانے کی جستجو ہے۔ آپ یقین فرمائیں کہ شدید خواہش تھی اور ہے کہ شاعر یا ادیب ہوتا۔ مگر اب یہ کیا ضرور کہ انسان کی ہر ہر خواہش تکمیل پائے۔ پرتَو صاحب میرے نہایت ہی شفیق ومہربان کرم فرما ہیں، غالباً اُنہوں نے جدہ سے آپ ہی کے دولت کدے سے فون کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ ادبی جرائد میں خطوط بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ویسے پوری زندگی میں ایسا دو مرتبہ ہی ہوا ہے۔ ایک بار ''شاعر'' بمبئی اور دوسری مرتبہ ''تخلیق'' لاہور میں۔ دونوں خطوط ہی مدیرانِ کرام کے نام تھے اور خصوصی طور پر برائے اشاعت نہ تھے۔

سحر صاحب، ساتھ ہی میں آپ کچھ خط اَور بھی منسلک دیکھیں گے۔ مذکورہ دونوں خطوط آپ اور آپ کے پورے حلقۂ احباب کے لیے ہیں۔ یا تو ان خطوط کی آپ فوٹو کاپی بنوا کر حلقۂ احباب میں تقسیم فرما دیں یا کسی اور دوست سے ایسا کرنے کو کہیں اور آپ مجھے جدہ میں مقیم پاک و ہند کے قلمکاروں کے پتے مرحمت فرمائیں۔ میں خود بھی ان دوستوں سے رابطہ کرنے کا خواہشمند ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ منسلکہ خطوط میں تجویز کردہ منصوبے کو نہ صرف پسند ہی فرمائیں گے بلکہ عملی تعاون وسرپرستی سے بھی نوازیں گے۔ مذکورہ منصوبہ فروغِ اردو کی بابت پہلا عملی اور اہم قدم ہے۔ کئی اور منصوبے بھی ہیں، لیکن ان پر عمل ابھی کچھ اَور وقت وتیاریوں کا متقاضی ہے، بعد میں گوش گزار کروں گا۔

سلیم جعفری

۲۱/اپریل ۱۹۹۲ء

برادرم نسیم سحر صاحب، سلام مسنون۔

آپ کے خط نے شرمندہ کر دیا۔ ہماری کہاں اتنی مصروفیت اور کہاں اتنی ادبی سرگرمی۔ بس کچھ لکھ پڑھ لیتا ہوں۔ آپ جیسے کرم فرماؤں کی دعائیں شاملِ حال ہیں۔

آپ کی کتاب ''روشندان میں چڑیا'' ملی۔ بے حد شکریہ۔ میں جلد ہی تبصرہ بھیجوں گا۔ گذشتہ کتاب ''منتخب ہائیکو'' غالباً ۱۹۸۹ء میں ملی تھی اور میں نے رسید بھیجی تھی۔

کتاب 'منتخب ہائیکو'، 'جلترنگ' اور ''سبب'' روانہ خدمت کر رہا ہوں۔ رسید سے ضرور نوازیں۔

سعودی عرب میں رہ کر آپ جس قدر فعال ہیں اور رسائل میں جس کثرت سے نظر آتے ہیں پڑھ کر خوشی ہوتی ہے، اپنی بعض دیگر کتابیں بھی بھیجوں گا۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

۸/اکتوبر ۲۰۰۹ء

جناب نسیم سحر صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو''

''سحاب'' شمارہ ۹ میں میرا افسانہ ''سرکٹے لوگ'' شائع کرنے کا شکریہ۔ آپ نے غالباً عنوان کی مناسبت سے اس کا ''سر'' کاٹ کر شائع کیا ہے۔ افسانے کا پہلا جملہ ''عجیب منظر ہے، دھڑ سلامت، سر غائب'' چھپنے سے رہ گیا ہے۔ بہرحال۔

اس مرتبہ آپ نے دو سفرنامے شائع کیے ہیں، ڈاکٹر اوصاف احمد کا سفرنامۂ اٹلی ''قصہ ایک اطالوی بھٹیارن کا'' مَیں اُن سے سُن چکا تھا۔ اس کے باوجود بہت دلچسپی سے پڑھا اور محظوظ ہوا۔ مگر اس کے بعد رضیہ بخاری کا سفرنامۂ ہند ''بھارت یاترا'' پڑھ کر طبیعت اتنی ہی زیادہ مکدّر ہوگئی۔ ۱۷ر صفحات پر پھیلے ہوئے اس مضمون میں نہ صرف ہندوستان کے خلاف شدید نفرت اور حقارت کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ ہندو مذہب کے ماننے والوں کے عقیدے پر غیر ضروری طور پر فقرے کسے گئے ہیں، یہاں تک کہ اُن کے عقیدے کو ''پوری انسانی نسل کی توہین'' قرار دیا گیا ہے۔

پتہ نہیں رضیہ بخاری ہندوستان میں اپنے کن رشتہ داروں سے ملیں اور کس بےخبر نے انہیں یہ اطلاع دی کہ ''مسلم بچے اردو صرف بول اور سمجھ سکتے ہیں، اُردو کا ایک لفظ لکھ یا پڑھ نہیں سکتے''۔ میں نے خود ایک اُردو میڈیم اسکول سے تعلیم حاصل کی ہے اور بورڈ کے امتحان میں سائنس اور تاریخ کے پیپر میں بھی اردو میں لکھ کر میٹرک پاس کیا ہے۔ یہ آسانی آج بھی بہار اور ملک کی دیگر ریاستوں میں موجود ہے۔ مہاراشٹر جہاں کہ نوّے کی دہائی میں شِو سینا اور بی جے پی جیسی ہندو انتہا پسند پارٹیوں نے مل کر پانچ سال تک حکومت کی، وہاں ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۲ء کے بیچ لگاتار اردو میڈیم اسکول کے مسلمان بچوں نے میٹرک کے امتحان میں ٹاپ کیا۔

اُردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ اس کے علاوہ یوپی اور مہاراشٹر کے چند اضلاع میں بھی اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، جس کا مطلب ہے کہ تمام سرکاری اداروں میں اردو جاننے والے اہل کاروں کا ہونا لازمی ہے، اور اگر کوئی شخص اردو میں درخواست دے تو سرکاری دفاتر اسے قبول کرنے اور اس پہ عمل درآمد کرنے کے لیے قانونی طور پر پابند ہیں۔

ایک آخری بات، کسی پڑھے لکھے شخص اور وہ بھی درس وتدریس سے وابستہ، جیسا کہ مصنفہ نے اپنے بارے میں لکھا ہے، سے امید کی جاتی ہے کہ جب وہ علی گڑھ جیسے علمی ادارے میں جائے تو وہاں کے تعلیمی ماحول کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور نئے امکانات پر غور کرے۔ مگر رضیہ بخاری ایک پروفیسر کے یہاں مہمان رہنے کے باوجود سرسید سے اپنے شوہر کا شجرہ ملا کر، پرانی حویلیوں کو دیکھ کر اور شاپنگ کر کے واپس آ گئیں، حیرت ہے!

شاہین نظر

۴ر جولائی ۲۰۱۸ء

محترم نسیمِ سحر، تسلیمات۔

۳ر جولائی ۱۸ر کی شام ساعتوں کے لیے نسیمِ سحر ثابت ہوئی۔ صحرائے ادب میں خوشبوؤں کے سفیر سے رابطہ دشتِ تبسّم کے لیے نویدِ بہار ہے۔

عصرِ حاضر کے سیّاحِ ادب نسیمِ سحر کے لیے چند کتب پیشِ خدمت ہیں۔ امید ہے کہ شرفِ قبولیت عطا فرمائیں گے۔

ہارون الرشید تبسّم

۵ر اپریل ۱۹۹۳ء

محترمی نسیمِ سحر صاحب۔

خط، شعری تخلیقات اور شعری مجموعے کے لیے شکرگزار ہوں۔ بہت انتظار کے بعد آپ کا جواب آیا۔ میں منتظر ہی تھا۔ میں نے تصویر کے لیے بھی زحمت دی تھی، بس وہی نہیں ملی۔ ارسال کر دیجیے، بہت ضروری ہے۔

''شاعر'' کا ایک اور شمارہ (مشترکہ) آپ کے ملاحظے کے لیے پیش ہے، اپنی گرانقدر رائے سے نوازیے گا۔

شاعر کے زیرِ طبع شمارے میں اردو کی نئی بستیوں کے چالیس شعراء کے غیر مطبوعہ کلام کی پہلی قسط دی جا رہی ہے۔ اس میں آپ بھی شامل ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آپ نے جو مزید غزلیں ارسال کی ہیں وہ ہم عصر اردو ادب نمبر میں شامل کر رہا ہوں، کہیں اور نہ بھجوا دیجیے گا۔۔۔

ہم عصر اردو ادب نمبر کے بعد ''اردو کی نئی بستیاں نمبر'' شائع کیا جائے گا۔

''شاعر'' آپ کا اپنا رسالہ ہے، آپ نے اعتماد صدیقی صاحب کے ہاتھ زیرِ رفاقت بھجوا دیا ہے، وہ ابھی ملا نہیں ہے، مگر مل جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔ میں اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ حساب کتاب تو ہم لوگوں کو آتا نہیں ہے اور محبتوں میں مَیں اِس کا قائل بھی نہیں۔ پھر جہاں اردو کی ترویج واشاعت اور اس کے فروغ کے لیے کام ہو رہا ہو تو وہاں حساب کتاب کیا۔ شاعر کارواں میں اب آپ بھی شامل ہو گئے ہیں، بس آپ ہمیں محسوس کیجیے، اپنی دعاؤں میں شامل رکھیے۔ اپنے حلقۂ احباب کو شاعر کی طرف متوجہ کیجیے۔ اسے اردو کا عالمی جریدہ بنانے میں تعاون دیجیے، اپنے مفید اور گرانقدر مشوروں سے نوازیے۔

شاید طارق غازی صاحب میرا ذکر کرنا بھول گئے، ان سے میرا تذکرہ کیجیے اور پھر دیکھیے، انہیں بھی شاعر ارسال کیا جاتا ہے۔ بےحد مصروف اور اپنے آپ میں مستغرق رہنے والے فن کار ہیں۔

آپ کی کتاب پر شاعر میں تبصرہ بھی آئے گا۔ انشاءاللہ۔

ابھی کوئی قابلِ ذکر شعر یا نظم تخلیق نہیں ہو گی مگر لوگوں کا اصرار ہے کہ غزل ونظم پر دو مجموعے اب آ جانے چاہیے۔ صرف نام ہی سوچ سکا ہوں، دعا ہے خدا (غزلیں) اور خدا سے مکالمہ (نظمیں)۔

جدہ اور پورے سعودی عربیہ کے اردو قلم کاروں سے رابطے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اردو کے عالمی قلم کاروں کے نام پتوں پر مشتمل ڈائریکٹری،

سوانحی لغت، تصویری البم اور اردو کی نئی بستیاں پر کام کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

شاعر کے اتنے سارے پراجکٹ ہیں، آپ سب کا بھرپور عملی تعاون بے حد ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ میں نے گذشتہ خط میں بھی انہی امور پر آپ کی توجہ مبذول کروائی تھی۔

سعودی عربیہ میں کون کون لوگ فعال ہیں؟ کون کون سے ادارے علمی وادبی سرگرمیاں میں نمایاں ہیں؟ میری رہنمائی کیجیے۔

افتخار امام صدیقی

۲۷/جون ۱۹۹۳ء

نسیم صاحب، السلام علیکم۔

آپ کا خط کل ہی ملا۔ آپ نے تراشے بھیجے ہیں۔ شکریہ۔

جی میرا بھی چاہتا ہے کبھی ہائیکو لکھوں۔ یونہی منہ کا مزہ بدلنے کے لیے، بلکہ آپ کی کتابوں کو تو میں نے خاص طور پر اس خیال سے ایک بار پڑھا بھی تھا۔ لیکن پھر معمول کی بیوست چھا گئی۔

''سفرگشت'' پر لکھیے اور ضرور لکھیے۔ اور ساتھ ہی اگر آپ ناراض نہ ہوں تو وہ کتاب جن صاحب سے میں نے لے کر آپ کو دی تھی (شہزاد صاحب) ان کو واپس بھی کر دیں۔ پاکستان آنے پر ان شاءاللہ آپ کی خدمت میں دوسرا نسخہ پیش کیا جائے گا۔

علی کی شادی خدا کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہوگئی۔ آپ ہوتے تو اور بھی خوشی ہوتی۔ نئی کتاب ابھی تک نہیں ملی۔

مختار علی خان (پرتو روہیلہ)

۲مئی ۱۹۹۳ء

برادرم نسیم سحر، آداب وتسلیمات۔

میں پاکستان گیا تھا۔ پہلے عمرے کا خیال تھا لیکن پھر وقت کی وجہ سے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب میں ان شاءاللہ حج کے لیے مورّخہ ۲۲/مئی ۱۹۹۳ء کو جدہ پہنچ رہا ہوں۔ میرے ہمراہ برادرم اکبر حیدرآبادی اور برادرم باقر نقوی بھی ہوں گے۔ یہ حضرت ۱۹/مئی کو جدہ سے مدینہ چلے جائیں گے پھر ۶/جون کو اِن کی لندن واپسی ہوگی۔ میری واپسی ان شاءاللہ ۱۲/جون کو ہوگی۔ ہماری خواہش ہے کہ جمعہ ۴/جون کو جدہ کے ادبی دوستوں کے ساتھ ایک شام ہو جائے۔ اس دن ہم تینوں جدہ میں ہوں گے۔

گذشتہ نومبر میں آپ کی عدم موجودگی میں برادرم سجاد بابر نے بڑی پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا اور پھر شعری نشست بھی رات گئے تک برقرار رہی جس کا لطف ابھی تک باقی ہے۔

میری کتاب خالد احمد نے بیاض پبلی کیشنز لاہور سے شائع کر دی ہے۔ کتاب پوش اور پرنٹنگ معیاری ہے۔ کاغذ بھی عمدہ استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر صفی حسن

پھدوکھاتہ

لفظ "پھدوکھاتہ" سے مراد لاقانونیت، افراتفری، غبن اور غلط استعمال ہے، خاص طور پر ہندوستان پاکستان میں مستحق لوگوں کے حقوق کی پرواہ نہ کرنا۔

میں ہمیشہ اس فقرے کی اصلیت کے بارے میں سوچتا تھا، لیکن حیران تھا کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔

کچھ سال پہلے میں کچھ حیدرآباد (دکن) دوستوں کے ساتھ ان کی ثقافت کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے لیے نظام عثمان ایک خدا ہے۔ سب سے بڑا انسان دوست، برصغیر کا سب سے بڑا مسلم لیڈر، بے مثال اقدار کا حامل انسان وغیرہ وغیرہ۔

اس کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے، مجھے بتایا گیا کہ اس کی 303 بیویاں اور 1,760 بچے تھے اور وہ ان کے ساتھ یکساں سلوک کرتا تھا۔ اس نے عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی، جو کہ پورے ہندوستان کے علم کا بے مثال مینار ہے۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا اس نے یونیورسٹی کو اپنے 1,760 بچوں کے لیے بنایا یا عام لوگوں کے لیے؟ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے، بتایا گیا کہ جس دن اس کی بیوی بچہ جنتی تو ایک فائر کیا جاتا پتہ چل جاتا کہ عثمان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ جب زیادہ گولیاں چلتیں تو لوگ سمجھ جاتے کہ ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوئے ہیں۔ مجھے ہنسی آئی تو متنبہ کیا گیا۔ کیونکہ اس کی 303 بیویاں تھیں۔ یہ ضروری تھا کہ ہر بیوی کو نظام کے ساتھ اس کی زوجیت کا وقت مقرر کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک سینئر بیوروکریٹ کی سربراہی میں خصوصی محکمہ بنایا گیا جو یہ شیڈول بناتا تھا۔

ایک رجسٹر میں نام، تاریخ، مدت وغیرہ درج ہوتی اور ایمانداری کے ساتھ شیڈول کی پیروی کی جاتی۔

ہر بیوی کو اپنی باری کا تقریباً ایک سال انتظار کرنا پڑتا۔

نظام عثمان کی شدید خواہش تھی کہ اس کے ہر بچے کو نظام کا وارث بنایا جائے۔

جیسا کہ ہم سب برصغیر کے لوگ ہیں، بدعنوانی نے جنم لیا اور جلدی باری کے لئے رشوت چلنے لگی۔

اس رجسٹر کو باضابطہ طور پر "پھدوکھاتا" کہا جانے لگا۔

- خاکہ -

’’مردانہ ڈبّے کی زنانہ سواری‘‘

نسیم سحر

اگر مَیں یہ مضمون آج سے اُنیّس بیس برس قبل لکھ رہا ہوتا تو اسے یوں برسرِ عام پڑھنے سے پہلے مَیں نے زرہ بکتر کا نہیں تو کم از کم ہلمٹ کا انتظام تو ضرور ہی کرلیا ہوتا۔ کوئی اَور وجہ ہو نہ ہو اس بدگمان زمانے میں یہی وجہ کیا کم ہے کہ کسی خاتون کے فن پر ایک مرد مضمون پڑھ رہا ہے! سیّد ناصر حسین زیدی، یعنی گلنار آفرین کے شوہرِ نامدار اور اس حقیقی ڈرامے کے ’’ہیرو‘‘ اس موقع پر قاتل کا رول ادا کرنے پر تیّار نہ بھی ہوتے تو سماج کے کئی ٹھیکیدار اور خدائی فوجدار اس کردار کو ایکسٹرا اداکار کے طور پر بلا معاوضہ بھی ادا کرنے پر تیّار ہو جاتے کہ یہ لوگ اپنے ’’روشن مستقبل‘‘ کی خَاطر اِسی طرح کے چانس کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قصّہ ہوتا تب کا جب آتش جواں ہوتا۔

کُریدتے ہو جو اَب راکھ، جستجو کیا ہے

بات ہے آج سے بیس برس قبل کی جب گلنار آفرین کے افسانے اور میری غزلیں اُس وقت کے مشہور و مقبول اور اب مرحوم ماہنامہ ’’جامِ نو‘‘ میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ہم دونوں اِس لحاظ سے دیرینہ ہمعصر ٹھہرتے ہیں اور ادبی اور قلمی حد تک تبھی سے ایک دوسرے کے شناسا بھی ہیں۔ لیکن اطلاعاً بلکہ بطور بیانِ صفائی عرض ہے کہ گلنار کی اور میری روبرو ملاقات صرف اور صرف ۱۹۸۴ء میں جدّہ میں ہوئی ہے جب پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی ہی نہیں بلکہ بہت سے پُل خود بھی بہہ چکے ہیں، جب چراغوں میں روشنی نہیں رہی اور جب چشمہ لگانے کے بعد بھی آسمانی یا زمینی ستارے خاصے مدھم مدھم سے نظر آتے ہیں۔ ان اُنیس بیس برسوں میں جبکہ گردشِ روزگار کا مسلسل اوور ٹائم لگانے سے میری عمر تیس پینتیس برس بڑھ گئی ہے اور نسوانی ’’رعایتِ عمری‘‘ کی وجہ سے گلنار کی عمر بس اتنی ہی بڑھی ہے جتنا کہ انیس بیس میں فرق ہوتا ہے۔ ہم دونوں مسلسل اور متواتر ایک دوسرے کا ہمعصر اور قاری اور کبھی کبھار سامع اور ناظر ہونے کا رول ادا کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ گلنار کے لئے اپنی ’’کم سنی‘‘ کی بنا پر یہ رنگین اور فرینک مضمون سُننا مشکل ہو تو ہو، میرے لئے اس نیم بڑھاپے میں یہ مضمون اعلانیہ پیش کرنا اس لئے مشکل نہیں رہا کہ اب ’’کزن‘‘ کہلانے کی عُمر ختم اور ’’انکل‘‘ کہلانے کی عُمر کا آغاز ہو چکا ہے اور اب میرا کوئی بھی شرارتی جملہ یا معنی خیز ڈائیلاگ بزرگوں کی نصیحت کے طور پر نہایت ادب و احترام سے سُنا جاتا اور اُسی سہولت سے دوسرے کان سے نکال دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی پیر و مرشد علاّمہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ بہت پہلے شاید اسی صورت حال کے لیے ایک شعر کہہ کر مجھے مشکل سے نکال گئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

عروسِ لالہ، مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ مَیں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

گلنار آفرین کے افسانوں میں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ غربت کا ذکر بھی ملتا ہے حالانکہ خود گلنار کسی غریب گھرانے سے تعلّق نہیں رکھتیں۔ ریاست ٹونک جیسے علم و ادب اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کے مرکز میں صاحبزادہ نواب متین اللہ خان المعروف لساّن الملک واثق ٹونکی جیسی معروف شخصیت کے ہاں جنم لینے والی بچّی مختار النّساء ہی آج کی گلنار آفرین ہیں۔ پیدا ہوئیں تو ۲۴ قیراط کا سونے کا چمچہ منہ میں لئے ہوئے تھیں۔ ہوش سنبھالا اور ناصر زیدی صاحب کے ہوش اڑا چکیں یعنی ان کی زوجیت میں آ چکیں تو ناصر زیدی صاحب نے انتقاماً نہیں بلکہ احتماماً اُن کے منہ سے سونے کا چمچہ باہر کھینچ لیا۔ کسی مالی ضرورت کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے کہ اُن کے دوسرے ہاتھ میں اپنی نئی نویلی دلہن کے لیے پلاٹینم کا چمچہ موجود تھا۔ چنانچہ گلنار آفرین ابھی کم عمر ہی تھیں کہ اُن کے نوابی ماحول اور ادبی پس منظر میں مولانا محمّد حسین آزاد کے پڑنواسے سیّد ناصر زیدی کا رکھ رکھاؤ اور دولت مندی بھی شامل ہوگئی۔ گویا جنّت میں آنکھ تو کھولی ہی تھی، اب شوہر نے وہاں بھی اُن کے لیے وی آئی پی روم الاٹ کروالیا۔ چنانچہ گلنار نے بُرے دن شاید ہی کبھی دیکھے ہوں۔ مگر گلنار نے اچھے دنوں کی اس جنّت میں جہنم اور سکون کے اس گلشن میں صحرا خود ایجاد کرلیا کہ ان کی شخصیت کا وہ حصہ جو ’’گُل‘‘ تھا ’’نار‘‘ کا ذائقہ چکھے بغیر نامکمّل رہ جاتا۔ چنانچہ اُن کے افسانوں میں غربت، قنوطیت اور بے سکونی کا ذکر ملتا ہے تو یہ اُن کے حسّاس ہونے کا ثبوت ہے کیونکہ یہ کرب ان کی داخلی واردات نہیں ہے انہیں تو کوئی فکر، کوئی غم نہیں، انہوں نے ہر شے پالی ہے، حتیٰ کہ بے پایاں محبت بھی، یہی اُن کی کامیڈی بھی اور یہی اُن کی ٹریجڈی بھی ہے۔ ٹریجڈی کو وہ اپنے فن کے ذریعے ہم تک پہنچاتی ہیں اور کامیڈی کو اپنی شخصیت کے ذریعے۔ ’’پلک پلک سمٹی رات‘‘ اُن کے افسانوں کا مجموعہ اُن کی ٹریجڈی کا ایک پہلو ہے جس میں اُن کے افسانوں کا مرکزی موضوع تو زیادہ تر محبت ہی ہے لیکن یہ ’’ٹین ایج‘‘ کی ناپُختہ اور نابالغ محبت نہیں ہے۔ انہوں نے افریقہ، ایشیا، یورپ اور امریکہ کے متعدّد ممالک میں طویل قیام بھی کیا ہے اور سیّاحت بھی کر چکی ہیں یہ مکانی سفر طے کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سوچ کا سفر بھی جاری رہا ہے اور انسانی نفسیات کی پیچیدہ بھُول بھلّیوں اور گہرائیوں میں بھی سفر کر چکی ہیں۔ اب وہ بظاہر تو عورت اور محبت کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں مگر اس ایک نقطے پر قائم رہ کر پرکار کی طرح دُنیا بھر کے موضوعات کو بھی اپنے دائرۂ فکر میں سمیٹ لیتی ہیں مثلاً مشرقی عورت کا دُکھ سُکھ، مرد کے ہاتھوں عورت کا استحصال، عورت کے ہاتھوں عورت کے حقوق پر ڈاکہ، عورت کا جذبۂ ایثار، عورت کی محبت کی صداقت، عوام کی غربت اور مفلوک الحالی، مامتا کا دُکھ، سیاسی استحصال، جبر و اقتدار کی کشمکش، فلسطین اور افغانستان کی صورتِ حال، عالمی سیاسیات، نفسیات، مذہبِ اسلام سے اپنا والہانہ لگاؤ وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے کردار نگاری کو واقعہ نگاری پر ترجیح دی ہے، کہیں کہیں ان کے افسانوں میں خود کلامی کا انداز بھی ہے۔ وسیع لفظی سلسلوں، جملوں کے بہاؤ اور نیم ڈرامائی، نیم

رومانی اندازِ بیان کے ذریعے انہوں نے بڑی خوبی سے اپنے کرداروں کی نفسیاتی کشمکش اور داخلی احساسات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانوں کے پس منظر میں صحراؤں کا اکھڑ پن ہے اور آزاد روی بھی۔ بنگال کی خوابناک فضا بھی ہے اور لندن اور پیرس کی رنگینیاں بھی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں میں خود بہت کم نظر آتی ہیں اور انہیں نکیل ڈال کر زبردستی اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹنے کی قائل نہیں ہیں۔ وہ اپنے قارئین کو بندر کا تماشا نہیں دکھاتیں بلکہ کرداروں کو کہانی کے تقاضے کے مطابق آزاد چھوڑ دیتی ہیں اور پسِ پردہ اُن کا تعاقب کر کے اپنے قلم کے ذریعے ان کے رویّوں اور ان کی حرکات وسکنات کو ہم تک پہنچاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ افسانہ شروع کرنے کے بعد اُسے سمیٹنا کبھی کبھی ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ عجب نہ ہوگا اگر کسی دن وُہ افسانہ لکھتے لکھتے ''علی پور کا ایلی'' یا ''خدا کی بستی'' جیسی کوئی چیز لکھ ڈالیں کیونکہ انہیں ہر دم اپنے بیان کے لئے کچھ اَور وسعت چاہیئے۔ وہ شاعرہ بھی ہیں مگر شاعری، خود ان کے اپنے بیان کے مطابق، ان کی بھرپور ترجمانی نہیں کر سکی تو وہ اپنا اظہار افسانوں کے ذریعے کرنے لگیں۔ وہ مشاعروں میں دل نشیں ترنّم سے اپنا کلام سُناتی ہیں لیکن شکر ہے کہ افسانے ترنم سے نہیں سنا تیں ورنہ ہمیں گھڑی کی جگہ کیلنڈر دیکھنا پڑتا۔

''پلک پلک سمٹی رات'' کے افسانوں میں مجھے جو افسانہ گلنار آفریں کے فن کا بہترین ترجمان لگا اُس کا عنوان ''آپریشن'' ہے۔ جس میں وہ ایک کردار کی زبانی بڑی دردمندی سے کہلواتی ہیں کہ معاشرہ کا آپریشن بے حد ضروری ہے تا کہ تباہ کن جراثیم کی پیداوار بند ہو اور روحانی سکون حاصل ہو سکے۔ اس افسانے کا ایک کردار ڈاکٹر الفریڈ کہتا ہے ''میں ڈاکٹر ہوں، جسم کے خراب حصّے کو کاٹ کر الگ کر سکتا ہوں۔ مگر معاشرے میں بکھری ہوئی تباہ کن برائیوں کا میرے پاس کوئی علاج نہیں''! اس مسیحا کے بیان کے روپ میں دراصل گلنار آفریں نے علامتی انداز میں ایک آفاقی صورتِ حال کا اظہار کیا ہے جس سے اُن کی شدّتِ کرب اور معاشرے کی بے حسی اور بے راہروی کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار معالج نہیں ہوتا، وہ صرف معاشرے کی خرابیوں کو سامنے لا سکتا ہے ان خرابیوں کا علاج تو دوسروں کے پاس ہے۔

گویا ایکسرے اور پوسٹ مارٹم کے درمیان جو نازک سا فرق ہے گلنار آفرین اسے ملحوظِ خاطر رکھتی ہیں۔ افسانہ ''وادیٔ القراع'' میں خاص طور پر انہوں نے سعادت حسن منٹو کے انداز میں ایک ممنوعہ موضوع پر بڑی جرأت مندی سے اظہار خیال کیا ہے لیکن اس کے قلم کی داد دینی پڑتی ہے کہ یہ بے باکی تہذیب کی حدوں سے باہر نہیں گئی۔ ''عجیب ماں'' کے عنوان سے لکھا گیا افسانہ تو گلنار آفرین کی اپنی ذاتی زندگی کا ایک ٹریلر ہے، اس میں بچّوں کی اچھی تعلیم اور بہتر مستقبل کی خاطر انہیں اپنے سے جُدا کرتے ہوئے ایک ماں کے جو احساسات ہوتے ہیں اور جو کرب وہ محسوس کرتی ہے اس کا بڑے حقیقی انداز میں نقشہ کھینچا گیا ہے اور فنکارانہ کمال یہ ہے کہ قاری پڑھتے ہوئے اُسے افسانہ نہیں، ایک غمزدہ ماں کا خط سمجھتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ گلنار آفرین کے فن کی خوبی ہے یا خامی، جو بھی ہے اُسے مثبت انداز میں ان کی اپنے وطن اور اُس کے ماحول سے محبت کا ایک انداز ہی سمجھنا چاہیے کہ اُن کے افسانوں کا پس منظر بیرونِ ملک کا بھی ہو تو افسانے کے کرداروں پر اپنے وطن کی چھاپ نظر آتی ہے۔ فلسطین کی ہیروئن پنجاب کی مٹیار لگتی ہے اور پیرس کے ہسپتال کی نرس ناظم آباد کراچی کی رہنے والی لگتی ہے۔

گلنار آفرین کے فن پر تنقید کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار کمانڈر سیّد انور کہتے ہیں کہ ان کی فنِ افسانہ میں کامیابی کی منزل ابھی دُور ہے لیکن میرے خیال میں گلنار بہت سی منزلیں پیچھے بھی چھوڑ آئی ہیں۔ روایتی افسانے سے جدید افسانے کی طرف جست بھرنا کوئی آسان تو نہیں۔ ہر چند کہ یہ جست بھرتے ہوئے گلنار آفرین نے کافی عرصہ لگا دیا ہے اور درمیان میں اُن کی افسانہ نگاری میں ایک طویل وقفہ بھی حائل ہوا ہے لیکن بعض حالات میں ''وقفہ بہت ضروری ہے'' اور گلنار نے یہ وقفہ چُپ رہ کر نہیں گزارا۔ افسانوں میں بھی اور شاعری میں بھی اپنے لب ولہجہ اور موضوعات میں نمایاں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔

''پلک پلک سمٹی رات'' کی مصنفہ کے ٹریجڈی کے پہلو پر بہت سی باتیں ہو چکیں۔ اب ذرا اُن کی شخصیّت کے اُس پہلو کی طرف آتے ہیں جسے کامیڈی یا زندہ دلی کا روپ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں بات صرف اُن کی شخصیّت تک محدود نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ اگر اُن کے ساتھ ان کے نصف بہتر کا ذکر بھی نہ کیا گیا تو ناانصافی ہوگی۔ اِس لئے کہ خوش دِلی، ہنسی مذاق، قہقہہ بازی، لطیفہ بازی اور لذیز تر گفتگو کے سلسلے میں یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا کہ اِن دونوں میں حقیقی نصف بہتر کون ہے۔ سید ناصر حسین زیدی بھی اُتنی ہی باغ و بہار شخصیت ہیں جتنی کہ گلنار آفرین ہیں۔ اُن کی خوش مزاجی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ''ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے'' کے بیانِ حلفی کے تحت اپنی بیگم پر اب بھی سو جان سے مائل، ان کے تیرِ نظر کے مستقل گھائل اور علی الاعلان اُن سے اظہارِ محبّت اور اقرارِ محبّت کے قائل ہیں۔ شاید یہ ایسا یہ دکھانے کے لیے کرتے ہیں کہ جملہ حقوق محفوظ ہونے کی خبر مخفی نہ رہے۔ ناصر زیدی صاحب اپنی بیگم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ یہ اُن شوہروں میں سے ہیں جو تاج محل تعمیر کرنے کے لئے بیگم کے وفات پانے کا انتظار نہیں کرتے رہتے نہ ہی انتظار سے اُکتا کر کوئی ''شارٹ کٹ'' تلاش کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی بیگم کی زندگی ہی میں اپنے پیار کے ثبوت کے طور پر تاج محل کھڑے کر دیتے ہیں، ہوا میں نہیں، ٹھوس زمین پر۔ اور انجینئر ہونے کی بدولت شاید ان کے لئے تاج محل بنانا کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں ''ورنہ ہر ذہن میں اک تاج محل ہوتا ہے''۔ طبعیتاً ناصر زیدی ادیب نہ ہونے کے باوجود ادیب نواز ضرور ہیں اور وسیع النظر بھی ہیں، ورنہ اگر وہ حسد کا شکار ہوتے تو اب تک کئی شاعروں، ادیبوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ چکے ہوتے۔ لیکن ناصر حسین زیدی جانتے ہیں کہ شاعر اور ادیب بے ضرر اور مسکین قسم کی مخلوق ہیں اور عموماً پہلے ہی شہید اور مقتول ہوتے ہیں اور اپنے مزار شریف کے اندر خود پر اُترا ہوا کلامِ نرم ونازک باہر ارسال فرما رہے ہوتے ہیں۔ مُردوں کو لات مارنا ناصر

زیدی شانِ مردانگی کے خلاف سمجھتے ہیں

البتّہ خود ناصر زیدی اس لحاظ سے شاعرانہ مزاج کے حامل بھی ہیں کہ اگر کبھی گلنار آفرین لو بلڈ پریشر (LOW BLOOD PRESSURE) کا شکار ہو جائیں تو ناصر حسین زیدی فوراً ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہو جاتے ہیں اور لگتا ہے کہ اب گرے کہ تب گرے۔ حالانکہ گلنار کا اپنا حال یہ ہے کہ ان کے قہقہے شدید بیماری کی حالت میں بھی جاری رہتے ہیں اور وہ اس حال میں بھی چُپ رہنا پسند نہیں کرتیں، شاید اسی ڈر سے کہ کہیں اُن کے منہ میں تھرمامیٹر لگا دیکھ کر ناصر زیدی ڈاکٹر سے یہ نہ پوچھ لیں کہ ڈاکٹر صاحب، یہ چیز (یعنی تھرمامیٹر) کتنے کی ملتی ہے۔ لیکن مُشکل یہ ہے کہ ناصر زیدی خود بھی انہیں چُپ کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے کیونکہ گلنار آفرین سے زیادہ تو یہ خود بولتے ہیں! اور وہ بھی یوں کہ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی''! انہوں نے یہ کہاوت سچ کر دِکھائی ہے کہ شادی سے پہلے مرد بولتا ہے اور عورت سنتی ہے، شادی کے بعد عورت بولتی ہے اور مرد سُنتا ہے اور ''شادی شدہ'' ہونے کے کچھ عرصے بعد دونوں بولتے ہیں اور زمانہ یعنی محلے والے سنتے اور سر دُھنتے ہیں۔ ہم ''اہلِ زمانہ'' کا ان دونوں کے رُوبرو بس یہی حال ہوتا ہے کہ ہم میں سے اگر کوئی کبھی کچھ کہنا بھی چاہے تو ان دونوں میں سے کسی کے چُپ ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے مگر مُشکل یہ ہے کہ لذیذ تر حکایات کا بیان اِن دونوں میں سے جو کوئی بھی کر رہا ہو وہ اِس ڈر سے کہیں کا مہ یا فل اسٹاپ لگائے بغیر اپنا بیان جاری رکھتا ہے کہ کہیں اُس کا نصف بہتر اُس کی بات اُچک کر اپنی کہانی کہنے والے دوسرے درویش کا رول ادا نہ کرنے لگے۔ مگر لطف یہ ہے کہ زمانہ ان دونوں کو سنتے سُنتے اُکتاتا بھی نہیں کہ ان کی اپنائیت، ان کی اپنے متنوع موضوعات پر گرفت اور ان کی لذّتِ بیان سبھی خاصے کی چیزیں ہیں۔ یہاں مجھے مچھّر مارنے کا ایک ''صدری'' نسخہ یاد آ گیا جو کسی مزاحیہ مضمون میں شاید میں نے ہی پیش کیا تھا کہ کسی گھر میں اگر مچھّر زیادہ ہو جائیں تو اُنہیں مارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی مشہور اور صحتمند قوّال کو مع ہمنواؤں کے مدّعو کر کے اُس گھر میں قوّالی کرالی جائے۔ جب یہ لفظی کسرت کے ماہرین اپنے فیل نُما جسموں کو جھٹکے دے دے کر، اُچک اُچک کر، چک پھیریاں لیتے ہوئے، اور اپنا گلا اور دوسروں کے کانوں کے پردے پھاڑتے ہوئے قوّالی فرمائیں گے اور ایک ایک مصرعے کو منہ سے قسطوں میں برآمد کرتے ہوئے پندرہ پندرہ تالیاں بجائیں گے تو ہاں کسی محوِ پرواز مچھّر کے زندہ بچ جانے یا کسی محوِ خواب مچھّر کی نیند حرام نہ ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ جو مچھّر ان قوّالوں کی تالیوں کے درمیان پس جانے اور شہادت کے رُتبے پر فائز ہونے سے بچ جائیں یا کچّی نیند کے عالم میں ہڑبڑا کر ان قوّالوں کے گلوں کے ''اوپن ایر تھیٹر'' میں گھس جانے کی سعادت حاصل نہ کر سکیں، وُہ اُن کی بھیانک پاٹ دار آوازوں سے نفسیاتی مریض ہو کر ہمیشہ کے لیے ترکِ وطن ہی نہیں کر جاتے، بلکہ اپنی نسلوں اور اپنے انڈوں تک کو نصیحت کر جاتے ہیں کہ اُس گھر میں داخل ہونے یا پیدا ہونے کی حماقت نہ کریں۔ بارے مچھّر کا بیان ختم ہوا۔ گلنار آفرین اور ناصر زیدی کے تذکرے میں قوّالوں اور مچھّروں کا ذکر لے آنے سے مقصد اُن کا موازنہ نہیں بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ اگر کسی جگہ گلنار اور ناصر زیدی تشریف فرما ہوں تو اُداسیاں، بوریت، پریشانیاں اُس جگہ سے ایسے ہی عنقا ہو جاتی ہیں جیسے کہ قوّالوں کی موجودگی میں مچھّر!

مضمون کے آخر میں گلنار آفرین کی ایک عادت کا ذکر ضروری ہے وُہ عموماً نجی ادبی صحبتوں میں ''شعبۂ خواتین'' کی الگ محفل میں بیٹھنا پسند نہیں کرتیں بلکہ وہاں سے اُٹھ کر اپنی برادری یعنی ادیبوں، شاعروں کے پاس آ بیٹھتی ہیں۔ اُن کی یہ عادت دراصل ایک علامتی حرکت ہے کیونکہ جب وہ ''جامِ نو'' سے اپنے ادبی سفر پر روانہ ہوئی تھیں تو ادب کے زنانہ ڈبّے کی فرسٹ کلاس سواری تھیں۔ لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے انہوں نے جدید افسانے اور نئے لہجے کی شاعری کا رجحان اختیار کر کے ادب کے مردانہ ڈبّے میں گھس کر پہلے سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبّے میں اپنے لئے مناسب جگہ تلاش کر لی ہے۔ چھوئی مُوئی تو وہ کبھی بھی نہیں تھیں البتّہ جیسی جرأت ان کے افسانوں کے موضوعات میں اب آئی ہے اُسے انہوں نے اپنی ذات کا حصّہ بھی بنا لیا ہے۔ تاہم اس جرأت اور اظہار رائے کی آزادی کے سلسلے میں اگر اُن کی باتوں سے کبھی کوئی مرد (ہر مرد کو گلنار ''مردوا'' کہتی ہیں) کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے تو گلنار جیسی نفیس اور گل صفت خاتون کانٹوں کا جھاڑ یا خاردار ببول کا درخت بن کر مذکورہ ''مرووئے'' کو (جو ظاہر ہے کہ عموماً کوئی ادیب، شاعر یا نقّاد ہوتا ہے!) اپنے لفظی جملوں اور علامتی کوسنوں سے لہولہان کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتیں کیونکہ وُہ ملنسار، خوش اخلاق، کشادہ ظرف اور جرأت مند خاتون تو ضرور ہیں مگر ''ماڈرن'' نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی شخصیت میں جدیدیت اور قدامت کا ایک خوبصورت امتزاج سمویا ہوا ہے چنانچہ جس قدر الرجک وہ مردوں کو روائتی کزن اور بھائی بنانے والی عورتوں سے ہیں، اس سے کچھ زیادہ ہی الرّجک اُن خوش فہم مجنوں صفت مردوں سے بھی ہیں جو صنفِ نازک کو صرف ایک ہی رشتے سے دیکھنے کی کور چشمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ چنانچہ مَیں اِس مضمون کو تمام خواتین و حضرات کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے ختم کرتا ہوں کہ مردانہ ڈبّے کی اِس زنانہ سواری سے ہوشیار!!

آدمی کو میسر نہیں!

''ہم پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا
اور مچھلی کی طرح پانی میں
تیرنا تو سیکھ گئے ہیں، بس اب
یہ سیکھنا باقی ہے کہ زمین پر
انسانوں کی طرح
کیسے رہیں''

جارج برنارڈ شا

براہِ راست

بنی نوع انسان کو آج نہیں تو کل سود و زیاں کا حساب کرنا ہی ہوگا۔ بظاہر سوال سنجیدہ بھی ہے اور گہری معنویت کا حامل بھی مگر جواب قطعی سیدھا اور آسان ہے۔ کم وقت میں بہت کچھ بلکہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش اور خواہش۔

اردو ادب کی تین سو سالہ تاریخ کا بغور جائزہ لیں تو یہاں بھی شتابی مزاجی نمایاں اور واضح نظر آتی ہے مگر آج کی محفل کے مہمانِ خاص جناب نسیمِ سحر کا مزاج، معیار اور برتاؤ اپنے بزرگانِ خاندان جناب غلام نبی کامل، جناب عبد العزیز فطرت، جناب ایوب محسن کی پیروی میں باوضع بھی ہے اور باوقار بھی۔

کم و بیش نصف صدی پر مشتمل علمی، ادبی اور شعری سفر میں جناب نسیمِ سحر نے ذاتی یا وقتی مفاد پر ہمیشہ اردو ادب اور شاعری کو مقدم جانا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جناب نسیمِ سحر اور اُن کے خاندان کی ادب پروری کو دل و جان سے سراہا جاتا، اعتبار اور اعتماد کی مسند پر بٹھایا جاتا اور وہ سب کچھ کیا جاتا جو ایک صاحبِ کردار عاشقِ اردو کا استحقاق بنتا ہے مگر افسوس صد افسوس ہوا قطعی برعکس۔

آج کی نشست میں اسی خلش، قلق اور ملال کی تلافی کرنے کی ادنیٰ کاوش کی گئی ہے جس کی بابت ہمیشہ کی مانند اس بار بھی آپ کی مہرِ تصدیق اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔

گلزار جاوید.....

☆ آپ کا آبائی تعلق خوشاب کے گاؤں ماڑی سے بتلایا جاتا ہے مگر راولپنڈی ہجرت کے اسباب کا ذکر کہیں نہیں ملتا؟

☆☆ جی ہاں، اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ہجرت مجھ سے قبل چوتھی یا پانچویں نسل نے کی تھی، میری ہی نہیں، میرے والدین کی پیدائش بھی راولپنڈی شہر میں ہوئی تھی، ایسے میں پتہ نہیں کس غلط فہمی کے تحت میں نے یہ فرض کر لیا کہ ہمارا آبائی تعلق خوشاب کے گاؤں ماڑی سے ہے۔ جبکہ بعد میں میجر صادق نسیم مرحوم کی ایک تحریر سے علم ہوا کہ ہمارا تعلق فتح جنگ میں واقع گاؤں ماڑی سے ہے۔ مجھے یاد ہے، بہت ہی بچپن میں میں اپنے خاندان کے ساتھ ایک مرتبہ ''ماڑی'' گیا بھی تھا۔ ماڑی سے ہمارے رشتہ دار بھی راولپنڈی آتے رہے اور مختلف کاموں کے لیے یہاں قیام کرتے رہے۔ لیکن مجھے اپنے گاؤں کے حوالے سے کوئی واضح یادداشت کہیں بھی نہیں ملی۔ بائی داوے، ۱۹۴۴ء میں جب میری پیدائش ہوئی، راولپنڈی بھی تو ایک گاؤں ہی تھا، سوائے ایک فوجی چھاؤنی کے اس کی بھلا کیا اہمیت تھی۔ ہم محلّہ امام باڑہ میں جہاں رہتے تھے اس سے ذرا آگے دسہرہ گراؤنڈ شروع ہو جاتا تھا۔ شہر جیسی رونق کم کم ہی میسر تھی۔

☆ کبھی آپ کے دل میں یہ اشتیاق، جستجو پیدا نہیں ہوئی کہ اپنے نانا جناب غلام نبی کامل کو شعر و سخن کی لگن کب، کہاں اور کیسے لگی؟

☆☆ یہ تو کبھی خیال نہیں آیا، البتہ مجھے اپنا نانا جناب غلام نبی کامل کی خدمت کا بہت موقع ملا ہے۔ امام باڑہ کے کوچہ ''مستریاں'' میں ہم سب اہلِ خاندان آباد تھے۔ ہمارے سامنے ہی نانا جی کا گھر تھا۔ سارا دن ہی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے لاتعداد مرتبہ میں لوٹا لے کر نانا جی کو وضو کرایا کرتا تھا۔ پانی بھی گلی کے نلکے سے لانا ہوتا تھا۔ مسح کا صحیح طریقہ بھی میں نے وہیں سے سیکھا۔ جہاں تک شعر و سخن کی لگن کا تعلق ہے، میرا ذہن ان دنوں یہ باتیں سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پنجابی زبان کے اچھے شاعر تھے۔

☆ نانا غلام نبی کامل، ماموں عبدالعزیز فطرت، ماموں ایوب محسن کی نسبت آپ کے احساسات اور آپ کے شعری مزاج و مذاق میں اُن کے کردار سے آگاہی وقت اور موقع کی ضرورت ہے؟

☆☆ نانا جی کے بارے میں تو عرض کر چکا کہ ان دنوں میں شعورِ شعر ہی سے آگاہ نہ تھا۔ ہاں ان کے فرزندِ اکبر اور میرے ماموں عبدالعزیز فطرت اور میرے رشتے کے ماموں جناب ایوب محسن سے تو میں نے شعوری یا لاشعوری طور پر جتنا استفادہ کیا ہے اس کی کوئی حد ہی نہیں۔ ماموں عبدالعزیز فطرت کے گھر کا نام ہی 'سدا بہار' تھا اور قیامِ پاکستان سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ان کا گھر ادبی طور پر سدا بہار تھا کہ ہندوستان کے دور دراز شہروں اور پاکستان سے بھی آنے والے معروف شعراء کا قیام ان کے گھر ہی میں ہوتا اور ان کی 'بیٹھک' میں جو ادبی محفلیں برپا ہوتیں ان میں مجھے جانے کا موقع بھی ملتا رہتا۔ پھر میں نے وہ منظر بھی دیکھے کہ ماموں فطرت صحن میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھ میں رائٹنگ پیڈ اور قلم ہے، اور وہ خیالوں میں مستغرق ہیں، ان دنوں وہ ریڈیو کے لیے فرمائشی نظمیں گیت وغیرہ لکھا کرتے تھے، 'مستغرق' کا لفظ میں نے لکھا تو ہے لیکن اس استغراق کے عالم میں بھی وہ ہم بچوں سے ہنسی مذاق بھی کرتے تھے، بیگم اور بیٹیوں سے بھی گپ شپ کرتے تھے۔ ان سے میں نے براہِ راست تو کبھی اصلاح نہیں لی لیکن ان کی شخصیت سے متاثر بہت رہا۔ ان کے ہاں سے مجھے ادبی رسائل کی سپلائی بھی باجیوں یعنی ان کی بیٹیوں کے ذریعے ہوتی رہتی تھی۔ ہدایت، تعلیم و تربیت، کھلونا جیسے رسائل باقاعدگی سے پڑھنے کا سلسلہ وہیں سے چلا۔ اب جہاں تک رشتے کے ماموں الحاج ایوب محسن کا تعلق ہے، ان سے ان دنوں بھی بڑی قربت رہی جب میں ان کی دامادی میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ چونکہ ہماری فیملی پورے

خاندان میں غریب ترین تھی (میٹرک پاس کرنے کے بعد میں بے روزگار تھا) والد صاحب فوج سے بطور سپاہی ریٹائر ہو چکے تھے، بڑا بھائی بھی فوج میں تھا لیکن گھر کے اخراجات کے لئے کچھ نہ دیتا تھا، سچ پوچھیے تو فاقوں کی نوبت بھی آتی رہتی تھی، کئی مرتبہ تو میں نے اپنی پرانی کاپیوں سے لفافے بنائے، اور محلے کے دوکاندار کے پاس گیا تو اس نے میری رونی صورت دیکھ کر تسلی دی) بہرحال میری والدہ ایک دن محسن صاحب کے پاس گئیں اور خدا کا واسطہ دیا کہ نسیم کو کسی بھی جگہ نوکری دلا دو کہ ہمارا گزارا چلے۔ دوسرے ہی دن انہوں نے مجھے سہ روزہ ''راہ و منزل'' میں کلرک کے طور پر ملازمت دے دی، کلرکی کا تو نام ہی تھا، وہاں دفتری اور چپراسی کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے اس ملازمت نے میری زندگی بدل دی۔ وہیں محسن صاحب نے مجھ سے مشکل مشکل انگریزی مضامین (ٹرانسپورٹ کے شعبے سے متعلق) کروائے، راہ و منزل ہی میں میں نے کچھ فکاہیہ مضامین بھی لکھے۔ محسن صاحب پاکستان رائٹرز گلڈ راولپنڈی ریجن کے سیکرٹری منتخب ہوئے تو راہ و منزل کے دفتر میں ادیبوں اور شاعروں کی آمد و رفت ہونے لگی، احمد فراز، محسن احسان، کشور ناہید، شہزاد احمد، قتیل شفائی، صادق نسیم، اور بیشمار لوگوں سے وہیں شناسائی ہوئی۔ پیشہ ورانہ طور پر میں نے ٹائپنگ تو سیکھ ہی لی تھی، اب شارٹ ہینڈ سیکھنی بھی شروع کر دی۔ سرکاری اداروں میں نوکری کے لیے اس زمانے میں ''ایمپلائمنٹ ایکسچینج'' کے نام سے ایک ادارہ ہوتا تھا اس میں اپنا نام رجسٹر کرایا اور چند مہینوں میں مجھے وزارتِ خزانہ میں سٹینوٹائپسٹ کی نوکری مل گئی۔ مگر محسن صاحب نے مجھے شام کو راہ و منزل میں ملازمت جاری رکھنے کے لیے کہا۔ وقت گزرتا گیا۔ مزید سرکاری امتحان پاس کرنے کے بعد میں سٹینوگرافر اور پھر سرکاری انگلش رپورٹر قومی اسمبلی میں ہو گیا۔ اور وہ دن بھی آیا کہ میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں ٹاپ کر کے وزارتِ خزانہ کے سٹینوگرافرز کی سینیارٹی کے لسٹ میں سرِ فہرست آ گیا، مجھے سیلیکشن گریڈ بھی مل گیا، اور سینیارٹی طفیل میری پوسٹنگ بھی وزیرِ خزانہ کے پی اے کے طور پر ہو گئی۔ بس پھر تو تین چار سال یوں گزرے کہ اللہ دے اور بندہ لے، آج لاہور، کل کراچی۔ ۱۹۸۰ء میں میں ڈیپوٹیشن پر ایک عالمی اسلامی ترقیاتی ادارے میں جدہ چلا گیا اور پھر ۲۰۱۱ء تک وہیں رہا۔ وہاں کی پیشہ وارانہ زندگی میں مجھے تقریباً ۴۵ مسلم اور غیر مسلم ممالک کا دورہ کرنے کا موقع ملا جو الگ تفصیل کا محتاج ہے۔ جدہ میں میری ادبی سرگرمیاں حقیقی معنوں میں عروج کو پہنچیں اور دنیا بھر سے آئے ہوئے تمام شعراء نقادان اور دانشوروں سے ملاقات کا موقع ملا۔ یوں میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک انتہائی غریب خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے اچھے دن اور خوشحالی دکھائی کہ جس پر میں اس کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے۔

☆ اگر آپ کے حافظے میں پہلی بار شعر کہنے کی تڑپ اور بے کلی محفوظ ہو تو ہمیں اور ہمارے قاری کو اُس میں شریک کیجیے اور اُس کے نتائج سے آگاہی بھی دیجیے؟

☆☆ شعر کہنے کی ایک بے چینی تو مجھے ساتویں آٹھویں کلاس کی تعلیم کے دوران ہی محسوس ہوتی تھی۔ ہدایت، تعلیم و تربیت کے علاوہ بچوں کی کتابوں میں بھی نظمیں پڑھ کر بے اختیار جی چاہتا تھا۔ کوشش بھی کی۔ ہر طالبعلم کی طرح میٹرک کے بعد تو بیاض بھی بنائی، میٹرک کے بعد کچھ مزاحیہ شاعری کی طرف بھی دھیان ہو گیا۔ البتہ یہ یاد ہے کہ ان دنوں مجھے عروض و بحور کا کوئی ادراک نہیں تھا۔ جب میں نے میٹرک کے بعد ایف اے انگلش آنرز کیا تو پھر بتایا گیا کہ بی اے کرنے کے لیے فارسی یا پنجابی میں فاضل کرنا پڑے گا۔ اور یہی وہ وقت ہے جب عروض و بحور کا مجھے ادراک ہوا۔ فاضل پنجابی میں صوفی شعراء کی کم از کم بائیس کتابیں شامل تھیں۔ ہمارے پڑھانے والے استاد ماسٹر سلیمان بھی اچھے تھے سمجھا کر پڑھاتے تھے۔ بس یوں کہیے کہ ایک سہانی شام کلاس میں بیٹھے بیٹھے جب میں کسی صوفی شاعر کا کلام پڑھ رہا تھا تو یکا یک محسوس ہوا کہ اب جس طرح میں پڑھ رہا ہوں یہی پورے وزن میں ہے۔ بار بار پڑھا اور اس روز مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اب مین کسی بھی بحر کے شعر کو تقطیع کے ساتھ اور شعری انداز میں پڑھ سکتا ہوں۔ بس پھر کیا تھا، گھر واپس آ کر جب میں نے اپنی لکھی ہوئی شاعری دیکھی تو ساری بیاضیں وہیں پھاڑ ڈالیں اور بس اسی لمحے مجھ اللہ تعالیٰ نے شعر فہمی اور عروض و بحور کا ادراک عطا کر دیا۔ یہاں یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ بی اے انگلش میں نے پروفیسر نذیر احمد جیسے معروف اور ذہین ٹیچر سے پڑھی تھی جنہوں نے انگریزی شاعری یوں پڑھائی کہ وہ مجھے تقریباً حفظ ہو گئی۔ انہوں نے الفاظ کے معانی اور حسنِ ترتیب جیسے محاسن سے بھی آگاہ کیا۔

☆ آپ کے اولین شعری مجموعہ ''پہلی اُڑان'' کے بعد شعری حلقوں کو جس اُٹھان کی اُمید تھی آپ کے خیال میں وہ کس حد تک پوری ہو سکی؟

☆☆ اس کا جواب تو ادبی و تنقیدی حلقے ہی دے سکتے ہیں۔ ویسے ہلکے پھلکے انداز میں جب ''اڑان'' ہو گئی تو پھر اٹھان کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟

☆ غزل کا مطلب آپ سے بہتر کم از کم ہم نہیں جانتے مگر ہم تو آپ کے ہاں کام اور عشق کے تناسب سے بھی قطعی بے خبر ہیں؟

☆☆ کام اور عشق میں تناسب کے اعداد و شمار ابتدائے عمر میں کچھ اور زندگی لئے ہر مرحلے کے بعد کچھ اور ہوتے ہیں یہ تناسب کبھی فِکس نہیں رہتا۔ کبھی عشق ایسا سوار ہوتا ہے کہ شاعری کہیں پیچھے رہ جاتی ہے، اور کبھی شاعری عشق کے معاملات کو سائڈ لائن کر کے عشق پر حاوی ہو جاتی ہے۔

☆ آپ کی شاعری کے حرکی پہلو کی نشان دہی کرنے والے کس خاص نسبت یا حوالے کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ نقادان اپنے اپنے زاویے سے شاعر کی شاعری میں مختلف پہلو تلاش کرتے ہیں۔ کچھ آپ یاد کرائیں کس شخصیت نے حرکی پہلو کی نشان دہی کی تا کہ میں اس بات کا خاطر خواہ جواب دے سکوں۔

☆ قطار سے باہر کھڑے ہوئے کی اصطلاح کس بات کی دلیل ہے؟

☆☆ پتہ نہیں قطار سے باہر مجھے کس تنقید نگار نے کہا، ذرا یاد دلائیں تو بات آگے بڑھے۔

☆ خواب کے بدن کا نظارہ کرنے کے تمنائی کے ہاتھ کیا کچھ لگا اور اُس کے فنی اظہار کس شکل میں برآمد ہوئے؟

☆☆ خواب کے بدن کا نظارہ تو ایک ایسی کیفیت کا اظہار ہے جس کا تمنائی وہ کچھ دیکھنا چاہتا ہے جو اسے وہ شعر کہنے تک دکھایا نہیں گیا، میرا خیال ہے میرے بعد کے اشعار میں کئی جگہ خواب کے بدن کے نظارہ کا ذکر ہے اور تمنائی کو تمنایاب ہونے کا اشارہ بھی ہے۔

☆ کائنات سے مخفی ربط رکھنے کی بات کشف و کرامات کی نشان دہی تو نہیں کر رہی؟

☆☆ یہ ربط خفی ہو یا جلی، کشف و کرامات کی کیفیات سے جدا نہیں ہوسکتا۔

☆ آپ کا تہذیبی پس منظر دیکھ کر تو تجربات کی بابت یقین کرنا محال ہے مگر نقارۂ خلقِ خدا کو جھٹلانا بھی قرینِ قیاس نہیں۔ آپ ہی اپنے تجربات سے آگاہی دے کر ہماری الجھن دور کر دیجیے؟

☆☆ شاید آپ نے تجربات کو کسی قدر منفی تناظر میں دیکھا ہے۔ تہذیبی پس منظر رکھنے والے کے تجربات مثبت اور تعمیری بھی تو ہوسکتے ہیں۔ نقارۂ خلقِ خدا اس تناظر میں دیکھیں۔

☆ وہ کون سے مختلف النوع مسائل اور موضوعات تھے جن پر اپنا عمل محفوظ و مامون رکھنے کی جستجو کرنا پڑی؟

☆☆ مسائل اور موضوعات کی تو کوئی حد نہیں ہوتی۔ ممکن ہے آپ یہ کہنا چاہ رہے ہوں کہ ان موضوعات پر میں کھل کر کیوں نہیں لکھ سکا۔ تو بات پھر وہی تہذیبی پس منظر کی آجاتی ہے۔

☆ سامنا پن، روبروئی اور مدِ مقابل ہونے کی صلاحیت کس بنا پر سراہی جارہی ہے؟

☆☆ یہ تینوں ایک ہی کیفیت کے مختلف درجات ہیں۔ اگر کسی نے اس صلاحیت کو سراہا ہے تو ممکن ہے اس نے ان میں کچھ اچھا پہلو دیکھا ہو۔

☆ موضوع کے ساتھ چلنے یا بدلنے کے بجائے ری سیٹ کرنے کا معمہ آج حل کر ہی دیجیے؟

☆☆ پہلے آپ اس سوال کو یوں ری سیٹ کریں کہ میری سمجھ میں آسکے۔ معمہ حل آپ کریں۔

☆ خاموش رہ کر شعری تیور کا تاثر قائم رکھنے کا ہُنر آپ کی دسترس میں کب اور کیونکر آیا اور اُس سے آپ یا آپ کے قاری کے ہاتھ کیا لگا؟

☆☆ میرے لیے یہ سوال کسی قدر مبہم ہے اس لیے کہ شعری تیور کا تاثر قائم کرنے اور قائم رکھنے کے ہنر کے لیے تو شاعر کو کچھ کہنا پڑتا ہے۔ وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے تو یہ شعری تیور کا تاثر نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں خاموش رہ کر ایسا کرتا رہا ہوں تو پھر قاری کے ہاتھ تو کیا آنا تھا، میرے ہاتھ بھی کچھ نہ آتا۔

☆ یہ خیال بھی گنجلک ہے کہ آپ کے ہاں کسی احساس، خیال یا جذبہ کو دوسرے احساس، جذبہ یا خیال سے تبدیل کیا جاتا ہے؟

☆☆ واقعی یہ خیال کافی گنجلک ہے، ذرا اس کی مزید وضاحت ہو جائے کہ کیسے کوئی شاعر یا قلمکار کسی احساس، خیال یا جذبے کو کسی دوسرے احساس، جذبے یا خیال سے تبدیل کرتا ہے۔ اس صورت میں تو شعر یا اس کے موضوع میں جان ہی نہیں رہتی، احساس، جذبہ یا خیال جس صورتِ حال کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں وہی تو تخلیق کا اصل حسن ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کسی شاعر نے کبھی ان تینوں چیزوں کو دوسری تین چیزوں سے تبدیل کیا ہو۔

☆ Next Option کی بات کرنے والے اپنی بات سمجھانے میں ناکام رہے یا ہم ناسمجھ نکلے یہ گتھی آپ ہی سلجھا سکتے ہیں؟

☆☆ جس طرح آپ سب کچھ سمجھنے کے باوجود اپنے آپ کو ناسمجھ قرار دے رہے ہیں، اسی طرح میں خود کو اس لیے ناسمجھ قرار دے رہا ہوں کہ میری سمجھ میں تو Next Option کی بات ہی نہیں آرہی۔ اگر میرے کسی نقاد نے ایسا کہا ہے تو شاید اپنی ہی کسی کیفیت میں کہہ دیا ہو۔

☆ عمل سے پہلے کا عمل والی بات بھی تجسس کو مہمیز دے رہی ہے؟

☆☆ یہ سوال بھی میری ذہنی حد سے کسی قدر اوپر سے گزر رہا ہے۔

☆ پروفیسر اقبال واجد نے آپ کی شاعری کے حوالے سے Eleventh Hour پر جس شدومد سے زور دیا ہے اُس کے بعد حقیقت حال جاننا لازمی ہو جاتا ہے؟

☆☆ ہر نقاد کی اپنی لفظیات ہوتی ہیں۔ انڈیا کے نقاد کے الفاظ بعض اوقات آپ کو حیران کر دیتے ہیں۔ وہاں کی مختلف ریاستوں میں جو اردو بولی جاتی ہے اس کی اپنی اپنی لفظی اور تنقیدی اصطلاحیں ہیں۔ پروفیسر اقبال واجد نے Eleventh Hour کی جو بات آج سے کوئی پچیس برس کہی تھی، شاید ان دنوں اس عنوان سے کوئی انگریزی فلم چل رہی ہوگی۔ اب میں نقادوں سے ان کے استعمال کردہ الفاظ کے معنی یا تشریح تو پوچھ نہیں سکتا۔ انہوں نے ایک شاعرہ ریحانہ روحی پر تنقیدی مضمون لکھتے ہوئے اس کی شاعری میں ''شہوت'' کا ذکر کیا تو میرے کان کھڑے ہوگئے۔ بہت غور کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ ان کا مطلب جنس یا سیکس سے ہے جو کہ شہوت کے مطلب سے یکسر مختلف ہے۔ صد شکر کہ وہ کتاب میں ہی شائع کر رہا تھا اور میں نے ریحانہ روحی پر ان کے ضمون میں ہر جگہ شہوت کے لفظ کو جنس سے بدل ڈالا۔ ورنہ کتاب شائع ہوتی تو کم از کم پاکستان میں اس پر بڑے اعتراضات ہوتے۔

☆ کچھ لوگ آپ کے باب میں ''امساک'' کا حوالہ اکثر دیا کرتے ہیں۔ صحیح صورت حال کا ادراک آپ سے بہتر کس کو ہوسکتا ہے؟

☆☆ جہاں تک ''امساک'' کے حوالے کا تعلق ہے، یہ لفظ پہلی اور آخری بار میری شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر اقبال واجد نے ہی استعمال کیا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ کسی اور تنقید نگار نے یہ لفظ استعمال کیا ہو۔ اور انڈیا کے نقادوں کی لفظیات کے بارے میں میں پچھلے سوال میں جواب دے چکا ہوں۔

☆ ترک اور انکار مگر کب کب، کہاں کہاں اور کیوں ضروری گردانا گیا؟

☆☆ اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ جہاں جہاں اس کی مقابل کیفیات کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ لیکن مزید وضاحت آپ کے سوال کے مزید واضح ہونے پر دی جاسکتی ہے۔

☆ تجاہلِ عارفانہ الزام ہے یا التزام دونوں صورتوں میں اس کے ذکر کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ اگر یہ میرے کسی شعر سے محسوس ہوتا ہے تو وہ شعر لکھیں تا کہ تفصیل سے بات کرسکوں۔

☆ آپ کی شاعری میں گمشدگی اور اسرار کا ذکر بھی ابہام پیدا کر رہا ہے مثلاً کیا گُم ہوا اور کیوں گُم ہوا وغیرہم؟

☆☆ گمشدگی اور اسرار تو ایک ایسی شاعرانہ کیفیت ہے جو کبھی بھی کسی شاعر پر طاری ہوسکتی ہے۔ گمشدگی کی یہ کیفیت اگر عارضی ہو تو بہتر، ورنہ تو پھر شاعر گیا۔ جہاں تک اسرار کا تعلق ہے یہ تو ہر انسان کو بھی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ شاعر کو یہ تجربات اکثر ہوتے رہتے ہیں اور ان کا ذکر اگر واضح طور پر نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب ابہام نہیں، بلکہ بہت سے اسرار ایسے ہوتے ہیں جنہیں بیان کرنے سے گریز بہتر ہوتا ہے۔

☆ وہ کون سے اشعار یا شاعری ہے جن کو آپ معنی کی تکثیر اور ضبط سے آزاد کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ سوال میری سمجھ میں نہیں آرہا۔

☆ وہ کونسی زنبیل ہے جس میں بقول جناب خاور اعجاز آپ نے وقت کا بڑا ٹکڑا چھپا رکھا ہے جس سے فالتو گھڑیاں بنانے کا کام لیتے ہیں؟

☆☆ خاور اعجاز میرا بہت اچھا دوست ہے، اس نے یہ اس تناظر میں کہا ہے کہ میں دیگر تمام سرکاری، غیر سرکاری اور نجی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اتنا بہت سا کام نظم ونثر میں کیسے کر لیتا ہوں۔ آج سے تقریباً تیس بتیس برس پہلے ایک ٹی وی انٹرویو میں بھی مجھ سے یہی سوال کیا گیا تھا کہ آپ یہ سارا کام دن کے چوبیس گھنٹوں میں کیسے کر لیتے ہیں۔ جس پر میں نے جو جواب دیا وہ کافی عرصے تک ''کوٹ'' ہوتا رہا۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ جس پر مہربان ہوتا ہے اس کے لیے چوبیس گھنٹوں کے اندر اڑتالیس گھنٹوں کی گنجائش نکال دیتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں وُرڈ سورتھ کی طرز پر شہروں کی بڑھتی آبادی، کثافت اور گھٹن کے شکوہ کو اتفاق گردانا جائے، استفادہ یا حالات کا جبر؟

☆☆ شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ میں راولپنڈی میں اس وقت سے آباد ہوں جب کہ یہ ''راول پنڈ'' تھا۔ اسلام آباد میری آنکھوں کے سامنے بنا، جدہ جیسا شہر ایک چھوٹی سی بندرگاہ سے انٹرنیشنل شہر میری آنکھوں کے سامنے بنا۔ چنانچہ ورڈسورتھ نے بہت پہلے میری کیفیات کی یا میں نے بہت بعد میں اس کی کیفیات کی ترجمانی کی تو کیا عجب ہے۔

☆ جب لوگ آپ کے گہرے نفسیاتی شعور کا ذکر کرتے ہیں تو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ذہن سگمنڈ فرائڈ کی جانب جانا لازمی امر ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہے اس کی پردہ کشائی فرمادیجئے؟

☆☆ یہ تو مجھے اپنی نفسیاتی تحلیل سے ہی کرنا پڑے گا۔ مگر یہ کام میرے لیے آسان نہیں ہے۔ کوئی ماہرِ نفسیات تلاش کیجیے کہ ایسا ہوسکے۔

☆ بنیادی طور پر آپ غزل کے شاعر ہیں۔ ہمیں تلاش اُس حوالے کی ہے جس نے آپ کو عقیدت کا شاعر بنادیا؟

☆☆ عشق کا سفر مجاز سے حقیقت کی طرف کہیں نہ کہیں سے تو شروع ہونا ہی ہوتا ہے۔ جدہ میں کچھ نعتیہ محافل میں بیٹھ کر ایک روز اچانک پورا بدن خجالت کے پسینے میں نہا گیا کہ میں اب تک غزل کہتا رہا، نعت کیوں نہیں کہی۔ بس پھر نعت بھی کہی، حمد بھی۔ وہاں کا ماحول بھی ایسا تھا کہ ایک دو نعتیہ انجمنوں کا مجھے عہدیدار بھی بنا دیا گیا۔ اب تو عقیدت کی شاعری میری رگ رگ میں رچی بسی ہے۔ وہاں دائرۂ نعت کا صدر تھا، یہاں بزمِ حمد ونعت کا سرپرستِ اعلیٰ ہوں، حمد و نعت کہنے کے ساتھ سات حمدیہ ونعتیہ محافل کے انعقاد میں عملی طور پر حصہ لیتا ہوں۔ خدا کرے کہ یہی سلسلہ قائم رہے۔

☆ غزل کے بعد آپ نے جس لگن اور تواتر سے عقیدت کی شاعری کی اُس کے سبب نظم کی حق تلفی ہونا فطری بات ہے؟

☆☆ جی نہیں جناب، عقیدت کی شاعری تو ہے ہی، مگر شاعری کسی ایک جگہ محدود نہیں رہ سکتی۔ نظمیں بھی کہتا ہوں، ایک نظموں کا مجموعہ مدت سے اشاعت کے لیے تیار ہے، مصروفیات کے باعث شائع نہیں ہوسکا۔ اور یاد رہے نظم کی حق تلفی اس لیے نہیں ہو رہی کہ عقیدت کے موضوعات پر بھی اور امتِ مسلمہ کی صورتِ حال پر بھی مسلسل نظمیں کہہ رہا ہوں۔

☆ صنفِ ہائیکو سے آپ کی رغبت اور اُس کی ترقی وترویج میں آپ کی سرگرمی کے اسباب اور نتائج سے آج کی نشست میں آگاہ فرمادیجئے؟

☆☆ ان دنوں جب ہم نے شاعری کا آغاز کیا، راولپنڈی اسلام آباد میں جاپانی صنفِ سخن ہائیکو کی آمد کا دور دورہ تھا۔ آج کے معروف ہائیکو نگار علی محمد فرشی، رفیق سندیلوی، خاور اعجاز، ڈاکٹر بشیر سیفی مرحوم، ہم سب نے ایک لحاظ سے مل کر ہائیکو کو پروموٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ کراچی، لاہور اور دیگر شہروں کے مقابلے میں راولپنڈی میں ہائیکو کی ایک مظبوط بنیاد پڑ گئی۔ ہم نے مالی معاونت کے ساتھ دوستوں کے ہائیکو کے انتخاب بھی شائع کیے۔ بہت بعد میں جاپانی سفارتخانے کے تعاون سے پاکستان ہائیکو سوسائٹی کی بنیاد بھی پڑی۔ اور مجھے خوشی ہے کہ ہم نے اپنے حصے کا کام اچھے طریقے سے کیا۔ کچھ اصحاب سفارتخانے کے ساتھ مالی معاملات میں الگ ہو گئے مگر ہائیکو کی ترویج وترقی میں ان کا کردار بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

☆ آج کل گہری مذہبیت بہت گہری معنویت کی حامل گردانی جاتی ہے۔ آپ ہمیں اُس گہری مذہبیت سے آگاہ کر دیجئے جس کا ذکر خورشید رضوی صاحب نے آپ کے حوالے سے کیا ہے؟

☆☆ گہری مذہبیت انسان میں پودے کی طرح اگائی نہیں جاسکتی۔ یہ تو

آپ کے اندر سے اگتی ہے۔ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے جس محبت سے اس گہری مذہبیت کا میرے حوالے سے ذکر کیا ہے وہ ان کا حسنِ نظر بھی ہوسکتا ہے۔ اس موضوع پر بات کرنا ویسے بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کہ اپنی ذات کی نمائش مذہبیت یا کردار کے حوالے سے اعلانیہ کرنا میری عادت نہیں۔

☆ جمیل یوسف صاحب نے جس اخلاص اور محبت سے آپ کی خاکہ نگاری کو موضوعِ قلم بنایا ہے اُس کے بعد اس صنف سے آپ کی محبت کا حوالہ تفصیل طلب ہوجاتا ہے؟

☆☆ جی دراصل خاکہ نگاری، مزاح نگاری اور فکاہیہ نگاری میرے ادبی سسٹم کا حصہ ہیں۔بچپن اور لڑکپن میں جب میں اپنے مختلف رشتہ داروں کی طرف سے ''منشی'' کا فرض نبھاتے ہوئے ان کے دوسرے شہروں والے رشتہ داروں کو خط لکھتا تھا تو کہیں نہ کہیں کوئی شرارتی جملہ بھی لکھ دیتا تھا۔کئی بڑے ادیبوں کو کبھی خط لکھا تو اسی موڈ میں، اور ان سے تحسین حاصل کی کہ میرے اندر مزاح نگاری اور خاکہ نگاری کے عناصر موجود ہیں۔ پھر جدہ میں ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ ایک دوست کا خاکہ ''زلفی مائی فرینڈ'' کے عنوان سے لکھا۔آپ کو یاد ہوگا کہ اس عنوان سے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم پر ایک کتاب انڈیا کے کسی رائٹر نے لکھی تھی۔ مگر میرا یہ خاکہ آج کے معروف شاعر تسلیم الٰہی زلفی کے بارے میں تھا جو ایک محفل میں پڑھا تو یاروں نے مجھے خاکہ نگار کا منصب عطا کر دیا اور پھر یہ ایک روایت بن گئی کہ کسی بھی فنکار یا قلمکار کے لیے تقریب ہوگی تو اس میں میرا خاکہ ضرور شامل ہوگا، بس یہی میرا حوالہ ہے اور جناب جمیل یوسف کی محبتوں کا میں مقروض ہوں کہ انہوں نے دل کھول کر میرے فنِ خاکہ نگاری کی تعریف کی ہے۔ان کے علاوہ شجاعت علی راہی، خاور اعجاز، ڈاکٹر فرحت عباس جیسے قلمکاروں نے بھی میری خاکہ نگاری پر مضامین لکھے ہیں۔

☆ آپ کے ہاں خاکے اور تبصرے فکاہی رنگ میں رنگے ہونے کا سبب مزاج کی شگفتگی کی عکاس ہے یا قاری کو دبوچنے کی کوشش؟

☆☆ ہاہاہا۔ قاری کو تو میں دونوں طرح دبوچ سکتا ہوں۔ جیسا کہ پچھلے سوال کے جواب میں کہا میرا مزاج ہی زندہ دلی اور شگفتگی کا ترجمان ہے۔جدہ کے مشاعروں کے علاوہ اب راولپنڈی کے مشاعروں میں بھی میں کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا اور کسی نہ کسی پر فقرہ اچھالتا رہتا ہوں۔شرارت میری نس نس میں بھری ہے جسے بعض اوقات سنجیدگی میں چھپانا میرے لیے مشکل ہوجاتا ہے۔

☆ آپ جیسے مذہبی رجحان کے حامل انسان اور عقیدت میں شرابور شاعر کو جدیدیت کا علمبردار ٹھہرانا کم از کم ہمارے لیے باعثِ تعجب ہے؟

☆☆ متفق۔ میں خود حیران ہوں، شاید جدیدیت کو یہاں اس مفہوم میں نہیں لیا گیا جہاں مذہبی رجحان کی نفی اور عقیدت کو رد کیا جاتا ہے۔جدیدیت ایک طرزِ عمل کا نام ہے، اس کا انسلاک مذہبی رجحان سے کرنا زیادتی ہوگی۔

☆ آپ کے کام کی نسبت اردو تنقید میں آپ کی موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔آپ جیسے مرنجاں مرنج اور دوستدار بلکہ دوست نواز شاعر کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟

☆☆ اس بارے میں میں کیا عرض کروں۔میرے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر بقول آپ کے میری موجودگی اردو تنقید میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ٹھیک فرما رہے ہیں آپ، مگر گلزار جاوید بھائی، کیا میں اس لیے لکھوں کہ اردو تنقید میں اپنا وجود ثابت کروں؟ یا تنقید نگاروں سے درخواست کروں کہ مجھ پر مضمون لکھیں۔نہیں صاحب، ایسا مجھ سے تو کبھی نہیں ہوسکے گا۔

☆ اس حوالے سے ایک خیال یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ آپ کے ہاں معیار کے مقابلے مقدار کو زیادہ دخل ہے؟

☆☆ ہاں میں ایک حد تک آپ سے متفق ہوں۔مقدار زیادہ ہونے کی وجہ سے نقاد کو شاید اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ میرے مجموعی کام کا جائزہ لے اور شاید وہ sampling سے کام چلا رہا ہو۔ ویسے مقدار کے بارے میں بیشمار عہدِ حاضر کے شعراء مجھ سے کہیں آگے ہیں۔اور میں سمجھتا ہوں کہ صرف کم لکھنا ہی معیار کی شرط پوری نہیں کرتا۔ بیشمار کم لکھنے والے بھی مروجہ معیار پر پورا نہیں اترتے جبکہ آج کے کئی بسیار نویس یا زود گو شاعر معیار کے لحاظ سے بھی سرِ فہرست ہیں۔

☆ موجودہ شعری منظر نامہ میں آپ کا مقام و مرتبہ اور مستقبل کی شعری بیاض میں آپ اپنے حوالے سے کس طرح کا حسنِ ظن رکھتے ہیں؟

☆☆ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں، میرے لیے یہی بہت ہے کہ میں اپنا کام کیے جاتا ہوں۔کل کس کو کیا مقام ملتا ہے میں نے یہ کبھی نہیں سوچا، بس جو کچھ لکھتا جاتا ہوں اسے کتابی صورت میں محفوظ کرتا جاتا ہوں اور بس۔

☆ تحقیق کے باب میں بھی صورت حال انتہائی دگرگوں ہے۔تحقیق تو دور کی بات زبان و بیان اور طرزِ تحریر قابلِ افسوس حد تک معیار سے عاری ہوا کرتا ہے۔آپ کی نسبت تحریر کردہ مقالات کے حوالے سے صورتِ حال کیا ہے؟

☆☆ تحقیق کے حوالے سے تو مجھ پر کافی کام ہو چکا ہے۔اب تک مختلف یونیورسٹیوں کے میری شعری اصناف اور نثر پر چھ ایم فل کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ عہدِ حاضر کے ممتاز محققین نے میری نعت، تنقید نگاری پر بہت مضامین لکھے ہیں۔

☆ اردو زبان و ادب بلخصوص پاکستان میں گروہ، دھڑوں اور گروپ بندی کے حوالے سے ہمیشہ تنقید کی زد میں رہے ہیں۔اس حوالے سے آپ کی پوزیشن اور ترجیحات کس نوعیت کی رہی ہیں؟

☆☆ میں نے کبھی کسی گروہ، دھڑے یا گروپ میں حصہ نہیں لیا اور ان تعصّبات میں پڑنا اپنے شعری اور تخلیقی منصب سے گر جانا ہوتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے کسی گروپ، دھڑے یا گروہ سے وابستہ نہ ہو کر اپنا نقصان بھی کیا ہے مگر کیا یہ اس سے بہتر نہیں کہ آپ اپنے ماتھے پر کوئی لیبل لگا کر اعلان کریں کہ آپ ایک محدود سوچ سے وابستہ ہیں؟ قلمکار یا شاعر تو مقامی، علاقائی، قومی، اور بین الاقوامی دائروں میں رہتا اور اپنا اظہار کرتا ہے

☆ آپ کا بیشتر وقت ملازمت کے باعث وطن سے باہر گزرا ہے۔ یقیناً مختلف ملک اور اقوام کے لوگ بھی رابطے میں رہے ہوں گے۔اپنے تجربات

ومشاہدات کی روشنی اور موجودہ عالمی منظرنامہ کی ہولناکی کو سامنے رکھتے ہوئے اردو زبان وادب کے مستقبل کی بابت آپ کی دوٹوک رائے ریکارڈ پر آنا وقت کا تقاضا بھی ہے اور ضرورت بھی؟

☆☆ جی میں ۴۵ مسلم ممالک کے علاوہ امریکہ، کناڈا، یونان، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور انگلستان کا دورہ بھی کئی بار کر چکا ہوں اور وہاں کے اردو حلقوں کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادیبوں سے بھی ملاقات کر چکا ہوں۔ میری دوٹوک رائے یہی ہے کہ وہاں کے وسیع تر ادبی تناظر میں اردو زبان اور اردو ادیبوں کی کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہیں۔ اردو کا شاعر ۳۰۰ کی تعداد میں کتاب شائع کرواتا ہے اور وہ بھی اس کے گھر میں پڑی رہتی یا مفت تقسیم ہوتی ہے۔ دوسروں زبانوں کی کتابیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی اور مصنف کو ساری عمر کے لیے غمِ روزگار سے آزاد کر دیتی ہے۔ بھلا ان سے ہمارا کیا تناسب اور کیا مقابلہ۔ بس وہی بات ہے کہ ہم تن من دھن سے اردو زبان وادب کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے مستقبل قریب یا بعید میں اس کا کوئی اچھا نتیجہ نکل آئے۔

مقدس کتاب

''وید'' ہندو دھرم کی سب سے مقدس کتاب ہے۔ وید چار ہیں۔ (۱) رگ وید (۲) سام وید (۳) یجو وید (۴) اتھر وید۔ اس وقت دنیا میں ویدوں کا سب سے بڑا عالم پنڈت راجندر پرشاد شرما ہیں۔ وید پرانیں بھارت میں اتھارٹی مانا جاتا ہے۔ پہلے وہ ادے پور یونیورسٹی کے سنسکرت کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھے، اب انٹرنیشنل یونیورسٹی آف سنسکرت جے پور کے وی سی ہیں۔

پنڈت صاحب بڑے سادہ مزاج کے آدمی ہیں، بہت کم کھاتے، بہت کم سوتے، مسلسل منتھن (مراقبہ) کرتے اور دھیان میں وقت گزارتے یا پڑھتے رہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ ان کے پاس مخمل کا ایک تھیلا ہوتا ہے، جس میں ایک کتاب لپٹی رہتی ہے، وہ اس کتاب کو بہت آدر (احترام) سے رکھتے ہیں، ہمیشہ اونچی سے اونچی جگہ اسے رکھتے، اس کو پڑھتے تو پڑھنے سے پہلے اسے چومتے اور سر جھکاتے ہیں۔

پنڈت صاحب کے ایک خاص شاگرد ''امیش کمار'' (نومسلم) کا کہنا ہے کہ میں نے ایک دن موقع پاکر ان سے معلوم کیا کہ پنڈت جی یہ کون سا گرنتھ ہے، جس کا آپ ویدوں سے بھی زیادہ آدر کرتے ہیں اور اتنے ادب سے اس کو پڑھتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ قرآن شریف ہے۔ میں نے کہا آپ بھارت کے اتنے مہان ہندو دھارمک گرو ہو کر قرآن شریف کیوں پڑھتے رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا بیٹا تم ستیہ کے سچے راہی ہو، اس لئے تم سے بالکل سچ کہتا ہوں، ویدوں نے بہت جگہ کہا ہے کہ قرآن شریف آجانے کے بعد اس انتم گرنتھ کو پڑھیں، یہ سناتن دھرم کا انتم اور پورنتم (آخری اور مکمل) گرنتھ ہے۔ یہ کہہ کر بہت ہی آستھا سے انہوں نے قرآن شریف سر پر رکھ لیا۔

میں نے گرو جی سے کہا کہ گرو جی! ہمارے دھرم گرو ہندوؤں کو کیوں نہیں بتاتے، پھر تو سارا ہندو مسلم جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا؟ وہ بولے میرے پیارے بیٹے اب دھرم کہاں رہا، دھرم کے چولے میں لوگ کاروبار کر رہے ہیں، یہ ختم ہو جائے گا، مگر صحیح وہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا، میں نے چاہا تھا کہ اس پر ایک کتاب لکھ دوں اور دیش میں ایک آواز لگاؤں، مگر مجھے بہت سے لوگوں کی طرف سے جو بڑے بڑے مٹھوں کی گدیوں پر براجمان ہیں، دھمکیاں ملنے لگیں، بس میں نے بھی ہمت ہار دی۔

میں نے پوچھا گرو جی آپ قرآن شریف تک کس طرح پہنچے؟ انہوں نے بتایا کہ میں ادے پور یونیورسٹی میں کلاس لے کر کچھ اسٹوڈنٹس کے ساتھ گھر آرہا تھا، راستہ میں ایک مسلمان کے گھر سے قرآن شریف کی آواز آرہی تھی۔ میرا دل اور میری انت آتما (روح) اس آواز کی طرف بہت کھنچی، میں نے اپنے ایک اسٹوڈنٹ سے کہا کہ دیکھو، گھر کے دروازے پر جا کر گھر والوں سے پوچھو کہ کون سا گاین گایا جا رہا ہے، اس نے جا کر گھنٹی بجائی، گھر سے ایک چودہ سال کا بچہ نکلا، اس سے معلوم کیا کہ تمہارے گھر میں کون سا گاین گایا جا رہا ہے، اس نے غصہ میں کہا گانا کیوں گایا جاتا؟ گانا بجانا تو ہمارے یہاں اسلام میں بڑا گناہ ہے، یہ تو قرآن شریف ٹیپ ریکارڈ میں ہے اور یہ حرم مکہ کے امام صاحب کی آواز میں ہے، اس نے آکر مجھے بتایا تو میں نے کہا کہ اگر یہ قرآن شریف ہے تو سچی ایشوریہ واڑی (یعنی آسمانی وحی) ہے، وہ بولے یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں؟

میں نے کہا کہ ویدوں کو سن کر اور پاٹھ کر کے جیسے دل سے گندگی اور پاپ کے بادل سے چھٹتے ہیں، اس سے سوگنا زیادہ صرف اِس کی آواز سے دل صاف ہوا جا رہا ہے، اس کے بعد میں نے قرآن شریف تلاوت کرنا شروع کیا اور بہت سے مسلمانوں سے قرآن شریف مانگا، ایک سال کے بعد جے پور جا کر مجھے قرآن شریف کا ہندی انواد (ترجمہ) مل سکا۔

(بحوالہ: ماہنامہ ارمغان یملت بھارت)

"خاموشی کی تقدیر"

(محترم نسیم سحر کے فن نایاب سے مستعار)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

دھیمی لَے میں مرے اندر سے کوئی بولتا ہے
جس طرح گہرے سمندر سے کوئی بولتا ہے

جونہی خاموش ہوں باہر کی بلند آوازیں
مست ہو کر مرے بھیتر سے کوئی بولتا ہے

ہم تو خاموشی کو تقدیر سمجھ بیٹھے ہیں
اب تو بستی میں مقدّر سے کوئی بولتا ہے

دوسرا شخص کوئی بھی نہ تھا ویرانے میں
میں تو سمجھا تھا، برابر سے کوئی بولتا ہے

کتنی موہوم ہوئی جاتی ہے آواز اُس کی !
ایک مٹتے ہوئے منظر سے کوئی بولتا ہے

اُس پہ آ جائے نہ سنّاٹے کی ذمّے داری !
بولتا ہے تو اِسی ڈر سے کوئی بولتا ہے

بھول کچھ ہوگئی دروازے کی تدفین کے وقت
اب بھی دیوار کے اندر سے کوئی بولتا ہے

دھیان رکھنا کہ یہ بستی کہیں تاراج نہ ہو !
یوں بھلا مست قلندر سے کوئی بولتا ہے؟

چھوڑ جاتا ہے سمندر میں بھی رنگ اپنے نسیمؔ
جب کبھی نیلگوں امبر سے کوئی بولتا ہے

○

نہیں خبر ہے کہ پھولوں میں رس بھرا ہوا ہے
سو پارساؤں سے شہرِ ہوس بھرا ہوا ہے

یہ لوگ چلتے ہوئے ہر قدم پہ رُکتے ہیں
دِلوں میں اِن کے عجب پیش و پس بھرا ہوا ہے

ضرور بات کریں گے کوئی وُہ میرے خلاف
بہت جو یاروں کے لہجے میں رس بھرا ہوا ہے

لگے ہے اتنا جو ہر گوشۂ چمن ویراں
سبب یہی ہے کہ کنجِ قفس بھرا ہوا ہے

ضروری ہو چکی تزئینِ گلستاں، کہ یہاں
روِش روِش میں بڑا خار و خس بھرا ہوا ہے

یہ انکشاف ہوا ہم پہ موسمِ گُل میں
صبا کے سینے میں کتنا اُمس بھرا ہوا ہے!

گلاس خالی ہے، پانی ذرا نہیں اُس میں
یہ کہہ رہے ہیں مرے ہم نفس، بھرا ہوا ہے!

ازالہ کون کرے، اب کسی کے بس میں نہیں
شکایتوں سے یہاں ہر نفس بھرا ہوا ہے

عدو کا پہلا ہدف ہے ہمارا مشکیزہ
یہ میٹھے پانی سے ہم نے عبث بھرا ہوا ہے

جو راس آ نہیں پاتی ہمیں یہ آب و ہَوا
ضرور اِس میں کوئی سوم رس بھرا ہوا ہے

کوئی دِلاسا نہیں چاہئے نسیمِ سحرؔ
جو رنج دِل میں بھرا ہے تو بس بھرا ہوا ہے!

○

خود پہ چلتے ہوئے آرے کی بھی پروا نہیں کی
عشق میں جاں کے خسارے کی بھی پروا نہیں کی

چل دیا اُٹھ کے، تو ممکن نہ تھا رُکنا میرا
مَیں نے پھر اُس کے اشارے کی بھی پروا نہیں کی

کوزہ گر اپنی ہی مرضی پہ مُصِر تھا، مَیں نے
چاک پر سُوکھتے گارے کی بھی پروا نہیں کی

ڈگمگایا نہیں مَیں عشق میں رانجھے کی طرح
مَیں نے تو تخت ہزارے کی بھی پروا نہیں کی

میری کُٹیا کے لئے ایک دِیا کافی تھا
روشنی دیتے ستارے کی بھی پروا نہیں کی

جانے والے کو تو جانا تھا، سو وُہ چل بھی دیا
اُس نے اپنے کسی پیارے کی بھی پروا نہیں کی

آسماں سے جو گرایا گیا پاتال میں مَیں
پھر کسی اور سہارے کی بھی پروا نہیں کی

فلسفہ جب سے توکّل کا سمجھ میں آیا
آدھے حصے کی تو کیا، سارے کی بھی پروا نہیں کی

اس قدر گُم تھا کسی قرب کی سرشاری میں
اس نے مجھ ہجر کے مارے کی بھی پروا نہیں کی!

اُڑتی تتلی کے تعاقب میں مگن بچّے نے
ہاتھ سے چھوٹے غبارے کی بھی پروا نہیں کی

مَیں سمندر سے تھا مرعوب کچھ اِتنا کہ نسیم
بانہیں پھیلائے کنارے کی بھی پروا نہیں کی

○

آشفتہ بیانی کے کمالات دکھاؤ
کھنڈرات میں مدفون عمارات دِکھاؤ

پہلے تو ہمیں شہر کے کھنڈرات دِکھاؤ
پھر اِس سے بھی آگے کے مضافات دِکھاؤ

لینا ہے بھلا شہر کی رونق سے مُجھے کیا!
مجھ کو تو کوئی دشت وخرابات دِکھاؤ

الفاظ کے معنی ہی بدل ڈالو لغت میں
جو دِن کا کرے ذکر، اُسے رات دِکھاؤ

جو چیز ہے نایاب، کہیں بھی نہیں ملتی
کاغذ پہ اُسی چیز کی بہتات دِکھاؤ

جو شخص یہ کہتا ہے، سب اچھا ہے یہاں پر
لے جا کے اُسے شہر کے حالات دِکھاؤ

ماضی سے جو منکر ہے، نہیں مانتا کچھ بھی
اِک روز اُسے اُس کے بیانات دِکھاؤ

رہتے ہوں جہاں لوگ بڑے چین وسکوں سے
نقشے پہ مجھے ایسے مقامات دِکھاؤ

الفاظ کی جادوگری آتی ہے تمہیں تو
تم اپنے مظالم کو عنایات دِکھاؤ

محدود ہے جس جس کی بصیرت، اُسے اِک دن
قرآن سے باہر کی بھی آیات دِکھاؤ

پیغام مِلا ہے یہ ستمگر کی طرف سے
آؤ، ہمیں زنبیلِ شکایات دِکھاؤ

○

کتنا اس دل نے کر دیا پاگل!
اُس کے اِک تل نے کر دیا پاگل

اِک نظر اُس کی میری سمت اُٹھی
چشمِ قاتل نے کر دیا پاگل

اُس کی باتیں عجیب باتیں تھیں
مردِ کامل نے کر دیا پاگل

میری تنہائی ہو گئی غارت
رنگِ محفل نے کر دیا پاگل

ایک گوٹا لگا دوپٹہ تھا
جس کی جھلمل نے کر دیا پاگل

دیر تک کیسے اُس کو دیکھیں ہم
اِسی مشکل نے کر دیا پاگل

حالِ دل اُس سے کہہ نہ پایا مَیں
دلِ بُزدِل نے کر دیا پاگل

آئنے میں جو میرے سامنے تھا
اُس مقابل نے کر دیا پاگل

راستے اُس کے نوحے لکھتے ہیں
جس کو منزل نے کر دیا پاگل

کتنی مشکل میں تھی وہ ناؤ نسیم!
جسے ساحل نے کر دیا پاگل

○

آیا تھا پیش کیا تمہیں ایسا ہی ایک واقعہ؟
یا پھر سُنا رہے ہو تُم، میرا ہی ایک واقعہ !

واقعے اور بھی کئی ہوں گے مگر تمام عمر
دیکھا ہی ایک واقعہ، سوچا ہی ایک واقعہ

اَوروں کے کیا معاملات، اس سے غرض نہیں ہمیں
کافی ہے اپنے واسطے ، اپنا ہی ایک واقعہ

زندگی بھر کا ہے نچوڑ، ایک لکیر پر سفر
راستی ایک حادثہ ، گمراہی ایک واقعہ

ہوتی تو ہے یہ داستاں ٹکڑوں میں بٹ کے ہی بیاں
زیست سے مرگ تک مگر، سارا ہی ایک واقعہ

عشق تھا یا جنوں کوئی، جس میں فنا ہوئے تھے ہم؟
کاش کہ پیش آئے پھر، ویسا ہی ایک واقعہ

ناک کی سیدھ میں چلوں، کوشش رہی یہی مری
پھر مجھے پیش آ گیا، اُلٹا ہی ایک واقعہ

رات کو روئے ہم بہت، رات کو سوئے کم بہت
ذہن میں زندہ ہو گیا، اپنا ہی ایک واقعہ

آئے یقیں کسی کو یا جھوٹ ہی جانا جائے یہ
میں نے سدا بیاں کیا، سچّا ہی ایک واقعہ

دریا تو اک سراب ہے، ایک سہانا خواب ہے
ورنہ ہے کائنات میں صحرا ہی ایک واقعہ

○

دھیمی لَے میں مرے اندر سے کوئی بولتا ہے
جس طرح گہرے سمندر سے کوئی بولتا ہے

جونہی خاموش ہوں باہر کی بلند آوازیں
مست ہو کر مرے بھیتر سے کوئی بولتا ہے

ہم تو خاموشی کو تقدیر سمجھ بیٹھے ہیں
اب تو بستی میں مقدّر سے کوئی بولتا ہے

دوسرا شخص کوئی بھی نہ تھا ویرانے میں
میں تو سمجھا تھا، برابر سے کوئی بولتا ہے

کتنی موہوم ہوئی جاتی ہے آواز اُس کی !
ایک مٹتے ہوئے منظر سے کوئی بولتا ہے

اُس پہ آ جائے نہ سنّاٹے کی ذمّے داری !
بولتا ہے تو اِسی ڈر سے کوئی بولتا ہے

بھول کچھ ہوگئی دروازے کی تدفین کے وقت
اب بھی دیوار کے اندر سے کوئی بولتا ہے

دھیان رکھنا کہ یہ بستی کہیں تاراج نہ ہو !
یوں بھلا مست قلندر سے کوئی بولتا ہے؟

چھوڑ جاتا ہے سمندر میں بھی رنگ اپنے نسیمؔ
جب کبھی نیلگوں امبر سے کوئی بولتا ہے

○

فکر اور غم سے تہی، مست الست !
زندگی اپنی رہی مست الست

روز ترغیب نئی ملتی ہے !
مَیں مگر اب بھی وہی مست الست

ایک نشّے میں مجھے رکھتا ہے
فقر کا تاجِ شہی مست الست

اُسے پا کر بھی طبیعت اپنی
پہلے جیسی ہی رہی مست الست

کب مجھے بھی کوئی پروا اِس کی؟
یہ زمانہ بھی سہی مست الست

دردچیخا کِیا اندر ہی کہیں
آنکھ چُپ چاپ رہی مست الست

بے نیازانہ روِش ہے اپنی
دُور اَز اَمر و نہی، مست الست

دیکھتی رہتی ہے منظر کیا کیا
عشق کی خوش نِگہی مست الست

مَیں نے اِک کیف کے عالم میں نسیمؔ
یہ غزل کیسی کہی مست الست !

○

جینے کا اہتمام کرو، چھوڑو عشق وشق
اب کوئی کام وام کرو، چھوڑو عشق وشق

اِس شغل میں تو کچھ نہیں رُسوائی کے سِوا
کچھ اپنا احترام کرو، چھوڑو عشق وشق

حاصل ہی کیا ہے عشق کے شوقِ فضول میں!
اس شوق کو سلام کرو، چھوڑو عشق وشق

ایسا کرو کہ شہر کی رونق میں گم رہو
صحرا میں مت قیام کرو، چھوڑو عشق وشق

کہتے رہو بس اب تو یہی: 'عشق، مردہ باد!'
یہ وِرد صبح و شام کرو، چھوڑو عشق وشق

اس مشورے کا شکریہ، لیکن نہیں قبول!
مجھ سے یہ مت کلام کرو، چھوڑو عشق وشق

اِس شوق میں تو ہونا بھی پڑتا ہے سنگسار
اِس شوق کو سلام کرو، چھوڑو عشق وشق

یہ عُمر، اور حسینوں سے چاہت کا یہ جنوں؟
توبہ کا اہتمام کرو، چھوڑو عشق وشق!

اِس میں نشہ شراب سے بھی کچھ زیادہ ہے
خود پر یہ شے حرام کرو، چھوڑو عشق وشق

اِس عشق نے نہال تمہیں کس قدر کیا
قصّہ یہ اب تمام کرو، چھوڑو عشق وشق

جتنی پرانی قدریں ہیں، وہ سب سمیٹ دو
نافذ نیا نظام کرو، چھوڑو عشق وشق

کیا اَور کوئی کام نہیں ہے تمہیں نسیم؟
اب کوئی اور کام کرو، چھوڑو عشق وشق

پایا ہے اِقتدائے جنوں میں نسیم کیا؟
اب عقل کو امام کرو، چھوڑو عشق وشق

دانش کے فقدان پہ خاک
شاہ کے ہر فرمان پہ خاک

سچّے لوگ ہیں، ڈالیں گے
ہر جھوٹے اعلان پہ خاک

جس میں اندھیرا رہتا ہو
ایسے روشن دان پہ خاک

دفن ہوئیں یادیں جس میں
گھر کے اُس سامان پہ خاک

اِمکانات شہید ہوئے
عہدِ بے اِمکان پہ خاک

خوشبو کو یوں ٹھکرانا؟
ٹوٹے ہوئے گلدان پہ خاک!

جس میں خاک ہی رقصاں ہو
اُس گھر کے دالان پہ خاک

چہرہ مسخ ہوُا اپنا!
اب اپنی پہچان پہ خاک

آج بکھیری ہے خود ہی
ہر عہد و پیمان پہ خاک

گھر پر جو ڈاکہ ڈالے
گھر کے اس دربان پہ خاک

جھونپڑیوں کو میرا سلام
قصرِ عالی شان پہ خاک

دِل کا افسانہ بے کار
اور اس کے عنوان پہ خاک

شعروں کی کیا قدر نسیم؟
ڈال اپنے دیوان پہ خاک

نسیمِ ازحجاز

شوکت واسطی

(●)

نسیم حجاز سے آتا ہے تو بے ساختہ اس دلنواز سحر کی یاد دلا جاتا ہے جو ساٹھ ستر سال پہلے پوٹھوہار کی ادبی شفق زار پر ہویدا ہوئی تھی جس کی تازگی نے آج اس نواح کو گل وگلزار بنا رکھا ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب اس خطہ پر ہر لحاظ سے غالب کا یہ کہا صادق آتا تھا:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!

بات ادب کے حوالے سے ہو رہی ہے بلکہ علم وادب کے حوالے سے بھی کہہ لو۔ عجب کساد بازاری تھی۔ اردو کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ بلا جواز اسے سیاست کے خارزار میں گھسیٹا جا رہا تھا۔ ہندی سمیلن ٹھاٹھ اور ٹھسے کے ساتھ ملک بھر میں رچائے جا رہے تھے۔ اس زبان کے نام لیواؤں کی گرہ میں دام نہ تھے کہ اس قومی (لنگوا فرینکا) کی چھوٹی موٹی تقریب بھی کوئی کر پاتا۔ ایسے میں ادب کا نام لے کر استاد عبدالعزیز فطرت نے راولپنڈی میں اس زبان کی ٹمٹماتی لَو کو اپنے دامن کی اوٹ میں لیا۔۔۔ اور یہ خطہ اس کی روشنی میں نہانے لگا۔ ادب اور اردو نے فروغ پایا اور آج جو پوٹھوہار ''چہچہاتے عندلیبوں کا آشیانہ'' بنا ہوا ہے تو وہ اسی ماضی کی میراث ہے۔

عبدالعزیز فطرت نے اپنے عزیز ایوب محسن کو اپنی تحریک کا اثاثہ سونپا اور اب تو گلی گلی، کوچہ کوچہ۔۔۔ دیکھو تو سہی تا حدِ نظر اس لو سے دیپک جلتے ہیں۔۔۔ نسیمِ سحر اسی ادب ساز اردو نواز گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ راولپنڈی کے اس قابلِ قدر خانوادے میں نام ونمود کا جذبہ قطعاً نہیں تھا اسی لیے کوئی ایسا مستند مشہور تذکرہ تبصرہ ان خدمات کا معرضِ تحریر میں موجود نہیں ہے جو اردو اور ادب کے متعلق اتنے بسیط عرصہ تک اس نے سرانجام دیں۔ خیال کیجیے کہ فطرت مرحوم نے اپنی حینِ حیات اپنے کلام کے مجموعہ کی اشاعت تک کو درخورِ اعتنا نہ جانا۔ ایوب محسن نے اس سہو کا کفارہ کیا ورنہ تو وہ گنجینہ یقیناً دستبردِ زمانہ ہو جاتا۔ لیکن خود ایوب محسن نے اپنی تخلیقات کو محفوظ کرنے کی طرف سے حد درجہ اغماض برتا ہے۔ وہ پائے کا عروضی ہے تحقیقی تدفین کا بندہ، بڑے قابلِ قدر مقالے اس نے سپردِ قلم کیے ہیں جو اب کاغذوں کا پلندہ بنے یہاں وہاں پڑے ہیں۔ میری شبانہ روز کی منت زاری اس پر بے اثر ہے، مہیا ہو جائیں تو بزمِ علم وفن پاکستان انہیں ضبطِ اشاعت میں لا کر موجودہ نسل کے لیے مفید اور کارآمد بنا دے۔۔۔ ادب اردو میں ایک گراں مایہ اضافہ ہو جائے۔

پدر نہ کند پسر تمام کند کا سا مضمون کہہ لیجیے کہ نسیمِ سحر اس معاملے میں بہت احتیاط کا حامل ہے۔ وہ جب حجاز سے آتا ہے سرمایۂ نظم ونثر کا ایک کارنامہ ساتھ لاتا ہے۔ پھر اس کی طباعت کا اہتمام کر جاتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ ''یہ جو سلسلے ہیں کلام کے'' اسی سلسلے کی پانچویں کڑی ہے جس پر ''محسنین'' (ایوب واحسان) نے خوبصورت حاشیے چڑھائے ہیں، بجا تقاریظ لکھی ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

مجھے نسیمِ سحر پر بات کرنا ہے۔۔۔ یہ تو بتا دیا کہ وہ ایسے گھرانے کا فرزند ہے ادب کی خدمت اور اردو کا فروغ جس کی گھٹی میں پڑے ہیں، یہی نہیں اس کے بزرگوں نے جس خلوص اور مروت سے ادیبوں اور اردو دانوں کے دامے درمے سخنے خدمت اور تواضع کی ہے وہ اس روایت کو جدہ میں بڑی پاسداری سے نبھا رہا ہے۔ حرمین کی زیارت کے لیے جو اہلِ قلم اس ملک سے ادھر جاتا ہے جدہ میں وہ اگر اس کے ہاں چند روز فروکش نہ ہو تو بھی یہ موصوف کی مہمانداری مکمل پیرائے میں سرانجام دینے کا پابند بن جاتا ہے۔ عصرانہ ہوگا، بلکہ ظہرانہ اور عشائیہ مشاعرے کی بسطا جمے گی، حد درجہ پذیرائی اس صاحب مذکور کی بڑی دوڑ دھوپ کے ساتھ وہ کرے گا۔۔۔ ایسا لگنے لگے گا کہ کوئی ''حکامِ ادب'' نزول فرما رہے ہیں اور ''خدامِ ادب'' کا پرۂ آداب بجا لا رہا ہے۔۔۔ وہی وضع داری اور پاسداری کی روایت فطرت صاحب اور ایوب محسن کی نظر میں پھرنے لگتی ہے، خیال میں عود کر آتی ہے۔

میں پاکستان کے اہل قلم کو ''وقر وفقر'' کے دو درجوں میں ڈالا کرتا ہوں۔ یعنی وہ جو کسی طور مرتبہ کے حامل ہیں اور اس ناطے اگر انہیں شغفِ ادب بھی ہے تو بڑے طنطنے اور طمطراق سے اپنی ادبی حیثیت تسلیم کرانے کے درپے رہتے ہیں اور اصرار کے ساتھ ان بے چارے حقیقی ادیبوں سے یہ خدمت لیتے ہیں جو معاشرے کی بے مہری کے ستائے ہوئے ہیں۔ یعنی دنیاوی وقار سے محروم فقر بلکہ فقیری کے دام میں آئے ہوئے ہیں۔۔۔ مگر جدہ میں جو پہنچ گیا وہ ''بے دام'' تو کسی صورت نہیں رہتا۔ ماشاء اللہ مرفہ الحال ہو جاتا ہے سو یہاں سے سدھارے وہاں پدھارے ہم وطن شاعروں ادیبوں پر تواضع کے پھول بے دریغ نچھاور کیے جاتے ہیں ایسے کہ وہاں کے مقیم پاکستانی فن کار خود خدام ادب بن جاتے ہیں اور یہ مہمانانِ گرامی سچ مچ حکامِ ادب نظر آنے لگتے ہیں یا کم از کم اپنے آپ کو ایسا محسوس فرمانے لگتے ہیں۔

نسیمِ سحر میں یہ وصف آؤ بھگت کا وہاں کے دیگر پاکستانی ذوق شوق کے حامل حضرات سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ اعزاز میں ادبی شعری محافل مجالس برپا کرے گا، پھر عرق ریزی کے ساتھ حرف حرف کوائف کو ضبطِ تحریر میں لائے گا، جدہ کے مقامی جریدوں، رسالوں میں تو چھپوائے گا، وطن کے جملہ اخبارات میں اشاعت کے لیے بھجوائے گا بلکہ دنیا بھر کے شماروں پرچوں کو اس فرض سے ارسال

کرے گا یعنی ہر ایک کا نام نکالنے کی مساعی سر توڑ کرے گا۔ اہتمام ان کی ناموری کا بے مثال اس طریقے سے ان تھک ہوگا۔ جدہ میں اس کی کاوش سے منعقدہ کئی تقریبوں کی بعض روداریں میں نے انگلستان میں بریڈفورڈ سے چھپنے والے ہفت روزہ ''راوی'' میں پڑھیں مقصود الٰہی شیخ بڑی سج دھج سے نکالتے ہیں۔ جنگ لندن میں بھی ایسی مفصل روداد یں پڑھیں اگر نہیں تو بسا اوقات نظر سے گزریں۔ کینیڈا، سویڈن، ناروے اور بھارت میں کوئی مائی کا لال فی زمانہ ایسے دل گردے کا ہے؟ پھر سوچئے نسیم سحر کو ذاتی طور پر اس تمام تگ و دو سے کیا وصول؟ وہ ارتجالاً بھی اپنی نگارشات جس رسالے کو جہاں کہیں بھیجتا ہے، التزاماً اس میں جگہ پالیتی ہیں، اب یہ لکھنا، تخلیق سے الگ۔۔۔ اس کے تئیں محض لغو و حشو نہیں کیونکہ وہ ان رپورتاژوں کے ذریعے جدہ میں بیٹھا اردو کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچائے، پھیلائے چلا جاتا ہے اور اس طرح اس کے ذریعے نہ صرف بہت بڑی قومی خدمت سرانجام دے رہا ہے بلکہ کتنے ہی اہلِ علم و قلم کو معروف اور مشہور بنائے جاتا ہے۔

میں دو مرتبہ جدہ گیا۔ نسیم سحر نے بڑے اچھے اچھے لوگ ملوائے۔ سجاد بابر اور شجاعت راہی تو خیر اپنے تعلیمی مراحل میں مجھ سے مستفید ہوئے تھے وہاں ملے تو دیکھ راحت ہوئی لیکن ان محفلوں میں جنہیں سنا، ہندوستان اور پاکستان کے متعدد سخن سنج اور سخن ور تھے۔ قیوم طاہر تو واپس آ کر راولپنڈی ہی میں اب گاہ گاہ مل لیتے ہیں مگر جدہ کی ان سہانی صحبتوں کے پس منظر کے ساتھ۔۔۔ تسلیم زلفی کینیڈا جا بسے ہیں۔ کلام ان کا ''افکار'' کراچی میں دیکھتا ہوں تو وہی نسیم سحر کا ادبی ماحول خوشگواری کے ساتھ یاد آنے لگتا ہے، لبھانے لگتا ہے۔۔۔ جہاں جایئے سننے سنانے کہنے کہلانے والے ایک سے ایک ملتے ہیں، لیکن عجیب سی بات ہے جنہیں نسیم سحر ملاتے ہیں وہ بھولے بھلائے نہیں جاتے ہیں۔۔۔ چاہت اپنائیت کا کیا سبھاؤ ہے۔۔۔ اور جو نسیم سحر سے مل کر لوٹتے ہیں اس کی محبت کرنے والی بلکہ بچھ بچھ جانے والی ذات کو آسانی سے فراموش نہیں کر پاتے ہیں۔۔۔ شخصیت طبیعت کا کیسا رچاؤ ہے۔۔۔ بے شک کہئے آج کل کی نفسا نفسی میں کہاں ایسا بے لاگ لگاؤ ہے۔

نسیم سحر نے ہرگز نہیں کہا تھا اور شاید چاہا بھی نہ ہوگا مگر میرے قاری چاہے پڑھ اب اسے کہ نہ پڑھ۔۔۔ ہم تو لکھ چکے!

بقیہ : محورِ دو جہاں

اُنؐ کے نعلین جو رکھے سر پر
ہو گئی ہے مجھے دستار نصیب

غزل گوئی کے دور میں دلوں پر چھایا رہنے والا ''سایۂ عشق بتاں'' اب نسیم سحر کو نہیں لبھاتا۔ فرماتے ہیں:

یہاں تو ذکرِ رسولِ کریم ہے اور بس
مری بیاض میں ذکرِ بتاں نہیں ملتا

اور اب آخر میں سلام کے دو چار شعر بھی ملاحظہ ہوں:

بیان کرتی رہے چشمِ نم حسینؑ کا غم
ہمارے دل میں کہیں ہو نہ کم حسینؑ کا غم
غمِ حسین میں یاد اپنے غم نہیں آتے
ہے غم گسار مرا دم بہ دم حسینؑ کا غم
چمک اٹھے ہیں ستارے کئی سرِ قرطاس
کیا ہے اس میں جو میں نے رقم حسینؑ کا غم
مرا اثاثہ ہے عشقِ نبیؐ نسیم سحر
اور اس کے ساتھ مجھے محترم حسینؑ کا غم

یہ اثاثہ، یہ تمام سرشاری اور یہ متاعِ غم اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ''محورِ دو جہاں'' بھی قارئینِ ادب کے حلقے میں ویسی ہی پذیرائی حاصل کرے گا جیسی اس سے قبل جناب نسیم سحر کے دیگر نتائجِ قلم کو حاصل ہے۔

- بقیہ -

''عنوان بدل ڈالے''

عنوان بدل ڈالے''۔

قیوم طاہر پر مزید گل افشانی ملاحظہ ہو:

''دراصل قیوم طاہر کو بڑا شاعر ہونے کا احساس دلانے میں کچھ کردار اس کی طویل القامتی نے بھی ادا کیا ہے، وہ اتنا لمبا ہے کہ ریڈی میڈ پتلون پہن لے تو لگتا ہے کہ اس نے نیکر پہن رکھی ہے''۔

جناب نسیم سحر کی تیار کردہ خاکوں اور انشائیوں کی اس دیگ میں سے چاول کے چند دانے بطور نمونہ جو میں نے پیش کر دیئے ہیں اس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ پکوان کتنا لذیذ اور مزیدار ہے۔ یہاں ان کی کتاب کے عنوان ''خاکہ گردی'' کی داد بھی ضرور دینا چاہوں گا جس کی معنویت کا اندازہ خوش ذوق قارئین موجودہ دہشت گردی کے تناظر میں خود بھی کر سکتے ہیں۔

○

حرف حرف روشنی

محسن احسان

(●)

عزیزم نسیم سحر ایک طویل عرصہ سے سعودی عرب میں مقیم ہیں ملک کے نامور اور مقتدر شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کئی مجموعے شائع کر چکے ہیں اور اہلِ قلم حضرات سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ وہ تازگی فکر اور شگفتگیٔ خیال کے ساتھ ساتھ جذبہ و احساس کو نہایت دلآویزی سے شعر کے پیکر میں گوندھتے ہیں اور یوں ان کا شعر قلب کی گہرائیوں میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ اب وہ بارگاہِ رسالتؐ میں اپنا تازہ مجموعہ نعت لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ جدہ کے طویل قیام نے انہیں بارہا شرفِ حضوری سے نوازا ہے اور ہر مرتبہ انہیں ایک نئی کیفیت اور نئے سرور سے شناسا کیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ نعت واقعی کیفیت اور عقیدت کی آئینہ دار ہوتی ہے مگر عہدِ حاضر کے شعراء نے اپنی سعیِ جمیلہ سے اس کو تغزل کے انداز میں پیش کر کے باقاعدہ ادب کی صنف میں داخل کر دیا ہے۔ سیرت مطہرہ کو اس خوش اسلوبی اور جذبے کے نکھار سے سنوار کر شعراء نے نعت گوئی کے نازک اور دشوار مراحل کو ایک نیا روپ دے دیا ہے۔

''یہ جو سلسلے ہیں کلام کے'' میں نسیم سحر نے نعت کا خمیر ختمی مرتبت سرورِ کائناتؐ کی اسی محبت سے اٹھایا ہے جو دلوں میں گداز، ذہنوں میں روشنی اور جذبوں میں سچائی بھر دیتی ہے۔ اسی عقیدت و محبت سے نسیم سحر کہتے ہیں:

یہ جو سلسلے ہیں کلام کے یہ سخن درود وسلام کے
جو نسیم ہوں مرے ترجماں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے

یہ اس نگاہِ عنایت کا معجزہ ہے کہ میں
مدینے جانے لگا باریاب ہونے لگا

نہ مال و دولتِ دنیا نہ جاہ مانگتا ہے
قبول ہو جو حرم میں وہ آہ مانگتا ہے
گناہ بھی ہیں نسیم سحر کے لاتعداد
کرم بھی آپ کا وہ بے پناہ مانگتا ہے

پھر دیکھ حرف حرف سے پھوٹے گی روشنی
مدحِ نبی کا سلسلہ نوک قلم میں رکھ

پیروی رسول ہی کو نسیم
زندگی کا اصول جانا ہے

نسیم سحر نے اپنی اس بیاضِ محمدیہ کی ترتیب میں ماہیا اور ہائیکو کے انداز میں بھی دلنواز تجربے کیے ہیں جو بالکل نئے اور اچھوتے ہیں ہائیکو دیکھئے:

یوں روح میں اتری ہے ترے نام کی خوشبو
جیسے کسی جنگل میں مہکتی چلی جائے
برسات کی ایک بھیگی ہوئی شام کی خوشبو

ماہیا:

کیا شان مدینے کی
ہے تاھنگ میرے دل میں
ہر آن مدینے کی

نسیم سحر نے مدحِ شہ کونین کا یہ پُر کیف سلسلہ اب استوار کر لیا ہے۔ نعت گوئی کے لیے عشق کی جس سرشاری اور شریعت کی جس ہوشمندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان سے باخبر ہیں۔ ان کے قلب و روح کو ایک خوش تاب رعنائی اور ادراک کو سچی برنائی کی دولت ملی ہے۔ میرا یہ اخلاص و محبت کا اظہار صنفِ نعت میں ان کے حسنِ کاوش کا اعتراف بھی ہے اور ہدیہ تبریک بھی۔۔۔

Simple solution

Grand Children Two old ladies Dolly and Ruby were talking about their grandchildren. Dolly said "Each year I send each of my grandchildren a card with a generous chequue inside. I never hear from them... never receive a thank you message".Ruby replies " I too send my grandchildren a very generous cheque I hear from them within a week after they receive it. In fact, they each pay me a personal visit""Wow! How come?" remarked Dolly."Very Simple solution.... I don't sign the cheque.

''محورِ دو جہاں''

ڈاکٹر خورشید رضوی
(لاہور)

جناب نسیمِ سحر سے تعارف تو پہلے سے تھا مگر پہلی بار باقاعدہ ملاقات کی صورت ۱۹۹۸ء میں پیدا ہوئی جب مجھے عمرے کے لیے حرمین میں حاضری کی سعادتِ اوّلین نصیب ہوئی۔ نسیمِ سحر ان دنوں اسلامی ترقیاتی بینک، جدہ سے منسلک تھے اور طویل عرصے سے وہیں مقیم تھے۔ میرا قیام جدہ میں اپنے بیٹے عامر کے ہاں تھا کہ انھوں نے ہمارے ہاں قدم رنجہ فرمایا۔ آدھ پون گھنٹے کی اس نشست میں ان کی بے ساختگی اور خلوص نے بہت متاثر کیا۔ پھر عامر کی وہاں اقامت کے وسیلے سے ہر سال حاضری کا موقع ملنے لگا اور ہر سال جناب نسیمِ سحر سے ملاقات بھی معمول بن گئی۔ جدہ کی ادبی محفلیں اس زمانے میں بڑی بھرپور تھیں جن میں وہ بہت فعال نظر آئے۔ علم و ادب سے ایک فکری لگاؤ انھوں نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں پایا ہے اور پھر ریاضت بھی خوب کی ہے۔

نسیمِ سحر کے قلم نے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں۔ تنقید، تبصرہ، افسانہ، کالم، مزاح ہر رنگ میں انھوں نے اپنے اندر کی بہار کا اثبات کیا ہے۔ خاکوں کے مجموعے ''خاکہ گردی'' اور مضامین اور تبصروں پر مشتمل ''رشحاتِ نسیمِ سحر'' نے ان کی سادہ و پرکار نثر کا لوہا منوالیا ہے تاہم ان کی طبیعت کا اساسی میلان شعر کی طرف رہا ہے۔ سولہ شعری مجموعے اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں نظم، غزل اور ہائیکو کی گونا گونی ان کی وسعتِ ذوق کی آئینہ دار ہے مگر کہنہ مشق اور قادر الکلام ہوتے ہوئے بھی ان کے ہاں کسی قسم کا زعم نہیں پایا جاتا۔ عجز و انکسار گویا گھٹی میں پڑا ہے چنانچہ انھوں نے خود کو سیکھنے کے عمل سے کبھی بالاتر خیال نہیں کیا۔

ایک گہری مذہبیت نسیمِ سحر کے مزاج میں ہمیشہ سے رچی ہوئی تھی مگر اس میں شدت پسندی کبھی نہ تھی۔

کسی سے دشمنی کرتا نہیں میں
مجھے اک صلح جُو مذہب ملا ہے

ارضِ مقدس میں طویل قیام اور پیہم حاضریوں کے شرف سے اس صحت مند مذہبیت نے اَور چلا پائی اور رفتہ رفتہ ان کی توجہ دیگر اصنافِ سخن سے بڑھ کر عقیدت نگاری پر مرکوز ہوگئی۔ حمدیہ و نعتیہ مجموعہ ''یہ جو سلسلے ہیں کلام کے'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ نعت نگینے ۲۰۱۴ء میں سامنے آیا۔ جون ۲۰۲۰ء میں ''مطالعاتِ حمد و نعت'' کے عنوان سے ان کے تنقیدی مضامین منظرِ عام پر آئے اور اب زیرِ نظر مجموعہ ''محورِ دو جہاں'' آپ کے ہاتھ میں ہے۔

یہ مجموعہ اس اعتبار سے بہت متنوّع ہے کہ عقیدت نگاری کی مختلف جہات، حمد، نعت، سلام، منقبت، کا احاطہ کرتا ہے اور مذہبی موضوعات پر بعض عمومی نظمیں بھی اس کا حصہ ہیں۔ کچھ نعتیں پنجابی زبان میں بھی ہیں۔ اور رباعی، قطعہ اور ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ عقیدے کی اصالت اور جذبے کا وفور ان کا وشوں کا بنیادی وصف ہے اور طویل ریاضت سے حاصل ہونے والا فنی ملکہ ان کی بُنت میں صرف ہوا ہے۔ جو انھیں عقیدتِ محض سے آگے بڑھا کر فن پارہ بھی بناتا ہے۔ حمد کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ تو رہتا ہے رگِ جاں سے قریب
کون ہے اس قدر انساں سے قریب
کیوں دعائیں نہ کرے میری قبول
وہ کہ ہے دیدۂ گریاں سے قریب

اس نے ہم کو عطا کیے شب و روز
نئے شام و سحر، نئے شب و روز
کُن کہا اور کائنات بنی
کُن کہا اور بن گئے شب و روز
تیرگی سے وہی نکالتا ہے
روشنی سے سجے ہوئے شب و روز

اس کی عظمت کے اعتراف میں ہوں
گھر میں بھی حالتِ طواف میں ہوں
کوئی باہر سے اب صدائیں نہ دے
قریۂ عین شین قاف میں ہوں

نسیمِ سحر کی نعتوں میں ان کے سلیقہ و فن کے ساتھ ساتھ ان کا جذبۂ والہانہ ہمیں متاثر کرتا ہے۔ مدینہ میں پے بہ پے حاضریوں کی سرشاری ان کے کلام کے پس منظر میں جھلکتی ہے۔ اسی شہرِ خنک کی یاد اور اب وہاں سے دور چلے آنے کا تاسّف جہاں جہاں اُبھرتا ہے دامنِ دل کھینچتا ہے:

میں رہا برسوں مقیم اس نور بستی میں نسیمؔ
اس میں گزرا ہر مہینہ تابدار و تابناک

وہاں سے پلٹ تو میں آیا ہوں لیکن
نہیں بھولتے ماہ و سالِ مدینہ

کچھ اور نعتیہ اشعار دیکھیے:

کاش ہوں یوں مرے بیدار نصیب
شہرِ طیبہ کے ہوں انوار نصیب
شہرِ طیبہ جونہی نزدیک ہوا
پاؤں کو ہو گئی رفتار نصیب

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ کیجیے

''عنوان بدل ڈالے''

جمیل یوسف
(لاہور)

میرے سامنے جناب نسیم سحر کے خاکوں کا مجموعہ ''خاکہ گردی'' مسودے کی صورت میں رکھا ہے جس کا کافی سے زیادہ حصّہ میرے مطالعے میں آ چکا ہے۔

مَیں تو انہیں صفِ اوّل کا ایک ممتاز شاعر ہی سمجھے بیٹھا تھا، مگر اب اُن کے خاکے پڑھ کر پتہ چلا کہ وہ تو نثر نگاری میں بھی اپنا ایک اسلوبِ خاص رکھتے ہیں، ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی ان کی نثر کو نہایت دلچسپ اور دل پذیر بنا دیتی ہے۔

مَیں نے اُن کی خاکوں پر مشتمل زیرِ نظر کتاب ''خاکہ گردی'' کے مسودے کو اُٹھا کر یوں ہی سرسری طور پر دیکھا تھا کہ چند ہی لمحوں کے بعد اپنے آپ کو اس کے مطالعے میں گم پایا۔ میرے نزدیک کسی کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اگر آپ اُسے پڑھنا شروع کر دیں تو پڑھتے ہی چلے جائیں۔ اِس سے پہلے کہ مجھے پتہ چلتا، مَیں نسیم سحر کی کتاب کے ایک سو سے زیادہ صفحات پڑھ چکا تھا، اور ابھی کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

نسیم سحر صاحب کے جوہر اُس وقت کھُلتے ہیں اور ان کا قلم اپنی روانی اور جولانی اس موقع پر دِکھاتا ہے جب جب اُن کے موضوع یا ''ممدوح'' میں کوئی اونچ نیچ یا ناہمواری موجود ہو، وہ اِس اونچ نیچ اور ناہمواری سے اس خوبی اور خوبصورتی سے نمٹتے ہیں کہ لطف آ جاتا ہے۔ محمد گلِ نازک کی کتاب پر ''کلامِ نرم و نازک'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اب شاعر کا نام بھی گلِ نازک ہو، کلام بھی بولتی آنکھوں کے بارے میں ہو، تو اُسے پیار اور محبت کی آنکھ سے ہی دیکھنا چاہئے۔ اسے تنقید کی چھری سے ذبح نہیں کرنا چاہئے، ویسے بھی ابھی قربانی کی عید میں تیرہ چودہ دن باقی ہیں۔۔۔ ایسے ٹوٹے ہوئے دل والے شخص کی شاعری پڑھ کر اس کی شکستہ دلی کا احساس کرنا چاہئے، اور چونکہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، اس لئے اب انہیں عمر کے اس مرحلے میں تعلیمِ بالغاں یا ادارۂ اصلاحِ اشعار کی طرز کے کسی مدرسے میں داخل ہونے کا مشورہ نہیں دینا چاہئے، اور نہ کسی اور شاعر سے اصلاح لینے کا بھی، کیونکہ ہوسکتا ہے یہ جس شاعر سے اصلاح لینا چاہیں وہ خود ہی کلی طور پر خارج از بحر ہو! ویسے بھی اب تک اگر انہوں نے اصلاح نہیں لی تو اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ انہیں اپنے سے بڑا کوئی شاعر ملا ہی نہیں، اور چھوٹے شاعر سے اصلاح لینا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔''

مجھے یاد ہے کہ جناب محمد گلِ نازک نے، جو بڑی من موہنی شخصیت کے مالک ہیں، مجھے بھی اپنی شاعری کا مجموعہ ''بولتی آنکھیں'' عطا کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس پر لکھیں۔ مجھے تو ان کے مجموعۂ کلام پر لکھنے کی ہمّت نہ ہوئی، مگر مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جناب نسیم سحر نے ہنستے کھیلتے ان کی کتاب پر ایسا رواں دواں تبصرہ کیا ہے کہ قاری تو رہا ایک طرف، خود محمد گلِ نازک صاحب بھی لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ امجد اسلام امجد کے بارے میں نسیم سحر صاحب اپنے خاکے میں لکھتے ہیں:

''چند دن قبل کی بات ہے، مجھے پیغام ملا کہ امجد اسلام امجد ریاض، سعودی عرب میں اپنے ہم زلف کے ہاں پہنچ چکا ہے اور یہ کہ مَیں اُسے فون کر لوں۔ اس پر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ مجھے ہنسی اس لئے آئی کہ امجد بھی کسی کا ''ہم زلف'' ہوسکتا ہے! ہم زلف ہونے کے لئے تو ''ہم'' کے ساتھ ساتھ ''زلف'' کا ہونا بھی ضروری ہے اور امجد کا زلف سے (یعنی اپنی زلف سے) وہی تعلّق ہے جو چیل کے گھونسلے کا ماس سے ہوتا ہے۔۔۔ مجھے یہ خاکہ لکھتے ہوئے ایک مشورہ بھی ملا کہ میں اَور کچھ بھی لکھ دوں، امجد کے بالوں کو موضوع نہ بناؤں۔ اب آپ خود ہی بتایئے کہ جو چیز موجود ہی نہیں اسے موضوع کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ ویسے مجھے یقین ہے کہ چاہے اس خاکے میں اُس کے بالوں کے حوالے سے کچھ بھی لکھ ڈالوں، امجد برا نہیں مان سکتا کیونکہ خود اسی کا قول ہے کہ چاہے بندہ ضائع ہو جائے، جملہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔''

''پھول کھلے یا نہ کھلے'' ایک معروف شاعر جناب شجاعت علی راہی کی کتاب کا عنوان ہے، یہ عنوان راہی صاحب نے اپنے اِس شعر سے چنا ہے:

''پھل ملے یا نہ ملے، پھول کھلے یا نہ کھلے
ایک عادت سی ہے، سو بیج کو بو دیتا ہوں''

از راہِ تفنّن نسیم سحر صاحب نے ''سو بیج کو بو دیتا ہوں'' سے پورے ایک سَو بیج مراد لی ہے اور رقم طراز ہیں کہ ''شجاعت علی راہی عادتاً پورے ایک سَو بیج بونے پر ہی کیوں تُلے ہوئے ہیں، ننانوے کیوں نہیں بوتے؟''

جناب قیّوم طاہر کی کتاب ''لوحِ خزاں'' کے عنوان پر نسیم سحر کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''لوحِ خزاں جیسے ثقیل اور اداس عنوان کی حامل تصنیف بظاہر کسی لبِ گور بیٹھے عمر رسیدہ، نحیف و ناتواں دائمی مریض کی آخری کتاب لگتی ہے''

پھر انہوں نے اسی کتاب میں سے قیوم طاہر کا یہ شعر نقل کیا ہے:

بس اس یقین سے اُجلے حروف لکھے ہیں
کہ کل کے صفحے میں میرا نسب ہی رہنا ہے

اور پھر اس پر یوں تبصرہ فرمایا ہے:

''چونکہ اس شعر کے ذریعے قیوم طاہر نے آیندہ کل کے صفحے پر میرے اور دوسرے شعراء کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑی اس لئے مَیں اسے یہ مشورہ پہلے ہی دے دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی اس خوبصورت کتاب کا یہ قریب المرگ

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ کیجیے

''خودشناسی کے مراحل''

پروفیسر اقبال واجد
(بھارت)

نسیم سحؔر کی شاعری نئے تیور کی شاعری ہے۔ وہ اردو کی نئی شاعری میں مخصوص تیور اور اثر سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے حسین تیور کی جمالیاتی تعبیر ہے۔ ہر اچھے شاعر کا اپنا تیور ہوتا ہے اور وہ موضوع اور مسائل میں اپنا الگ رجحان رکھتا ہے۔ شعر میں اپنا مزاج، اپنا تیور، اپنا رجحان پیوست کر دینا ہی اونچی شاعری کی خصوصیت ہے۔ ہر اونچی شاعری شخصی شاعری ہوا کرتی ہے۔ وہ جذبات واحساسات کے تنوع کے باوجود شخصی چیز ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ بھی ہے کہ شخصی اثر اور بالکل ذاتی احوال ہی شاعر کی اصل ہے۔ جو بات آپ بیتی میں ہے وہ جگ بیتی میں نہیں ہے۔ اپنے لیے جو بات کہی جاتی ہے وہی سب سے طاقت ور ہوتی ہے۔ یہی شاعری کی اصل تخلیقیت ہے۔ شاعر کے یہاں مخصوص رجحان یا تیور کے مجردات بھی اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب اس شاعر کے یہاں زندگی اور کائنات کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ یہ اہلیت دل ونظر کی زرخیزی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ دل کے اسرار وعجائبات میں سے ایک عجوبہ یہ بھی ہے کہ وہ خود بخود اشیاء کو دیکھنے اور سمجھنے کا منفرد تیور پیدا کر لیتا ہے۔

نسیم سحؔر کے منفرد تیور کی تخلیق میں بھی اوروں کی طرح لازماً یہی نکتہ تہہ نشین ہوگا جو اوپر عرض کیا گیا ہے۔ نسیم سحؔر بھی طبعاً اور مزاجاً فطرت اور کائنات سے مخفی ربط رکھتے ہوں گے۔ بچپن سے لے کر حال تک کے تجربات اور جذباتی تبدیلیوں نے ان کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہوگا جہاں ان کے یہاں ایک منفرد تیور پیدا ہو گیا ہوگا۔ اور وہ تیور ہر شئے کو اپنی نظر سے سمجھنے اور اسے اپنے ساتھ شریک کر لینے کی کوشش کرتا ہوگا۔ نسیم سحؔر کے اسی شخصی تیور کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ ایسے موضوعات اور مسائل کو محیط ہے جو نسیم سحؔر کے لیے کسی نہ کسی دلچسپی کا سبب ہوں نسیم سحؔر کا یہ مخصوص تیور ہر موضوع اور تجربے کے ساتھ اس موضوع یا تجربے کے مطابق تیور اختیار کرتا ہے۔ نسیم سحؔر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ مختلف النوع موضوعات، جذبات اور مسائل میں اپنا عمل محفوظ رکھتے ہیں اور اسی شعری تجسیم اور تعدیل کو اختیار کرتے ہیں جو ان کے ذاتی احوال ومقامات اور شخصی تیور کے لئے ہر طور مناسب ہو۔ اس وجہ سے ان کے یہاں اظہار میں اعتماد اور بلندی پائی جاتی ہے۔۔۔ کبھی وہ ٹوٹی جھونپڑی، کچے مکان اور چھپروں کی بات کرتے ہیں، کبھی اعلیٰ ترین تہذیبی رنگت کو اپنی تحریروں میں زندہ کرتے ہیں۔۔ نسیم سحؔر کے شاعرانہ تیور نے ان کو شعری اظہارات کی راہ میں ایک نئے سفر پر آمادہ کیا ہے.....ان کا یہ شعری سفر اردو میں نیا ہے۔

نسیم سحؔر کی سب سے اہم صفت ''سامنا پن'' یا ''روبروئی'' ہے۔ یعنی ان کی شاعری میں روبرو اور مدمقابل ہونے کی صلاحیت ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی کہتے ہیں ان کے اشعار اس موضوع کے مدِ مقابل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک حمایتی تیور ہے جو اصلاً اپنے سامع یا قاری کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایسی اس وقت ہوتا ہے جب کسی اہم مسئلہ پر بات کی گئی ہو۔ ایسی صورت میں ایک مثلث قائم ہو جاتا ہے۔ ایک جانب تو وہ مسئلہ یا موضوع اپنی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کے مقابل کوئی شعر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تیسری طرف قاری کھڑا ہوا اس موضوع اور معروض کا لطف اٹھاتا ہے۔ نسیم سحؔر کی شعری تخلیق میں وہ قوت ہے جو موضوع کے ساتھ چلنے یا اسے بدلنے کے بجائے اُسے Reset کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کا ہر شعر اپنے موضوع کے مدِ مقابل کھڑا ہو جاتا ہے اور موضوع اور شعر دو الگ اجسام بن جاتے ہیں۔ شعری تخلیق کا یہ نادر تیور اردو شاعری میں معدوم ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

خبر کیا کہ جگنو نے کیا سوچ کر
اندھیرے میں کچھ روشنی چھوڑ دی

مقفّل تو کمرے کو کر ہی دیا
مگر اس میں چابی لگی چھوڑ دی

زباں سے تو کچھ بھی نہ میں کہہ سکا
مگر اس کے گھر ڈائری چھوڑ دی

بتا تو سہی کچھ ترے لمس نے
بدن میں یہ کیا سنسنی چھوڑ دی

مندرجہ بالا اشعار میں تقریباً ہر شعر معروضی ہے اور ہر شعر اپنے مختلف موضوع کو ایک ہیولے کی شکل میں اس کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک سامع یا قاری وہاں موجود رہتا ہے۔ شعر اپنے موضوع کے مقابل کھڑا رہتا ہے۔ پھر کبھی کسی اور وقت اگر یہ شعر قاری کو یاد آ جاتا ہے تو وہی عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہی کیفیت پھر اسی جگہ جمع ہو جاتی ہے۔ جب تک قاری اپنے ذوق کے ذریعہ شعر کو کوئی نیا معنی نہ پہنا دے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نسیم سحؔر کے اشعار تاثیر کی پائداری اور ''سامنا پن'' کے ساتھ اپنی لذت قائم رکھتے ہیں۔

نسیم سحؔر کے یہاں شعری تیور بولنے والا کم ہے اور خاموش زیادہ ہے۔ وہ خاموشی کی زبان سے بولتے ہیں۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر کچھ کہہ کر بھی خاموش ہیں۔ یہ سکوت شعر میں ہزاروں امکانی توجیحات پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب شعر میں موضوع کی مناسبت سے موزوں ترین الفاظ استعمال کیے گئے ہوں اور سب کچھ لفظوں ہی پر نہیں چھوڑ دیا گیا ہو۔ بلکہ اس میں ایک اضافی خاموشی بھی شامل ہو۔ گویا مختصر لفظوں میں کہہ سکتے

ہیں کہ ان کو بول کر بھی خاموش رہنا آتا ہے۔ان کی شاعری میں تکلم کے باوجود کہیں نہ کہیں خاموشی کا راج ہے۔

میں نے ہر موسم میں نسیم ہمیشہ اس کو یاد کیا
جس کو میری یاد نہ آئی اتنے اچھے موسم میں

شاید قارئین یہ محسوس کریں کہ جیسے ہی ہم یہ شعر پڑھتے ہیں اور دوسرا مصرع ختم کرتے ہیں۔ہمیں ایک خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔یعنی میں کیا کروں؟ سوائے خاموش رہنے یا صبر کرنے کے میں کیا کرسکتا ہوں؟ بات خاموشی پر ختم ہوتی ہے۔دوسرے اشعار دیکھیں۔

اندر اور باہر خاموشی
منظر در منظر خاموشی

یوں آوازیں قتل ہوئی ہیں
جیسے اِک خنجر خاموشی
باہر لفظوں کا غوطا ہے
بیٹھی ہے اندر خاموشی

وادی وادی شور بپا ہے
اور پہاڑوں پر خاموشی

سہمے سہمے سارے منظر
پنچھی ، چاند، شجر، خاموشی

چھ دروازے باتیں کرتے
لیکن ساتواں در خاموشی

میں نے جتنے شعر کہے ہیں
سب کا پس منظر خاموشی

آخری شعر کی مثال لیں تو بقول شاعر اُس نے جتنے اشعار کہے ہیں سب کا پسِ منظر خاموشی ہے۔اس پر مستزاد ہے کہ یہ پسِ منظر شعر کے پیش منظر میں بھی خاموشی پیدا کر دیتا ہے۔نسیم سحر کے اس خاموش تیور نے ان کے کلام سے بڑھ کر کلام کیا ہے۔نسیم سحر بات کر کے بھی خاموش رہتے ہیں اور خاموش رہ کر بھی کلام فرماتے ہیں۔نسیم سحر کا یہ اندازِ تکلم ہمیں گہری سوچ کی طرف لے چلتا ہے اور زندگی کے مسائل میں سنجیدہ کاری کی تعلیم دیتا ہے۔وہ خاموشی کی جمالیات سے مستفید ہونا جانتے ہیں۔

نسیم سحر کی شاعری میں کسی ایک احساس، خیال، جذبہ یا موضوع کی پیشکش کسی دوسرے احساس خیال جذبہ یا موضوع کا ذریعہ بن جاتی ہے وہ ایک کا ذکر کر کے اس سے دوسرا بھی مراد لیتے ہیں۔اس طرح وہ ہر احساس خیال جذبہ اور موضوع میں غیر کے تمنائی ہوتے ہیں۔اس دوسری ترجیح کی وجہ سے ان کے یہاں جمود طاری نہیں ہوتا۔ہر احساس، خیال، جذبہ یا موضوع طبعاً ایک کے بعد دوسرے کی طرف مائل ہوتا چلا جاتا ہے۔اس لئے زندگی حرکت میں رہتی ہے۔ دیکھیں تو شعری تجربے میں Next Option کی وجہ سے ایک لطیف احساسِ لمس پیدا ہوتا ہے۔پھر اس کی وجہ سے مکمل تبدیلی کی آرزو جاگتی ہے۔اسی کے سبب ایک احساس کے بعد دوسرا احساس، ایک خیال کے بعد دوسرا خیال، ایک جذبے کے بعد دوسرا جذبہ ایک عمل کے بعد دوسرا عمل پے در پے سامنے آتا رہتا ہے۔نسیم سحر اس احساس سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور دوسرے کو بھی اس کا موقع دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں دوسری ترجیح کی وجہ سے بہت دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔شعور اس ترجیح کو اخذ بھی کرتا ہے اور متبادل احساسات اور متضاد کیفیات کے ساتھ یہ شعری تیور اور قوی ہوتا چلا جاتا ہے۔

عالم تنہائی میں یہ کون آیا دوسرا
اس کی صورت سے مشابہ میں ہوں مجھ سا دوسرا

سامنے آنکھوں کے رقصاں تھا تماشا دوسرا
اور منظر میں نے دنیا کو دکھایا دوسرا

پانیوں کی میری بستی پر حکومت اور میں
ڈھونڈتا چاہوں سمندر کا کنارہ دوسرا

خودشناسی کے مراحل طے نہ ہو پائے اگر
میں بھی ہو جاؤں گا شاید رفتہ رفتہ دوسرا

جب آسمان سے اس نے کیا سوال اک اور
زمیں کے ماتھے پہ لکھا گیا زوال اک اور

مرے وجود کی سرحد پی انتظار کرو
دکھاؤں گا دمِ رخصت بھی میں کمال اک اور

ہمیشہ ذکر کسی اور غم کا میں نے کیا
محیط مجھ پہ رہا عمر بھر ملال اک اور

نسیم سحر کو عمل سے پہلے کا عمل پسند ہے۔ وہ اپنے شعری احساسات میں ایسے عمل کی طرف راغب نظر آتے ہیں جو ماقبل عمل ہو۔ایسا شاید اس لیے ہے

کہ آخری لمحے سے پہلے کا لمحہ دراصل اپنے اندر حال و مستقبل دونوں کی وسعت رکھتا ہے۔ عمل اپنے مابعد عمل کے لئے بھی قیمتی ہوتا ہے۔ عام قائدے کے اعتبار سے بھی عمل کے حدوث کے سلسلے میں زمانے کا تسلسل ضروری ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ حال کے لئے مستقبل ضروری ہے مگر یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل بغیر حال کے کوئی شئے نہیں۔ کسی عمل سے پہلے کا عمل اس لئے اہم ہوتا ہے کہ جو ہو چکا وہ یقینی ہے۔ اور جو نہیں ہوا، وہ گمان کے اعتبار سے کیسا ہی پختہ کیوں نہ ہو، اپنے واقع ہونے میں حال کی طرح یقینی نہیں ہے۔ اس لیے کسی بڑے واقعے سے پہلے کا وقت جس کو اصطلاحاً Eleventh Hour کہتے ہیں بڑا عجیب و غریب اور بین الامکانی ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس میں امکانات بہت ہوتے ہی۔ یہ وقت اپنے متعلقہ کاموں کو اپنے اندر محصور کر لیتا ہے۔ اور بہت سارے امور کے لئے امکانات کی راہ استوار کرتا ہے۔ چنانچہ Eleventh Hour میں تھوڑے صبر اور تحمل سے جس قدر امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو قبل از وقت سمجھنا مشکل ہے۔ بعض خواص کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ایسے امکانات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جان بوجھ کر خطرہ مول لیتے ہوئے کاموں کو ان کے مقررہ اوقات کی منتہا تک لا کر اس وقت شروع کرتے ہیں جب کام کے ختم ہونے کا وقت شروع ہونے والا ہوتا ہے۔ ایسا تجربہ اکثر بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔ نسیمِ سحؔر بھی اپنی شاعری میں ایسے تجربات کے داعی ہیں۔

بہت تھا خوف طوفاں کا مجھے بھی
مگر طوفاں گزر جانے سے پہلے

مجھے کیوں توڑ دینا چاہتا ہے
یہ آئینہ بکھر جانے سے پہلے

بغاوت لہر نے برپا تو کی تھی
سمندر میں اُتر جانے سے پہلے

چلو بے خوف ہو کر قتل ہونے
پناہ گاہوں میں مر جانے سے پہلے

ہمیں اچھا لگا تھا موسمِ گُل
لہو میں ہاتھ بھر جانے سے پہلے

کوئی پیغام خنجر نے دیا تھا
مرے دل میں اُتر جانے سے پہلے

نسیمِ سحؔر کے شعری تیور میں ''امساک'' کی کیفیت درجہ بہ درجہ پائی جاتی ہے۔ شعری تجربے میں ''امساک'' کی یہ کیفیت اس جذبے سے عبارت ہے۔ جس میں مرئی اور غیر مرئی، معروضی اور موضوعی دونوں قسم کی اشیاء اپنی اپنی جمالیات کے بقدر حسنِ فطرت کو نمایاں کرتی چلی جاتی ہیں۔ ایسے اظہارات میں کبھی کبھی فطرت کا تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے جمال میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے یا پیدا شدہ اعتدال کو باقی رکھنے کے لئے کوئی ایسی ترکیب بھی استعمال میں لائی جائے۔ جس کے ذریعہ زندگی کا غیر مرئی تصور بھی قائم رہے اور افہام و تفہیم کی راہیں بھی ہموار ہوں۔ اس صورت میں زندگی خود ''امساک'' کا تقاضا کرتی ہے اور اس ''امساک'' کے ذریعے اپنی قوت میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ ''امساک'' کا مطلب تخلیقی کرب اور عمل کو اپنے ارادے سے غور و فکر کے لئے متعین کرنا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر کا وجدان خود بھی اس ''امساک'' کے ذریعہ بہت آسانی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف لوٹنا شروع کرتا ہے۔ بعض اوقات شعری تجربات میں ایسی کیفیات مطلوب ہوتی ہیں، تاکہ شعور اور وجدان اپنے جمالیاتی مطالبوں کو حاصل کر سکے اور جذبات و احساسات میں اعتدال قائم کرتا ہوا کسی بڑے ارادے کی طرف لوٹ جائے۔ اس ضمن میں نسیمِ سحؔر کے اشعار غیر معمولی جمالیاتی توازن قائم کرتے ہیں اور اپنے جمال سے شعری تجربات کو خوبصورت بنا دیتے ہیں۔

کبھی عہدِ خزاں آنے نہ پائے
چمن میں یہ سماں آنے نہ پائے
ملے ہو اب تو اتنا دھیان رکھنا
کوئی بھی درمیاں آنے نہ پائے

یقیں کی حد میں داخل ہو گیا ہوں
کوئی دل میں گماں آنے نہ پائے

مرے وجدان میں جو شعر گونجے
سرِ نوکِ زباں آنے نہ پائے

آندھی نے جب دیئے کو سنبھلنے نہیں دیا
ہم نے کوئی ستارہ اجلنے نہیں دیا

پہلے تو رہگذار تراشی مرے لیے
پھر میری راہِ روک لی، چلنے نہیں دیا

اب کے برس بھی موسمِ گُل نے نسیمؔ کیوں
پھولوں کو پیرہن ہی بدلنے نہیں دیا

آپ محسوس کریں گے کہ اوپر جو اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ان میں اختیاری اور غیر اختیاری دونوں قسم کے تخلیقی ''امساک'' کا نمونہ ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کسی جذبہ، خیال یا عمل کو آگے بڑھنے سے پہلے روک لینے یا تھام لینے میں کبھی تو اختیار کو دخل ہوتا ہے اور کبھی مجبوری کو...... یہ ''امساک'' جب اختیاری ہو تو اس کا فائدہ بھی اختیاری ہوتا ہے اور جب یہ غیر اختیاری ہو جائے تو اس کا فائدہ بھی غیر اختیاری ہو جاتا ہے۔بہر حال نسیمِ سحر کے یہاں یہ احساس مختلف اور متضاد کیفیات کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور کبھی اس تضاد اور اختلاف کے بین بین رہ کر بھی چلتا ہے۔

نسیمِ سحر کے تیور میں ''ترک'' اور ''انکار'' کا پہلو بھی شانہ بہ شانہ چلتا ہے۔ ''ترک'' اور ''انکار'' ان کی شاعری میں دھیمی رفتار سے چہار سمت پھیل گیا ہے۔ انکار کی کیفیت ہمیں ایسے ارادوں کی طرف لے چلتی ہے جو قابل لحاظ نہ ہوں اور اپنے عمل کے لیے شاعر کی کیفیات اور محدثات کے محتاج ہوں۔اس لیے ایسا انکار جو خیال و عمل کو تقویت پہنچاتا ہوا اور قوت کے سہارے چلنا سکھاتا ہو وہ کوئی محور قائم کئے بغیر بھی اپنی رفتار متعین کر سکتا ہے اور خود گردش کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔انکار کا یہ قرینہ ہمیں زندگی کی رمزیت کی طرف بھی لے چلتا ہے اور شعور اور وجدان کی باریک تفہیمات کی طرف بھی۔اس طرح اشیاء، افکار یا اشکال کو ترک کرنا اور اس کی نمود کے لئے وضاحتی تعبیرات اور اشارات کی طرف مائل ہو جانا بھی اسی فطری تعدیل کا تقاضا ہے جو شعری تلبیسات کے دائرے کو وسیع کرتی ہے، اس لئے وجدانی عملیات میں ترکِ تعلق بھی بعض اوقات عزیز ہوتا ہے ۔ترک تعلقات کا مطلب یہاں پر سماجی تعلقات نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہ تعلق ہے جو شاعر کے یہاں بغیر کسی معروض کے قائم ہوتا ہے اور سامع کے ساتھ اس کا رشتہ اس قدر قوی ہو جاتا ہے کہ سامع ان کی تبدیلی یا عدم تغیر کو اپنے نفس میں محسوس کرنے لگتا ہے۔اس ترکِ تعلق کو غیر مرئی اور وجدانی تعبیر عطا کرنا اور اس کے جمال کا اپنے نفس میں مشاہدہ کرنا دشوار امر ہے، جو بغیر کسی معروض کے آسان نہیں ہے۔نسیمِ سحر نے اپنی شاعری میں جو مجموعی تیور بلند کیا ہے۔اس میں ''ترک'' اور ''انکار'' کی جمالیات کو محسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔تا کہ شاعری کو فکری سطح پر بھی ایک ایسی راہ گذار نظر آ جائے جو اسے واقعیت اور تخلیقیت کے قریب کرتی ہو۔نسیمِ سحر کا یہ ترک اور انکار اپنے اندر غیر معمولی اثرات وضع کرتا ہے۔اس سلسلے میں چند اشعار دیکھیں، جن میں بڑے لطیف پیرائے میں ترک اور انکار کا فکر یہ پایا جاتا ہے۔

ہدف میں آسمانوں کے مہ و اختر نہیں رکھتے
ہم اپنی آنکھ میں یہ اجنبی منظر نہیں رکھتے

کبھی اشکوں کبھی خونِ جگر سے کام لیتے ہیں
ہم اپنے دل کی کھیتی کو کبھی بنجر نہیں رکھتے

اب بھی کتنے سراب حائل ہیں
وہ جہاں ہے وہاں نہیں ہے وہ
اس پہ چھایا ہوں آسماں کی طرح
پھر بھی میری زمیں نہیں ہے وہ

ہر جگہ اس کو دیکھ سکتے ہیں
اور بظاہر کہیں نہیں ہے وہ

آستانے ہیں اب بھی سجدہ طلب
مگر اپنی جبیں نہیں ہے وہ

نسیمِ سحر نے اردو کی شعری روایات کا اعادہ کرتے ہوئے اپنی شاعری میں تجاہل عارفانہ سے بھی کام لیا ہے۔ان کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جس میں جدید تیور میں تجاہلِ عارفانہ کی صنعت پیش کی گئی ہے۔نسیمِ سحر کے تجاہلِ عارفانہ میں علم کی جھلک بھی ہے اور تشکیک بھی۔کہیں کہیں علم پر شک حاوی ہو گیا ہے اور کہیں شک پر علم غالب ہے۔غرض دونوں کے اثر و تاثر نے شعری تعبیر اور تیور کو انوکھا انداز عطا کیا ہے۔یہ شعری واقعیت، تجاہل اور عرفان کے درمیان اپنی نئی راہ نکالنا چاہتی ہے۔نسیمِ سحر کے یہاں دونوں پہلو کا اظہار ہے۔اس اظہار سے ان کی شاعری میں تواصل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کیفیت بالواسطہ طور پر قاری پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

ساتھ دے گی یہ عمر بھر شاید
خشک ہو گی نہ چشمِ تر شاید

عمر کتنی طویل لگتی ہے
اب کہانی ہو مختصر شاید

اس زمانے کے ساتھ چل نہ سکے
تھے ہمیں لوگ بے ہنر شاید

اب پلٹ کر نسیم کیا جائیں
گر چکے ہوں گے بام و در شاید

نسیم سحر کی شعری خصوصیات میں ایسی بہت سی کیفیات شامل ہیں جو ان کی شاعری کو حسنِ تخلیق کی تدبیر عطا کرتی ہیں۔ان ہی میں ایک رنگِ گم گشتگی بھی ہے۔ نسیم سحر کے شعری تماثیل کے ہر مظہر میں اور جذبہ و احساس کے ہر تیور میں، گم گشتگی کی کیفیت ملتی ہے۔شعری تطہیر کا یہ عمل نسیمِ سحر کے یہاں آزادانہ سفر کرتا ہے۔اس گم گشتگی کو ہم شاعر کا تحیر بھی کہہ سکتے ہیں جو اپنے موضوع اور اسلوب سے غیر معمولی لگاؤ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔گم گشتگی موضوع سے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے اس لیے

یہ نتیجہ اخذ کرنا ضروری ہے کہ نسیمِ سحرؔ کی گم گشتگی میں ہمیں ایسے اسرار ملتے ہیں جو کسی عزیز تر شئے سے گریز کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ نسیمِ سحرؔ کی شاعری میں یہ نکتہ ہمیشہ قابلِ لحاظ رہا ہے کہ کسی موضوع یا اسلوب سے شاعر کا جو تعلق ہے وہی تعلق بسا اوقات اس موضوع و مواد کا شاعر سے بھی ہو۔ ایسی صورت میں دو طرفہ کھچاؤ قائم رہے اور ایک حد تک آکر یہ کھچاؤ بھی گم گشتگی یا وابستگی میں شامل ہو جائے۔ نسیمِ سحرؔ کی گم گشتگی میں حیرانی بھی ہے، طمانیت بھی۔ فطرت کے اسرار و رموز بھی ہیں اور انسانی رشتوں کی تبدیلی بھی۔ اس میں اپنی تلاش بھی ہے اور کائنات کی سمجھ بھی۔ اس میں ممکنات کا شعور بھی ہے اور ناممکنات کا فہم بھی۔ لاعلمی اور التفات بھی ہے اور زمانے کی تفہیم بھی۔ غرض نسیمِ سحرؔ کی یہ گم گشتگی بے شمار بے نام احوال و کوائف سے عبارت ہے جو ان کی شاعری پر اپنا سایہ کیے ہوئے ہے۔

کچھ اس کے ترکِ تعلق کا علم ہی نہ ہوا
میں اس کے مرحلۂ التفات میں گم تھا

مری تلاش میں کب کوئی کامیاب رہا
میں ایک ذرہ تھا اور کائنات میں گم تھا

نسیمؔ ایسے میں شب خون موت نے مارا
میں جب کہ نشۂ آبِ حیات میں گم تھا

دعا ہے در بدر جانے سے پہلے
میں گم ہو جاؤں گھر جانے سے پہلے
اپنی حالت سے اسے رکھا ہمیشہ باخبر
اپنی حالت سے ہمیشہ بے خبر بھی میں رہا

آج کے اتنے مسائل نے مجھے گھیرا ہے
کوئی بیتا ہوا یا آئندہ کا یاد نہیں

غرض مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو نسیمِ سحرؔ کی شاعری اپنے عصر کی شاعری ہے۔ یہ ایسے تجربات اور احساسات کے ساتھ منسوب ہے جو خود نسیمِ سحرؔ کے تخلیقی محرکات میں موجود ہیں۔ ان کی شاعری نے بالواسطہ اور واسطہ طور پر اپنے دور کے ہر رجحان کو متاثر کیا ہے۔ ان کے اندر ماحول سے اخذ کرنے اور ماحول کو عطا کرنے کی بھی صلاحیت ہے۔ سعودی عرب کی سرزمین میں جو شعراء عرصہ دراز سے خدمت انجام دے رہے ہیں ان میں نسیمِ سحرؔ سرِ فہرست ہیں۔ ان کی شعری ترجیحات اور مظاہر سے ہم یہ اندازہ لگانے پر مجبور ہیں کہ نسیمِ سحرؔ نے اردو کے جدید شعراء کی صف میں اپنا مقام بنایا ہے۔ شاعری میں جدت اور تہہ داریت کے ساتھ ساتھ انہوں نے سادہ اظہار میں گہرائی اور معنویت کو آگے بڑھایا ہے۔ زمانہ اور زندگی کا محاسبہ ہو، ذوق و فکر کا کوئی پہلو ہو، حسن و عشق کے غیر استمراری توہمات ہوں، سادہ زندگی جینے کا عزم ہو۔ وہ شعر کو معنی کی تکفیر اور ضبط سے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے احساس اور فنی شعور کو تخلیقی صورت حال میں بھی دیکھتے ہیں اور انہیں تحدیدی تمثیلیت کے شانہ بہ شانہ بھی چلاتے ہیں۔ نسیمِ سحرؔ کی شاعری ہمیں ایسے تخلیقی اشاریہ کی سمت لے چلتی ہے جو اپنی ساخت اور اظہار میں ایک نیا تخلیقی تجربہ ہے۔ وہ بڑی حد تک اس بات کے داعی ہیں کہ شاعری کے جذبات کی تنظیمِ نو کے لئے ضروری حد تک استعمال ناگزیر ہے۔ اس تنظیمِ نو کا اثر شاعر کی اپنی ترجیحات پر بھی پڑتا ہے۔ کوئی بھی تخلیقی یا شعری تجربہ ہو وہ کسی نہ کسی درجہ میں جذبات کی تنظیمِ نو کا کام کرتا ہے۔ جذبات کی تنظیمِ نو کے لئے تو شاعری کی ضرورت پڑتی ہی ہے مگر شاعری کے لئے جذبات کی تنظیمِ نو اور بھی کارآمد ہے۔ نسیمِ سحرؔ نے اپنی شاعری کو اسی انداز سے برتا ہے۔ لہٰذا وہ جذبات اور انسانی علم کی دریافت میں حقائق سے قریب ہوتے گئے ہیں۔

میں سفر میں بھی رہا اس سوچ میں گم بھی نسیمؔ
راستہ میرے لئے شاید مقرر اور ہے
دوامی ہوگیا ہے دورِ شاہی
کہ باغی شاہزادہ ہو گیا ہے

ذرا سی دیر، ٹھہراتا رہتا ہے
پھر اس کے بعد کا منظر ہی جاتا رہتا ہے

موسمِ گُل کا بہت ماتم کیا
بیٹھ کر چڑیا نے روشندان میں

نسیمِ سحرؔ کی شاعری کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ نسیمِ سحرؔ شعری تمثیل اور تخلیقی واقعیت کی جمالیاتی تعبیر میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ ان کی شاعری اردو میں نئے تیور کی شاعری ہے۔ ان کے مخصوص شعری تیور نے شاعری کی تفہیم کے لئے نئے مجردات پیدا کیے ہیں۔ نسیمِ سحرؔ کا یہ انوکھا تیور کبھی خاموش لب و لہجہ کو استعمال کرتا ہے۔ کبھی کسی عمل سے پہلے کا عمل بن کر مابعد اعمال میں خاموش فشار پیدا کرتا ہے۔ کبھی یہ تیور Second Choice کو اختیار کرتا ہے کبھی Eleventh Hour کی تخلیق کو اپنا نشان بناتا ہے۔ کبھی یہ ''امساک'' کی راہ پر چل پڑتا ہے کبھی ''ترک'' اور ''انکار'' سے ہم رشتہ ہو جاتا ہے، کبھی ہم اسے تجاہلِ عارفانہ کی تجدید نو کے قریب پاتے ہیں، کبھی گم گشتگی اور تہہ داریت کا مظہر دیکھتے ہیں۔ اسی لئے عرض کیا گیا تھا کہ نسیمِ سحرؔ کی شاعری نئے تیور کی شاعری ہے جو اپنے تخلیقی مزاج اور شعری تمثیل کی جمالیاتی تعبیر بن کر اردو میں جدید تر شعری دریافت بنتی جا رہی ہے۔ وہ سعودی عرب میں مقیم شعرائے اردو میں صفِ اول کے شاعر ہیں۔

مدینہ یابی کا ایک سفر

ڈاکٹر احسان اکبر
(اسلام آباد)

عقیدت میں ڈوبی نسیم سحر کی شاعری میرے سامنے ہے۔ انہوں نے اس مجموعہ کا نام رکھا ہے ''نعت نگینے'' مجھے تو یہ شاعری مدینہ دوستی، مدینہ رسی، مدینہ پسندی اور مدینہ فہمی کی ایک سعیِ مسلسل نظر آئی۔

نسیم ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں پایانِ عمر ایک طویل مدت سعودی عرب میں خدمات انجام دینے کا موقع ملا ہے۔ آج کے عہد میں بہت سے اہل ہنر بہت سے اہل فکر اس دیارِ پاک میں جانے کے لیے چُن لیے جاتے ہیں بہت سے لوگ ایسے خوش بخت ہیں جنہیں ایسے وسائل مہیا ہیں کہ وہ قریباً ہر سال دیارِ حرم میں حاضری دے آتے ہیں مگر ''مدینہ چلو'' والی یہ لگن ہر کسی کی قسمت میں کہاں! ہجِ محبوبؐ کے دیار کے ذکر سے منور اشعار ذرا دیکھئے گا۔

زیارت ہوگئی جب بھی حرم کی
بصارت بڑھ گئی ہے چشمِ نم کی

مری ابتداء یہ میری انتہا یہ
دوائے مدینہ، دعائے مدینہ

حاضری دیتا ہوں جب بھی میں مدینے میں نسیم
عرض کرتا ہوں کہ بن جائے حضوری حاضری

میں دے کے حاضری چل تو دیا مدینے سے
صدائیں گونج رہی تھیں، نہ جانے مدینے سے

لٹیں گی وہاں رحمتیں اس مہینے
رہوں کاش پورا مہینہ مدینہ

اور جب یہ نعمت نصیب ہوگئی تو کہا ہے

اور کیا چاہیے؟ کچھ اور نہیں چاہیے اب
درِ طیبہ پہ ہوں اللہ غنی اُن کا کرم

نسیمِ سحر کے لیے یہ بڑی بات ہے کہ وہاں حاضری ممکن ہوگئی سو اس بات کو یوں بھی کہا کہ:

حاضری کا شرف مل گیا جب مجھے اور کیا اب نسیمِ سحر چاہیے

نسیم کو معلوم ہے کہ یثرب کو مدینہ بنا دینے والی کرشماتی شخصیت آنحضورﷺ کی ذات والا تبار ہے اسی لیے مدینہ کی خاک اُسے کحل الجواہر سے بڑھ کر ہے۔ مدینہ دوستی کا سارا سلسلہ جب آنجنابﷺ کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ وہ جو کہا گیا کہ:

اے خوش آں شہرے کہ آں جا دلبر است

نسیم نے کہا ہے:

دراصل ہوئی اس دن تعمیر مدینے کی
ہجرت نے سنواری جب تقدیر مدینے کی

نیز

ہو نہ جب تک لاشعوری اور شعوری حاضری
رہتی ہے تب تک مدینے میں ادھوری حاضری

آنحضورﷺ کے دم سے مدینۃ النبیﷺ مرکزِ محبت بنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

فقط اک استعارہ ہے مدینہ
نبی کے دم سے پیارا ہے مدینہ

نسیمِ سحر نے رسول اللہﷺ کی ذاتِ پاک اور مدینۃ النبیﷺ کے وجود کو شعور اور لاشعور سے ہمکنار ہو کر یوں ملا کے دیکھا ہے کہ اس شہرِ محبت نے انہیں ایک تخلیقی واردات عطا کی سو ان کے چمکدار اور دلپذیر شعر اس شہر سے متعلق ہوگئے ہیں:

روشنی میں نہائے ہوئے ہیں
ہم مدینے میں آئے ہوئے ہیں

ہے کوئی ساحلِ محفوظ تو مدینہ ہے
چہار سمت بھنور کے سوا کچھ اور نہیں

میں کسی سمت گیا کوئی بھی منزل تھی مری
لے گیا ہے مرا وجدان مدینے کی طرف

مدینہ تو ایک دنیا ہی اور ہے

مدینے کے انوار گویا نسیم
نگہ در نگہ کہکشاں دیکھئے

تھا دھیان بھی جانب مدینہ
پاؤں بھی مرا رکاب میں تھا

اور یہ کہ

اشکوں سے مری روح وضو کرنے لگی ہے
ممکن ہے کہ در پیش مدینے کا سفر ہو

دیارِ رسول سے تعلق کی یہ کیفیت وہ ہے جو دل کا جذبہ بن جاتی ہے۔

لوٹ کر آ رہا ہوں مدینے سے میں پھر بھی دل کی تڑپ کا یہ اصرار ہے
پھر مدینے کا اذنِ سفر چاہیے پھر اُدھر کی کوئی رہگذر چاہیے

نسیم نے مذکورہ بالا شعر ایک اور نعت کی زمین میں نعت کہتے ہوئے کہا تھا۔ اردو شاعری کی مقبول اور معروف زمینوں میں بھی نسیم نے بہت سی نعتیں کہی ہیں۔ بعض غزلوں کی خوبصورت زمینوں میں بھی انہیں طبع آزمائی کی دعوت دی ہے۔ بعض پسندیدہ نعتیہ مصرعوں کو بھی تضمین میں لائے۔

تعبیر میں تھا جو خواب میں تھا
''دیکھا کہ میں اس جناب ﷺ میں تھا''

پہلا مصرعہ جو انہوں نے لگایا وہ بھی دیکھیے۔

خاص تھا اُن کا مرتبہ اس کی دلیل یہ بھی ہے
''حق نے بلایا اپنے پاس خاص کلام کے لیے''

غزل گوئی کی دنیا میں مفاعلات مفاعیل فاعلن فعلن ان دنوں خصوصیت سے بڑی برتی گئی۔ نسیم نے اس میں نعتِ نبی ﷺ کہی۔

پیمبر اور بھی آئے تھے ان ﷺ سے پہلے مگر
جو ان کے آنے سے شانِ پیمبری ہوئی ہے

یہاں لفظ ''جو'' نے جو حسن کی انتہا بیان کر دی ہے محتاجِ وضاحت نہیں۔ نسیم نے ہائیکو، ثلاثی اور ماہیا ایسی اصناف کو بھی نعتِ نبی ﷺ کے لیے استعمال کیا۔ یہ قادرالکلامی کی بات ہے۔

نعتِ نبی ﷺ کے وہ اشعار جو مدینہ سے مربوط تھے کافی بیان میں آ چکے ہیں۔ بعض دوسرے اشعارِ نعت دیکھئے:

انہی ﷺ کے نام کو تحریر سطر سطر میں کر
انہی ﷺ کے ذکر کو بین السطور روشن رکھ

لوگ حیرت سے دیکھتے تھے
میرے دستِ تہی میں کیا کچھ تھا

ہمارا جینا بھی مرنا بھی اُن کے نام پہ ہے
ہمارے پاس حوالہ ہی اور کوئی نہیں

رقم کرتے رہے مدحِ رسالت
مگر جتنی رقم کی ہے وہ کم کی

نسیم کے ہاں مرکزی حوالہ مدینہ کا ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ اس نگاہِ عنایت کا معجزہ ہے کہ میں
مدینے جانے لگا باریاب ہونے لگا

بڑی بات ہے کہ نسیم پر مدینہ کا در کھولا گیا ہے۔ یہ باریابی دربار یابی کا آغاز ہے۔ کہا ہے:

نسیمؔ اعجاز ہے یہ بھی مدینے کا یقیناً
کہ میری نعت میں روشن کنائے آ گئے ہیں

☆

طبی ماہنامہ

اخبار میں ہمارے ایک کولیگ ہوتے تھے۔ بہت سوشل تھے، تعلقات بنانا جانتے تھے۔ اِدھر اُدھر کے اضافی کام بھی کرتے رہتے تھے۔ انہیں ایک طبی ماہنامے کی ادارت کا کام بھی مل گیا۔ کافی تعداد میں چھپنے والا یہ رسالہ ایک طبی گھرانے کا تھا، جواب طب سے زیادہ دواسازی کے صنعت کار کے طور پر زیادہ جانا جاتا ہے لیکن طبی سیاست میں سرگرم ہے۔ طبی کونسل جیسے اداروں میں ان کے گروپ کے خاصے لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان کا بہت اثر ورسوخ ہے، طبیہ کالجوں کی منظوری وغیرہ میں ان کی چلتی ہے۔ یہ رسالہ بھی ان کی ادویات، دواخانے، مالکان اور ان کے گروپ کی تشہیر کیلئے تھا۔

اس کولیگ دوست نے ایک دن بتایا کہ باباجی (ادارے کے مالک) نے ان کا طبیہ کالج میں داخلہ کرادیا ہے۔

پھر تین یا چار سال بعد انہوں نے بتایا کہ انہیں اب طب کی سند مل گئی ہے۔ جسے شاید فاضل طب والجراحت کہتے ہیں۔ مجھے شدید حیرت ان کے یہ بتانے پر ہوئی کہ ان کا داخلہ لاہور نہیں، جھنگ کے طبیہ کالج میں کرایا گیا تھا اور وہ جھنگ زندگی میں کبھی گئے ہی نہیں۔

ان کے پرچوں، نمبروں، نتیجے، سند کا سب کام باباجی کے کہنے پر ہوگیا۔

وہ اخبار بند ہوا تو وہ دوست کسی دوسرے اخبار یا اشاعتی ادارے میں نہیں گئے بلکہ ایک گنجان آبادی میں اپنا مطب کھول لیا اور جلد ہی سنا کہ وہ بہت چل نکلا ہے۔ لوگوں سے اچھے انداز اور ہمدردی سے بات کرنا تو انہیں آتا ہی تھا، خاصے مقبول ہوگئے۔ کام یہاں تک بڑھا کہ انہوں نے ایک سابق کولیگ، سینئر صحافی کو معاون بھی رکھ لیا۔ ہوسکتا ہے انہیں بھی سند دلادی ہو۔

خواب سب سے الگ

حسین سحر
(سعودی عرب)

نسیم سحر میرے نصف ہم نام اور ہم تخلص ہیں۔ اُن سے میرے تعارف کا عرصہ کوئی تیس پینتیس سال پر محیط ہے۔ لیکن ہماری باقاعدہ دوستی کا آغاز ۱۹۸۸ء سے ہوا جب میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب آیا۔ میرا قیام اپنے عزیزوں کے ساتھ جدے میں تھا، یہیں نسیم صاحب سے پہلی بالمشافہ ملاقات ہوئی، وہ جس وارفتگی اور اپنائیت سے ملے، آج تک اس کی مہک تازہ ہے پھر یوں ہوا کہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد میں اپنے بیٹوں کے پاس سعودی عرب چلا آیا۔ چنانچہ اب جدہ بھی میرا آنا جانا رہتا ہے۔ میں جدہ جاؤں اور نسیم سحر سے نہ ملوں یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ میں جدہ اور نسیم سحر کو لازم وملزوم سمجھتا ہوں۔ وہاں تو ریاض، دمام اور جدہ کے تمام ادبی دوستوں نے میری بے حد پذیرائی اور عزت افزائی کی ہے لیکن نسیم ان میں سب سے پیش پیش ہیں۔ وہ ایک مخلص، پرتپاک اور وضعدار انسان ہیں۔ مہمان نوازی اور دوست داری ان کے خون میں شامل ہے، کہ وہ خود پوٹھوہار کے ایک بہت وضعدار علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے سربراہ عبدالعزیز فطرت مرحوم تھے۔ ایوب محسن کے علاوہ اپنے خانوادے میں نسیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو اپنے خاندان کی ادبی روایات کے امین ہیں۔

وہ ایک انتھک اور فعال قلمکار ہیں جس تواتر اور تسلسل کے ساتھ وہ نظم ونثر میں لکھتے ہیں۔ اُسی تواتر اور تسلسل سے دنیا بھر کے ادبی جرائد میں چھپتے بھی ہیں اس لیے ان کا نام اُردو دان قارئین کے لیے پوری طرح جانا پہچانا ہے۔ سعودی عرب اور خاص طور پر جدہ کی کوئی ادبی سرگرمی ان کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی گزشتہ تقریباً ربع صدی سے وہ جدہ میں مقیم ہیں اور صرف جدہ ہی نہیں پورے سعودی عرب کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں وہ رات دن فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ آج عرب کے صحرائے ادب میں جگہ جگہ شعروسخن کے جو تازہ گلاب بہار دکھا رہے ہیں ان کی باغبانی میں سب سے زیادہ نسیم سحر کا خون جگر شامل ہے اُن کی گراں قدر خدمات کے لحاظ سے ہم انہیں پورے سعودی عرب کی نمائندہ ادبی شخصیت کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

کسی سچے فنکار کا فن ان کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ اور نسیم کا فن بھی ان کی ہمہ پہلو شخصیت کا پوری طرح ترجمان ہے۔ ان کی شخصیت بنیادی طور پر تین عناصر سے مرکب ہے، محبت، صداقت اور تحرک اور غور کیا جائے تو یہ محاسن ان کی نگارشات کے خصائص بھی ہیں اور وہ ایک پرگو شاعر ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ شاعری میں حمد ونعت ہو یا ہائیکو اور نظم ہو یا غزل ہر میدان ان کی جولاں نگاہ ہے لیکن شہسوار وہ غزل کے ہیں۔ اردو کے معروف وممتاز نقاد ڈاکٹر انور سدید کے بقول ''نسیم سحر نے جدید اردو غزل کو نئی کروٹ دی ہے'' اور میرے خیال میں یہ ایک مختصر سا جملہ ہی ان کی شاعری کے لیے سب سے بڑا خراجِ تحسین ہے۔ آیئے ذرا اس اجمال کی تفصیل میں جائیں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک جدید شاعر ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دورِ حاضر کے ان شاعروں میں شامل ہیں جن کا اسلوب فکری اور فنی لحاظ سے جدید ہے اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ ہماری شاعری کی قدیم یعنی کلاسیکی روایات سے لاتعلق ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی جدیدیت روایت سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے ظاہر ہے کوئی عمارت بغیر بنیاد کے ہوا میں تو تعمیر نہیں ہوسکتی بنیاد جتنی گہری اور مضبوط ہوگی، عمارت اتنی ہی پختہ اور محکم ہوگی غزل یوں بھی ہماری قدیم شعری روایت کا ایک ایسا تسلسل ہے جو آج تک جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا وقت بدلا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے تقاضے بدلے، تو اس صنفِ سخن نے بھی ہر دور میں نئی ہواؤں اور نئی فضاؤں کا ساتھ دیا یہی وجہ ہے کہ اس میں کبھی کہنگی اور فرسودگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے اور یہ آج بھی ہماری شاعری کی سب سے زیادہ مقبول اور نمائندہ صنف کے طور پر زندہ ہے۔

نسیم سحر کے یہاں فکر وفن کی جدیدیت انہیں ایک قد آور اور توانا شاعر کی حیثیت سے سامنے لاتی ہے ان کی شاعری میں فکری لحاظ سے جہاں نئی سیاسی اور سماجی صورتحال کا احساس اور اظہار موجود ہے وہاں فنی اعتبار سے جدید لسانی تشکیل کا عمل نئی لفظیات کی صورت میں ملتا ہے۔ وہ متنوع بحروں پر مبنی نئی نئی زمینوں میں شعر کہتے ہیں جو ان کی زبردست طباعی اور مشاقی کی دلیل ہے اس سلسلے میں ان کے بے ساختہ مطلعے خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں روانی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ ترنم اور نغمگی بھی رچی بسی ہے۔ مثلاً:

دیا تھا اُس نے جو غم کا خزانہ ختم ہوتا ہے
سو یہ بھی زندہ رہنے کا بہانہ ختم ہوتا ہے

ہے شرطِ سفر یہ کہ ادھر بھی نہیں جانا
لیکن کہیں رستے میں ٹھہر بھی نہیں جانا

وجود اپنا مجھے بیکراں نظر آیا
جب ایک ذرے میں سارا جہاں نظر آیا

اسی طرح ان کے جسد شاعری میں ان کی مضمون آفرینی تازگی اور ندرت کی زندہ فضا میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً:

آج یوں دل میں اس کی یاد آئی
جیسے چلنے لگے قفس میں ہوا

بدن میں آگ لگی ہے اور آنکھ روتی ہے
کہیں ہے دھوپ کہیں بارشوں کا موسم ہے

گلاب لہجے میں کرتا ہوں بات میں جس سے
وہ بات بات پہ تلوار کھینچ لیتا ہے

نئی لفظیات کے ضمن میں ان کے دو شعروں کی مثال پیش ہے:

ہوش کھو بیٹھوں کاش اک دن میں
اور اُسے دیکھ بھال میں دیکھوں

اور

وہ جو ساحلوں کے حصار میں نہ سمٹ سکے
انہی پانیوں کے اُچھال میں اُسے ڈھونڈنا

ان شعروں میں ''دیکھ بھال'' اور ''اچھال'' دو ایسے الفاظ ہیں، جن کا نسیم نے غزل میں نیا استعمال کیا ہے، اس کے علاوہ ان کے زیرِ نظر شعری مجموعے کا انتساب بھی سب سے منفرد اور سب سے الگ ہے۔

اُسی کے نام ہے یہ، جس کا نام لے نہ سکوں
مری کتاب کا ہے انتساب سب سے الگ

وہ وسیع مطالعے اور عمیق تجربے کے حامل ہیں عہدِ موجود کی نئی سیاسی اور معاشی صورتحال کی طرف وہ اس انداز سے پُر معنی اشارے کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کی ذات کا کرب اور آشوب آگے بڑھ کر پورے معاشرے کا کرب یعنی شہر آشوب بنتا صاف محسوس ہوتا ہے۔

شاہ کو اس کے وزیروں نے بتایا ہی نہیں
اُس کے درباری وفادار کسی اور کے ہیں

دیکھ کر رنگ ڈھنگ دنیا کے
فاختہ ہو گئی عقاب مزاج

سمندر پار کرنے کے لیے بیتاب ہیں کتنے
سفینے بھی سبھی غرقاب رکھنا چاہتے ہیں ہم

خزاں ہی آئے اگر موسمِ بہار نہیں
رہے نہ شہر مگر درمیاں کے موسم میں

پھول ہی پیش کروں گا میں بہر حال انہیں
جانتے ہیں یہ مجھے زخم لگانے والے

نسیم کا انسانی نفسیات کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ غزل میں نفسیاتی مسائل و حقائق کا اظہار پہلے بھی ہوتا رہا ہے لیکن اس اسلوب کو جس سلیقے سے نسیم نے اپنایا ہے وہ شاید بہت کم لوگوں کا حصہ ہے۔ ترکِ وطن کا کرب، تبدیلی کی خواہش اور نئے حالات کا ادراک انہیں اظہار و بیان کے نئے پرگداز پیرایوں کی طرف لے آتا ہے۔

تجھے ہم یاد کرنا چاہتے ہرگز نہیں لیکن
یہی اک کام اکثر بے ارادہ کرتے رہتے ہیں

اب کیا بتائیں کیسے ارادہ بدل گیا
گھر سے تو ہم چلے تھے ترے آستاں کی سمت

مرے سفر میں جو اَب تک شریک نہ ہو سکا
اُسی شریکِ سفر کی کہانی ختم ہوئی

ضروری تو نہیں لوٹوں بھی میں گہرے سمندر سے
اتر کر اس کی تہہ میں بھی کنارا دیکھ سکتا ہوں

یہی اک تمنا ہے دل میں مکیں
کہ دیکھیں کبھی ہم بدن خواب کا

خواب کے بدن کا نظارہ کرنے کے تمنائی نسیم سحر زبردست حقیقت پسند بھی ہیں۔ جدید حسیّت کے ساتھ نئے سماجی اور سائنسی حقائق کا شعور و ادراک انہیں اظہار و ابلاغ کا وہ پیرایہ عطا کرتا ہے جو پوری طرح روحِ عصر کے ہم آواز و ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اس تناظر میں یہ شعر دیکھئے۔

ماحول کے غبار نے چھینی چمک دمک
مٹی میں مل گیا تو گہر خاک ہو گیا

لرز رہا ہے قلم، انگلیاں لرزتی ہیں
بہت بڑی کوئی سچائی لکھنے والا ہوں

اخباروں میں اپنی مرضی کی خبریں کیا دیتے ہو؟
یہ تو دیکھو! شہر کی سب دیواروں پر کیا لکھا ہے؟

موت دکھلاتی ہے اک اور صداقت ہم کو
ہم سمجھتے تھے فقط زندگی سچ بولتی ہے

بوسیدگی اس شہر پہ یوں چھائی ہوئی ہے
جو چیز نئی بھی ہے، پُرانی نظر آئے

میں سمجھتا ہوں کہ یہ شعر انہوں نے عرب کی مجموعی صحرائی فضا کو سامنے رکھ کر کہا ہوگا۔ ورنہ سمندر کے کنارے رہنے والا شاعر اس کے موسم سے نا آشنا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک اور جگہ خود ہی اس سوال کا جواب بھی دے دیا ہے وہ کہتے ہیں:

دریا ہوں اور سمٹنے کی عادت نہیں مجھے
ساحل کے ساتھ میں نہیں ساحل ہے میرے ساتھ

یوں اُن کی ذات اجتماع میں گم نہیں ہوتی بلکہ وہ اجتماع کو ساتھ لئے محوِ سفر رہتی ہے۔ جغرافیائی ماحول کا اثر فطری طور پر فنکار کے فن پر کسی نہ کسی انداز سے ضرور پڑتا ہے۔ نسیم چونکہ ساحلِ سمندر کے قریب رہتے ہیں اس لیے بظاہر تو ساحل کا سا سکون اور طمانیت ان کی شخصیت میں نظر آتی ہے۔ لیکن غور کریں تو ان کے بطون میں گہرے سمندر کا تموج اور تلاطم صاف دکھائی دیتا ہے۔ جو اُن کی ذات کو تخلیقی سطح پہ ہر پل ہر آن تحریک اور سفر کے لیے بیتاب کیے رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے یہی ایک سچے صاحبِ فن کی پہچان ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسیم سحر کی غزل اور جہانِ فکر و فن کے نئے تناظر میں تازگی اور ندرت کی اہل ہے وہاں جذبے کی بے ساختگی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ احساس کی شدت اور حدت بھی اس میں موجود ہے اور یہ ساری صفات مل کر انہیں جدید اردو غزل کے ایک ایسے اہم شاعر کا پیکر عطا کرتی ہیں جس نے بلاشبہ اردو غزل کو فکر و فن کے نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ یہ نئے پہلو ان کے خیال اور ان کے خواب ہیں جو واقعی سب سے الگ ہیں۔ اور یہی انفرادیت انہیں اپنے معاصرین میں ایک نمایاں امتیاز عطا کرتی ہے۔

"کتنا مشکل ہے زندگی کرنا"

خاور اعجاز
(راولپنڈی)

مضمون نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر مولانا ابوسلمان شاہ جہان پوری کا ایک گُر مجھے مشفق خواجہ صاحب کے وسیلے سے معلوم ہُوا ہے جس میں مضمون نگاری کے ضمن میں معرفت کی ایک نہایت عمدہ بات کہی گئی ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر موصوف ابوالکلام آزاد کی صحافت یا کسی اور پہلو پر کبھی لکھتے ہیں تو مضمون کا آغاز حضرتِ آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے یا سقراط کے زہر کا پیالہ پینے سے کرتے ہیں اور پھر تاریخِ عالم کے تمام اہم واقعات بیان کرنے کے بعد مضمون کے آخری پیراگراف میں مولانا آزاد کا ذکر بھی کر دیتے ہیں"

جی تو چاہتا ہے کہ اس "نسخۂ کیمیا" پر عمل کرتے ہُوئے مَیں بھی حضرت آدمؑ یا سقراط نہ سہی کم از کم پانی پت کی لڑائی سے نسیمِ سحر کا تذکرہ شروع کروں کہ جہاں ہم ادب کی درجنوں قدیم روایات کو نبھاتے چلے جاتے ہیں یہ شاہ جہان پوری رسم اور سہی۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کو تو اگلے زمانے کے لوگوں سے واسطہ تھا جو بزرگوں کے سامنے جس پہلو سے بیٹھتے تھے اُسی سے اٹھ کر جاتے تھے مگر مجھے تو دنگا فساد کرنے والے "دانشوروں" کا سامنا ہے سو پانی پت کو چھوڑیے نسیمِ سحر کی بات پاکستان کی پیدائش سے آغاز کرتے ہیں کہ اُس کی عمر اِس سے کوئی تین چار برس ہی زیادہ ہوگی۔ پاکستان کو پیدا ہُوئے ابھی کوئی تیس سال ہی ہُوئے ہوں گے کہ نسیمِ سحر کے ہاں مجموعہ ہائے کلام کی تواتر سے ولادت کا آغاز ہو گیا۔ اس کے پہلوٹھی کے شعری مجموعے "پہلی اڑان" نے ۱۹۷۷ء میں جنم لیا لیکن اس کی یہ پہلی اڑان اس بلندی پر تھی کہ بقول شخصے خود شاعری کو وہاں پہنچنے میں ابھی دیر تھی۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے شعری مجموعوں کی پیدائش نے اسے بزرگوں کی لائن میں لگا دیا۔ لائن میں لگنا اس کی طبیعت سے دور کی بات تھی سو وہ مجھے عموماً قطار سے باہر ہی کھڑا ملا، قطار سے نکلا ہوا یا نکال دیا گیا ہوا۔ دراصل اس کے تن میں ایک بے چین روح رہتی ہے جو اُسے قطار کے اندر کھڑا رہنے دیتی ہے نہ باہر۔ اُس کی اب تک کی مصروفیات میں سب سے بڑی مصروفیت خود کو قطار سے الگ رکھنے کی کوشش ہے جس میں وہ اکثر کامیاب بھی رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ پریاں قطار اندر قطار کا مفہوم کھُلنے تک اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہنوں کے جمگھٹے میں بھی رہنا چاہتا ہے اور "فقیروں کا جمگھٹ گھڑی دو گھڑی۔۔ جبینیں تِری آستانے تِرے" کی حقیقت سے بھی واقف ہونا چاہتا ہے۔ دیکھیے اس کا وجدان آخرِ کار کس سمت میں اُس کی رہنمائی کرتا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہوگا کہ وہ ہم فقیروں میں آ بیٹھے تا کہ ہمیں شاہ جہان پوری نسخہ آزمانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اُردو دان طبقہ میں نسیمِ سحر ایک خوش گوار شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی یہ پہچان زیادہ تر غزل اور پھر نعت کے حوالے سے ہے لیکن اس نے حمد، سلام، منقبت، نظم، قطعہ، ہائیکو، ماہیا یعنی ہر مروجہ صنف میں دادِ سخن دی ہے حتیٰ کہ مزاحیہ شاعری سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ اس کے علاوہ نثری محاذ پر انگریزی سے اُردو تراجم کی ایک لمبی فہرست ہے، مختلف موضوعات پر کالم نگاری کا فریضہ بھی انجام دیا ہے، کتابوں کے دیباچے اور فلیپ بھی تحریر کیے ہیں، راول پنڈی/اسلام آباد میں ہونے والی تقریباً ہر تقریب کو رونق بخشی ہے نیز شہر اور ملک سے باہر بھی بسلسلۂ "ادب گردی" بہت سے مقامات پر دھماکے کیے ہیں۔ ادبی شخصیات سے ملاقاتوں کے لیے طویل و مختصر سفر کیے ہیں، خاندانی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان سب مصروفیات کے درمیان اپنے خالقِ حقیقی سے بھی صاحب سلامت رکھی ہے۔ مَیں حیران ہوتا ہُوں کہ اس کے باوجود اس کی داڑھی ترشی ہُوئی ہوتی ہے، سر کے رہے سہے بال خوبی سے جمے ہوتے ہیں، لباس بے شکن اور جوتا پالش ہوتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس نے اپنی زنبیل میں وقت کا کوئی بڑا ٹکڑا چھپا رکھا ہے جس کی قاشیں وہ دوسروں کی نظروں سے چھپا کے اپنے نظام الاوقات میں مِلا کر فالتو گھڑیاں بناتا رہتا ہے ورنہ عام لوگوں کی گنتی کے چوبیس گھنٹوں میں سے آدھے تو لمبی تان کے سونے میں ہی گذر جاتے ہیں۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد، جو اتفاق سے دو پیرا گراف پر محیط ہو گیا ہے، مَیں نسیمِ سحر کو کچھ دیر اپنی زنبیل کو ٹٹولنے کا موقع دے کر اس کی شاعری کی طرف آتا ہُوں۔ ۱۹۷۷ء میں اُس کا پہلا مجموعہ "پہلی اڑان" منظرِ عام پر آیا۔ اِس مجموعہ میں اُس نے اپنی لڑکپن کی شاعری کو محفوظ کیا ہے۔ لڑکپن مَیں نے دو وجوہات کی بنا پر کہا۔ پہلی تو یہ کہ اس میں موجود شاعری کا تعلّق عمر کے لحاظ سے نسیم کے لڑکپن کے دَور سے بنتا ہے جب انسان فاصلوں کی فصیلیں گِرا کر محبوب کے خطوں کی طرح خود محبوب کو بھی اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس زمانے کے یادگار ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ یہی وہ وقت ہے جب جذبات اپنی سچائی کی انتہائی بلندیوں پر ہوتے ہیں، بعد میں شاعر کا قد تو بلند ہو جاتا ہے لیکن جذبات کی سچائی مصلحتوں کا شکار ہو کر شاید سچائی رہ ہی نہیں جاتی تو اس کی بلندی کا کیا ذکر۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "پہلی اڑان" کے وقت اس کی شاعری بھی لڑکپن میں تھی جس کے نین نقش اچھے ہونے کے باوجود ابھی اس کی صورت میں وہ دل پذیری نہیں آئی تھی جو نوجوانی کی نشانی ہوتی ہے۔ اس دل پذیری کی ابتدا اس کے بعد کے دو مجموعوں "ہر بوند سمندر" اور "جگنو دِیے ستارے" سے ہوتی ہے جن میں رومان محض جذباتیت کی سطح سے اُٹھ کر شاعری کے در پر دستک دیتا ہُوا محسوس ہوتا ہے۔ ان مجموعوں میں اس کے موضوعاتِ عشق و محبت اپنی ترقی یافتہ شکل میں نظر آتے ہیں۔ یہاں آ کر سماج اور معاشرت کے دھارے بھی رومان کے دھاروں سے مِل کر ایک نئے دریا کی صورت اختیار کرنے

لگتے ہیں جسے عرفِ عام میں آشوبِ زمانہ کہا جاتا ہے۔نسیم کی اس مرحلہ سے آگے کی شاعری اسی دریا کی مختلف لہروں ہیں۔

نسیمِ سحر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔غزل کے خلاف ماضی کی طرح آج بھی اکناف واطراف سے آوازیں سنائی دے جاتی ہیں تاہم ہمیشہ کی طرح آج بھی بے شمار غزل گو اس صنف کو عزیز رکھتے ہیں اور اُردو شاعری کے ماتھے کا جھومر تصور کرتے ہیں۔نہ صرف اس لیے کہ اس میں ہماری تہذیب کی دھڑکنیں سنائی دے رہی ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اس سے ماضی کی سمتیں دریافت کرنے اور مستقبل کی رفتارِ ادب متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، لہٰذا بعض مغرب نوازوں اور نام نہاد ترقی پسندوں کی ہرزہ سرائی پر کان دھرنے کی بجائے غزل کی چاپ پر کان دھرے جائیں تو ذہن میں نئے سے نئے دریچے کھلنے کے امکان روشن رہتے ہیں۔ان دریچوں میں گفتگو کے جھروکے ہیں، تزکیہ وتحلیل کے روزن ہیں اور معانی ومفاہیم کے جھرنے بہہ رہے ہیں۔دوسری طرف اس امر سے بھی انکار نہیں کہ چند کم تر معیار کے سخن وروں نے غزل کو بھی کم ظرف بنادیا مگر کیا ایسا دوسری اصناف میں نہیں ہُوا، یقیناً ہُوا ہے۔لہٰذا قصور صنف کا تو نہ ہُوا اس کے برتنے والوں کا ہُوا۔میری گذارش کا مطلب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔مَیں یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ صنف چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی، کہنے والے چھوٹے یا بڑے ہوتے ہیں اور بڑائی فن وتجربہ کے معیار، زندگی سے معاملت اور شاعر کی قوتِ انعکاس پر منحصر ہوتی ہے۔

نسیمِ سحر کو غزل کے منظر نامے میں کہاں رکھا جا سکتا ہے اس کا تعین کرنے کے لیے غزل کے سفر کو دیکھنا پڑے گا۔ترقی پسند، حلقۂ اربابِ ذوق کے تحت کہی جانے والی اور بعد کی جدید غزل میں لگے بندھے اور خود ساختہ تہذیبی اور معاشرتی اصولوں میں جکڑی ہوئی زندگی کو آزاد کرانے اور کم دباؤ اور بنیادی احساسات کو پائیدار اور دائمی صورت دینے والے ماحول کی طرف مراجعت کا رویّہ نمایاں ملتا ہے۔یہ رجحان ہمارے معاصر ادب کے خصوصی امتیازات میں سے ایک ہے۔اس رجحان کے تحت تیز رفتاری، شور اور ظاہر پن کے خلاف ایک ردِعمل ملتا ہے جو عمومی انسانی رویّو ں میں بھی پایا جاتا ہے اور شعر کہنے والے خصوصی طبقے کے حصے میں بھی آیا ہے جسے جدید غزل گو شعرا نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنایا ہے۔شعری سطح پر اس کا اظہار، شہر کی پُر تصنع زندگی میں پائی جانے والی منفی اقدار پر براہِ راست تبصروں سے لے کر اُن کے مخفی پہلوؤں پر کی جانے والی تنقید تک میں ہوتا ہے۔نسیمِ سحر کی شعری بلوغت کا زمانہ بھی چونکہ یہی ہے اس لیے اُس کے ہاں بھی ایسے روّیوں کی بازگشت ملتی ہے جن میں شہر کے منفی اثرات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔کرّہ ارض پر انسانی زندگی کا آغاز چونکہ کھلے آسمان تلے ہُوا اس لیے میدانوں کی وسعت، سمندروں کی بیکرانی اور حدِّ نگاہ تک پھیلے ہُوئے قدرتی مناظر انسان کے محیطِ نظر میں رہے۔فطرت اپنے عالمِ جوبن میں اُس کے تصرّف میں رہی اور وہ خود قوانینِ فطرت سے اس درجہ ہم آہنگ رہا کہ فطرت ہی اُس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔پھر جس روز اُس نے پتّوں سے اپنا بدن ڈھانپا اور پتھر میں اپنے رہنے کے لیے جگہ تراشی اُسی روز سے اُس نے تہذیبی شکل اختیار کرنا شروع کی۔اس طرح وہ نیچر کے حلقۂ اثر سے نکل کر اپنی تہذیبی ضروریات کے دائرۂ اختیار میں آنے لگا۔جب وہ تنہا اور فطرت کے قریب تھا تو آسمان کے ستارے اُس کے ہمراز تھے، جب اُس نے قبیلوں اور گروہوں کی بود و باش اختیار کی تو دیواروں کے سائے اُس کا ملبوس ہُوئے۔پھر انہی دیواروں سے گاؤں اور قصبوں کی بنیاد پڑی اور انسان نے کھلے آسمان کی وحدت کو اپنی اپنی کھڑکیوں اور روشندانوں میں بانٹ لیا۔اُس نے سفر کا پہلا قدم یقیناً اپنے ذاتی تحفظ کے تحت اُٹھایا تھا لیکن بیسویں صدی تک آتے آتے یہ مسئلہ بالکل نیا رُخ اختیار کر گیا اور اب وہ اپنے ہی نظریۂ تحفظ کے ردِّعمل میں شہر اور اُس کی میکانکی زندگی میں حبس کی کیفیت محسوس کرنے لگا ہے اور دوبارہ اُسی فضا میں لوٹ جانے کا خواہاں ہے جو اُس کی زندگی کے کھوئے ہوئے اُفق اجاگر کردے۔

ورڈسورتھ نے ایسی ہی فضا کے بارے میں کہا تھا کہ ”اس حالت میں دل کے بنیادی جذبات کو بہتر زمین میسّر آتی ہے جس میں وہ پختگی اور بلوغ کو پہنچ سکتے ہیں جہاں پر کم دباؤ ہوتا ہے اور جہاں وہ زیادہ صاف اور زیادہ پُر زور زبان میں اپنا اظہار کر سکتے ہیں کیونکہ زندگی کی اس حالت میں ہمارے بنیادی احساسات زیادہ سادگی کی حالت میں ہوتے ہیں اور اس لیے زیادہ صحیح طور پر ان پر غور وفکر کیا جا سکتا ہے۔کیونکہ دیہی زندگی کے طور طریقے بنیادی احساسات کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اس لیے زیادہ آسانی سے سمجھے بھی جا سکتے ہیں اور زیادہ پائیدار بھی ہوتے ہیں اور آخر میں یہ کہ اس حالت میں انسان کے جذبات قدرت کی حسین اور دائمی صورتوں سے پیوستہ ہوتے ہیں“۔نسیمِ سحر بھی شہر کو ایک ایسے زنداں سے تعبیر کرتا ہے جس میں روشنی کا گذر نہیں، جس کی کثیف ہوا حبس زدہ ہے اور ابر کے ایک چھینٹے کو ترس رہی ہے۔اُس کے بعض اشعار اِس دَور میں انسان کے سب سے بڑے دشمن یعنی ”شہر“ کے مختلف روپ ہیں جہاں سیاسی دست درازیاں بھی ہیں اور معاشرتی چیرہ دستیاں بھی، زیردستوں کی کہانیاں بھی ہیں اور زبردستوں کے فسانے بھی۔

شہر کے شور میں کس کس کو سماعت کچھ
یہی کافی ہے اگر اپنی صدا آ جائے !

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ شہر کی موجودہ صورتِ حال کسی طرح بھی حسین اور دائمی احساسات کو جنم نہیں دے سکتی، نسیمِ سحر اپنے مستقبل کے شہرِ خواب کو آنکھوں میں بسائے ہوئے ہے۔اُسے یقین ہے کہ اہلِ نظر کی برگشتگی ذرا کم ہوئی تو اُس کے خوابوں کا شہر اسی صورتِ حال کے خمیر سے اُٹھے گا۔

اُس کے کلام میں شہری زندگی کے پیچیدہ روپ اور اُس پر اظہارِ رائے کے علاوہ جدید اردو شاعری کے دوسرے موضوعات کے ساتھ زیرِ سطح بہتی ہوئی درد بھری رومانوی لہر ایک عجیب سماں پیدا کر دیتی ہے۔پڑھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے وہ جذبوں کے سیلاب میں کھڑا ہے لیکن شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ ان منظروں میں اپنے رواں دواں اسلوب کی دردمندی بھر دیتا ہے اور قاری اُس کے

ترتیب دئے ہوئے مناظر اور ماحول کی دلکشی میں کھوسا جاتا ہے۔

میرا کمال یہ ہے کہ اپنی شکست میں
مَیں نے شکستِ ذات کو شامل نہیں کیا

پُوری بات بتانا مُشکل ہو شاید !
پھر بھی کوئی اِشارہ مجھ کو دے دینا

سخت مشکل ہے انتظار اُس کا !
ایک لمحہ ہے اِک صدی کی طرح

اُسے بس اک نظر دیکھا تھا مَیں نے' اور اِتنے میں
لب و رخسار اُس کے' اُس کی آنکھیں حِفظ کر لی ہیں

کیا یاد دلائیں اُسے پیمانِ وفا ہم ؟
یہ بات نسیم اتنی پُرانی بھی نہیں ہے !

وہ ختم قید کی میعاد بھی نہیں کرتا
مگر مَیں زحمتِ فریاد بھی نہیں کرتا

کرے وہ شاد ، توقّع کبھی نہیں رکھی
گلہ تو یہ ہے کہ ناشاد بھی نہیں کرتا !

مہکتا رہتا ہے ہر دم جو میری سانسوں میں
وہ آدمی تو مجھے یاد بھی نہیں کرتا !

اس کی شاعری کا ایک اور نمایاں وصف اُس کے اشعار کا حرکی پہلو ہے جو سفر کے ہمہ گیر احساس سے پیدا ہوتا ہے۔

بہتے ہُوئے پانی کے بہاؤ میں نہیں ہُوں
دریا کے سفر میں تو ہُوں' ناؤ میں نہیں ہُوں

تمام عُمر جیا کون زندگی کس کی ؟
کِیا تھا کس نے سفر اور نڈھال کون ہُوا ؟

نگاہ میں ہے یہ منظر جو شام ہونے کا
اِشارہ ہے یہ سفر کے تمام ہونے کا

سفر کی یہ کیفیت اُس کی ذات کے نہاں خانے سے اجتماعی شعور کی طرف ہے اور سیاسی اور معاشرتی محرومیوں کے ایک لامتناہی جنگل میں راستہ دکھاتی ہوئی کرن کا استعارہ اور اُس کے فنی اِرتقا کی علامت کے طور پر اُبھرتی ہے۔ اِس سفر میں مجھے وہ ایسا چشمہ لگتا ہے جو کسی نخلستان کی تلاش میں دشت در دشت سفر کر رہا ہو۔ ایسا دشت جس میں راستہ روکنے والے درخت، دوستی میں بجھے ہوئے تیر، زہریلی ہوائیں اور کھوکھلے لفظوں کے کانٹے ہیں۔ ان درختوں پر خود غرضی کے کڑوے کسیلے پھل اُگتے ہیں جن کا ذائقہ چکھنے پر وہ مجبور ہے۔ زہریلی ہواؤں کو روک نہیں سکتا کہ زندہ رہنے کے لئے اُسے سانس تو بہرحال لینا ہے۔

موت کو روز ملتوی کرنا
کتنا مشکل ہے زندگی کرنا !

زہر آلود کس قدر ہے فضا
سانس لینا ہے خودکشی کرنا

جدید اُردو شاعری کے دوسرے موضوعات میں دورِ حاضر کا ظاہری پن، مردہ پرستی کی روایت، بے سمت جذبے اور سرد مہری زمانہ اُس کے شعری منظر نامے میں اسلوب کی رنگینیاں بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اوپر مَیں نے کہا کہ نسیم سحر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔ نظم پر اس کی گرفت یکساں نہ سہی لیکن وہ اس صنفِ سخن کو بھی کم محبوب نہیں رکھتا۔ نسیم سحر کی نظموں میں عصرِ حاضر اپنی مانوس علامتوں اور اس کی ہنرمندانہ تخلیق کاری کے تناظر میں بھرپور معنی آفرینی کے ساتھ منکشف ہوتا ہے۔ نظم کے مضامین اُس کی غزل سے جدا ہیں۔ نظموں میں اُس نے زندگی کو جس فاصلے سے دیکھا ہے وہ اُس کی غزل کے ایمائی فاصلے سے کم ہے اور اُس کی نظر مسائلِ حیات پر غزل کی نسبت بہت بلا واسطہ ہے۔ اُس نے جدّت کو اپنا مسئلہ نہیں بنایا یہی وجہ ہے کہ اُس کے برتے ہوئے الفاظ سے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ سوچ کی تازگی ملتی ہے۔

''روشن دان میں چڑیا'' اور ''اک لطیف سرگوشی'' کے ناموں سے اس کی ہائیکو شاعری کے دو مجموعے اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ اس صنف میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ ہائیکو اردو ایوانِ ادب میں اب محض ایک تجربہ ہی نہیں رہی بلکہ قابلِ توجہ مزاج کے حامل ایسے امکان کا رُوپ اختیار کر گئی ہے جو ردوقبول کی حدود سے گزر کر ادبی روایت کے علاقہ میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ صنف اپنے ہمراہ برِصغیر کے مزاج میں سرایت کر جانے والے جراثیم کی جو کھیپ لے کر آئی تھی، پچھلے چند برسوں میں اُن کے اثرات نئی نسل کے حسّاس شعرا پر بڑی تیزی سے مرتب ہوئے ہیں۔ نسیم سحر کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے جنہیں اُردو ہائیکو کے تعارف اور فروغ کی صفِ اوّل میں جگہ پانے کا امتیاز اور افتخار حاصل ہُوا ہے۔

نسیم کی ہائیکو پڑھتے ہوئے شدّت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ خیال کے ساتھ ساتھ ہائیکو کی ہیئت میں بھی آزادی کا قائل ہے۔ اُس نے ہائیکو کی کلاسیکی ہیئت بھی اپنائی ہے اور بہت سی مروجہ اُردو بحروں میں بھی ہائیکو کہی ہیں۔ ہائیکو کے اجزائے ترکیبی میں تصرف کے ساتھ ساتھ اُس نے ہائیکو کے مضامین میں نہ صرف جاپانی ہائیکو کے بنیادی عناصر یعنی سورج، روشنی، درخت، پھول، موسم، خوشبو اور رنگوں سے استفادہ کیا اور برِصغیر کی شعری روایت سے آنسو، پیاس، ساحل، صحرا، غم اور ہجر کو ہائیکو میں سمویا بلکہ جدید عہد کے استعارے بھی اُس کے ہاں فراوانی سے دستیاب ہیں۔

برِصغیر میں ہائیکو کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اس کے مزاج کو سمجھے بغیر شعرا نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور بعض مخصوص اصناف کی موجودگی میں ان کے مضامین کو ہائیکو میں شامل کر کے ادبی حدود کی خلاف ورزی کے مرتکب ہُوئے ہیں جس کی قطعاً ضرورت تھی نہ گنجائش۔ مثلاً حمد، نعت کی موجودگی میں حمدیہ اور نعتیہ ہائیکو کہنے کی بھلا کیا تُک بنتی ہے۔ اس لحاظ سے تو غزلیہ ترائیلے اور سانٹی ماپیے بھی

لکھنے میں کوئی ہرج نہیں! مجھے ہائیکو کے ان نقاد حضرات سے سخت اختلاف ہوگا جو یہ کہیں کہ فلاں شاعر کی ہائیکو میں نظم کا تسلسل اور ماہیے کی سی چاشنی ملتی ہے یعنی شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں والی ہائیکو نہ ہائیکو ہے نہ نظم نہ ماہیا۔ نسیم کی ہائیکو بھی اس ساری صورتِ حال سے باہر تخلیق نہیں ہُوئیں، ان پر بھی کہیں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش موجود ہے لیکن مجموعی طور پر اس نے ہائیکو کی مشاہداتی پرت کو اپنی قوتِ متخیلہ سے explore کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

نعت ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ اظہار کو حدِ ادب کا پابند رکھنا از بس لازم ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ بعض عقیدت مند محبت کی رو میں نعت کو حمد کے قریب لے جاتے ہیں یا سادگی میں بعض لطیف پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متنازعہ موضوعات کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ نسیمِ سحر کی تازگیٔ فکر اور شگفتگیٔ خیال کا تو مَیں قائل رہا ہُوں لیکن نعت کی دشوار کیفیات سے گذرتے ہوئے اُس کے ذوق نے اس منزلِ شوق کو سر کرنے میں بھی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ بعض مقامات پر وہ سرشاری کے ایسے جذبوں سے ہمکنار ہُوا ہے جہاں اس کی نعت دل کو گداز اور ذہن کو روشن کرتی ہے۔

پاکستانی ادب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی نظم و نثر میں حضورﷺ کی وساطت سے اسلامی ریاست اور اسلامی تہذیب و تمدن کے حوالے اِسے دُنیا اور خصوصاً ہندوستانی ادب سے واضح طور پر الگ کرتے ہیں۔ ادب کی اس روایت نے جڑ تو ہندوستان میں ہی پکڑ لی تھی جب حالؔی نے مدوجزرِ اسلام لکھی اور محسن کاکوروی اور احمد رضا بریلوی نے نعت کے فروغ کو دوسری اصنافِ سخن پر ترجیح دی۔ ان ناموں کے عقب میں میر درد سے لے کے جامؔی، سعدؔی، رومؔی اور امیر خسروؔ جیسے بزرگوں کی موجودگی نعت کی روایت کو ہمارے اردگرد کے نزدیکی خطوں میں مستحکم کرتی نظر آتی ہے۔ دیکھا جائے تو نعت کی ابتدا قرآنِ کریم کے بعد نبی اکرمؐ کے قریبی احباب و اقربا سے ہوتی ہُوئی پہلی بار حسّان بن ثابتؓ جیسے شاعر کو منتقل ہوتی ہے اور یوں یہ سلسلۂ مدحِ رسول شعرا کو تفویض ہو جاتا ہے۔

ابھی مَیں نے پاکستانی ادب کی جس خصوصیت کا ذکر کیا اُس کا ایک Offshoot غزل کے اشعار اور نظم کے مسلسل مصرعوں میں نعتیہ آہنگ کا بتدریج ظہور ہے۔ اس طرزِ سخن کا آغاز اقبالؔ کی شاعری سے ہوتا ہے جس میں باقاعدہ نعت کے علاوہ متعدد شعری فن پاروں میں نعت کا آہنگ موجود ہے۔ اسے جدید شاعری کی ایک خصوصیت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد مختلف اصنافِ سخن میں نعتیہ آہنگ کی روایت تو اپنی جگہ موجود رہی لیکن نعت نے تقریباً ہر قابلِ ذکر شاعر کے ہاں مناسب جگہ پائی اور نعتیہ مجموعہ ہائے کلام کی علاحدہ اشاعت نے رواج پایا اور یوں نعت باقاعدہ ایک صنفِ سخن کا درجہ اختیار کر گئی۔ شعرا نے بطورِ خاص اپنی کاوشوں میں نعت کو ہنرمندیٔ اظہار کا ذریعہ بنایا جس کے نتیجے میں محض میلاد کے موقعوں پر وردِ زبان ہونے والے اشعار کو شعوری طور پر نعتیہ مشاعروں، اور گلدستوں یا میلاد ناموں میں شائع ہونے والی منظومات کو نعتیہ مجموعہ ہائے کلام کی زینت بنانے کا عمل ایک نمایاں رجحان کے طور پر سامنے آیا۔ اس رجحان کے زیرِ اثر ''مصطفیٰ جانِ رحمت''، ''یا نبی سلام علیک''، ''سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی'' اور ''سلام اے آمنہ کے لال'' جیسے ادب پارے مقبولِ خاص و عام ہُوئے۔ اس پس منظر سے مقصود اُس تخلیقی عمل کے ارتقائی مراحل کا ایک خاکہ پیش کرنا تھا جو فخرِ کونینؐ کے حضور محبت کے جذبات سے لبریز اشعار کا نذرانۂ عقیدت پیش کرنے والوں نے اپنی اپنی فکری روشنی کے جلو میں طے کیا۔

نسیمِ سحرؔ بھی اِسی قافلے کا مسافر ہے۔ اُس نے کاروانِ نعت میں شمولیت کا اعلان تو اپنے پہلے نعتیہ مجموعے ''یہ جو سلسلے ہیں کلام کے'' کی اشاعت سے کیا تھا جو ۱۹۹۶ء میں منظرِ عام پر آیا لیکن گذشتہ تقریباً دو دہائیوں کے دوران اُس کی نعت میں صفائیٔ بیان، بلندیٔ خیال اور فکری ارتقا نے راہ پائی ہے۔ نسیمؔ پچھلے پچاس برس سے شعر کہہ رہا ہے۔ اس لحاظ سے اُسے کہنہ مشق کہہ لینے میں کوئی حرج نہیں تاہم نعت جس نزاکتِ اظہار کی طالب ہے میرے خیال میں اسے اظہار کا وہ قرینہ ۱۹۹۶ء کے بعد ہی ودیعت ہُوا اور اب اس کے نعتیہ لہجے میں بتدریج انفرادیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ اب آ کر یہ لگتا ہے کہ اسے اسلوب کی وہ متانت میسر آنے لگی ہے جس کو ادب کے مسلمہ معیارات سے علاقہ ہے اور جو شعر کو اتنا باثروت بنا سکتی ہے کہ اسے نعت کے زمرے میں داخل کیا جا سکے۔ نعت کے سرمائے میں اضافے کے لیے شاعر کو جس توانا آہنگ اور جذبہ کی شعلہ کاری درکار ہو سکتی ہے وہ اب نسیمؔ کی دسترس میں آنے لگی ہے، سعودی عرب میں طویل قیام نے اس کے تاریخی شعور کو ان نعت گوؤں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ اعتماد بنایا ہے جن کو نسیمؔ کی طرح اُس خطۂ پاک میں اُس جتنے قیام کا موقع میسر نہیں آ سکا۔ اس قیام کے دوران اسے اپنے ادراک کی حدیں وسیع کرنے کے مواقع ملے جس سے اُس نے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور نعت کے حرفِ شیریں کو آبِ زم زم سے دھو کے صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا۔ میرے خیال کے مطابق اس نے اپنی پوری تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نعت کہی ہے لیکن اگر کہیں عجزِ اظہار کا گمان گذرتا ہے تو اسے زبان کی نارسائی قرار دیا جا سکتا ہے ورنہ قلبی طور پر نسیمؔ نبی اکرمؐ سے انس و محبت کے مرحلہ میں ہے۔ وہ نعت گوئی کے تقاضوں کو بخوبی نبھا رہا ہے پھر بھی مَیں اس سے توقع کرتا ہُوں کہ وہ اپنے تجربات کی بوقلمونی سے اس صنف کی دلکشی میں مزید اضافہ کا سبب بنے گا۔

مجھے ذاتی طور پر نسیمِ سحرؔ کے اشعار میں اُوپر کی طرف اُٹھتی ہوئی ایک لہر نے زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہ لہر دنیا کے ماورا دیکھتی ہوئی آنکھ کا زاویہ ہے جو روح کی ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ چند مثالیں آپ بھی دیکھیں:

وہی منظر تھا کسی شامِ غریباں ایسا!
شبِ تنہائی مجھے ماہِ مُحرّم سی لگی

زمانہ ہے جوابؔ میرا مخالف، اس پہ حیرت کیا؟
مری پرواز اُونچی تھی تو پھر ایسا تو ہونا تھا!

آندھیوں سے ڈرے ہوئے پنچھی
آشیانے بدلتے رہتے ہیں
زندگی کی سزا ملی ہے ہمیں
قید خانے بدلتے رہتے ہیں
ماضی کو زندہ کرنا جو ممکن نہیں نسیم
واپس تو عہدِ حال میں آ جانا چاہیے
کوئی منظر حدِ اِدراک میں آتا ہی نہ تھا
پھر ترے دھیان کی اک شمع جلالی مَیں نے
آزماتے نہیں جو تُم مُجھ کو
آزمانے سے کم نہیں یہ بھی
پھر اُس نے دیکھا ہی کیا ہے نسیم جس نے کبھی
تعیّنات کی حد سے پَرے نہیں دیکھا
اُس کی چاہت میں عجب حال ہُوا ہے میرا!
ایک چنگاری نے کیا آگ لگائی ہوئی ہے!
نسیم آج کوئی یاد آ رہا ہے بہت!
سو آج مجھ سے نہیں کوئی کام ہونے کا!
یہ سُن لیا نا کہ وہ کوچ کر گیا یاں سے
تو اب نسیمِ سحر کا خیال آیا تمہیں!
جو یادِ یار سے گُفت و شُنید کر لی ہے
تو گویا پھول سے خوشبو کشید کر لی ہے!
جچا ہے اب کہیں جا کر نسیم جامۂ زیست
کہیں کہیں سے جو قطع و بُرید کر لی ہے
یہ پیراہن پُرانا ہو گیا ہے
بدن پہنے زمانہ ہو گیا ہے
قفس کا نام اب تبدیل کر دیں!
یہی جب آشیانہ ہو گیا ہے

اس آخری شعر کے کئی شیڈ ہیں۔ایک تو یہی کہ قفس میں رہتے ہُوئے اتنا عرصہ بیت گیا کہ آشیانہ لگنے لگا ہے۔دوسرا یہ کہ ہم نے اسے اتنا بنا سنوار لیا ہے کہ اب یہ قفس نہیں رہا آشیانہ ہو گیا ہے۔مجھے اس دوسرے مفہوم نے متاثر کیا ہے۔یہ تہذیبی معانی بھی دے رہا ہے، بود و باش کی سطح پر بھی تفہیم کراتا ہے اور غزل کی صنف میں مثبت تبدیلیوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔مجھے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ غزل کو قفس سے تعبیر کرنے والے اس کے آشیانہ ہو جانے سے بے خبر ہیں۔مَیں قفس کو آشیانہ میں تبدیل کر دینے میں نسیمِ سحر کی خدمات کو سراہتے ہُوئے اسے اس منظر نامے کے نمایاں قلم کاروں میں جگہ دوں گا۔

☆

حجازِ مقدس

1: یہاں پانی مہنگا اور تیل سستا ہے۔
2: یہاں کے راستوں کی معلومات مردوں سے زیادہ عورتوں کو ہیں، اور یہاں پر مکمل خریداری عورتیں ہی کرتی ہیں، مگر پردے میں رہ کر۔
3: یہاں کی آبادی 4 کروڑ ہے اور کاریں 9 کروڑ سے بھی زیادہ ہیں۔
4: مکہ شہر کا کوڑا شہر سے 70km دور پہاڑیوں میں دبایا جاتا ہے۔
5: یہاں کا زم زم پورے سال اور پوری دنیا میں جاتا ہے، اور یہاں بھی پورے مکہ اور پورے سعودیہ میں استعمال ہوتا ہے، اور الحمدللہ آج تک کبھی کم نہیں ہوا۔
6: صرف مکہ میں ایک دن میں 3 لاکھ مرغ کی کھپت ہوتی ہے۔
7: مکہ کے اندر کبھی باہمی جھگڑا نہیں ہوتا ہے۔
8: سعودیہ میں تقریباً 30 لاکھ بھارتی، 18 لاکھ پاکستانی، 16 لاکھ بنگلہ دیشی، 4 لاکھ مصری، 1 لاکھ یمنی اور 3 ملین دیگر ممالک کے لوگ کام کرتے ہیں،
سوچیں اللہ تعالیٰ یہاں سے کتنے لوگوں کو رزق فراہم کرتا ہے اور ان کے گھروں کو شاد و آباد رکھا ہوا ہے۔
9: صرف مکہ میں 70 لاکھ AC استعمال ہوتے ہیں۔
10: یہاں کھجور کے سوا کوئی فصل نہیں نکلتی، پھر بھی دنیا کی ہر ایک چیز، پھل، سبزی وغیرہ ملتی ہے اور ہر موسم یہاں پر پکتی ہے۔
11: یہاں مکہ میں 200 کوالٹی کی کھجور پکتی ہے اور ایک ایسی کھجور بھی ہے، جس میں ہڈی یا ہارڈ کل (گٹھلی) ہی نہیں۔
12: مکہ کے اندر کوئی بھی چیز لوکل یا ڈپلیکیٹ نہیں بکتی، یہاں تک کے دوائی بھی۔
13: پورے سعودی عرب میں کوئی دریا یا تالاب نہیں ہے، پھر بھی یہاں پانی کی کوئی کمی نہیں ہے۔
14: مکہ میں کوئی پاور لائن باہر نہیں، تمام زمین کے اندر ہی ہیں۔
15: پورے مکہ میں کوئی نالہ یا نالی نہیں ہے۔
16: دنیا کا بہترین کپڑا یہاں بکتا ہے، جبکہ بنتا نہیں۔
17: یہاں کی حکومت ہر پڑھنے والے بچے کو 600 سے 800 ریال ماہانہ وظیفہ دیتی ہے۔
18: یہاں دھوکا نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔
19: یہاں ترقیاتی کام کے لیئے جو پیسہ حکومت سے ملتا ہے، وہ پورا کا پورا خرچ کیا جاتا ہے۔
20: یہاں سرسوں کے تیل کی کوئی اوقات نہیں، پر بکتا تو ہے، یہاں سورج مُکھی اور مکئی کا تیل کھایا جاتا ہے۔

"مسند نشیں"

(جناب نسیم سحر کے نظمیہ کلام کی سوغات)

شاہد انوار (کراچی)

نظم معریٰ

"نمی دانم چہ منزل بود، جائے کہ من بودم"

مولانا جلال الدین رومی

مُجھے آیا نہیں اب تک یقیں، کل شب جہاں مَیں تھا
نہ پوچھو کون تھا مسند نشیں، کل شب جہاں مَیں تھا

محبّت ہی محبّت تھی، بڑی پُر نُور صورت تھی
سراپا تھا حسین و دِل نشیں، کل شب جہاں مَیں تھا

بیاں کیسے کروں جو اُس کے لہجے میں حلاوت تھی
سخن تھے انگبیں ہی انگبیں، کل شب جہاں مَیں تھا

زکاتِ فکر و دانش کی سماعت ، اور پھر ہر سُو
صدائے آفریں صد آفریں، کل شب جہاں مَیں تھا

گماں جتنے تھے میرے ، سب وہیں پر دفن کر آیا
کہ مستحکم ہوئے میرے یقیں، کل شب جہاں مَیں تھا

بُلاتا آسماں بھی گر ، تو مَیں اِنکار کر دیتا
کہ رشکِ آسماں تھی وُہ زمیں، کل شب جہاں مَیں تھا

جہاں مَیں تھا وہاں تو پَر فرشتوں کے بھی جلتے تھے
مجھے کچھ تابِ گویائی نہیں، کل شب جہاں مَیں تھا

یہ لگتا تھا کہ جیسے میرِ محفل پیرِ رومی ہیں
کہ ہیں اقبالؔ اُن کے ہم نشیں، کل شب جہاں مَیں تھا

کھُلی جب آنکھ تو اب مَیں کفِ افسوس ملتا ہوں
وہیں موجود اب مَیں کیوں نہیں، کل شب جہاں مَیں تھا

نسیم اب التجائیں کر رہا ہوں بیتے لمحوں سے
مجھے اے کاش لے جائیں وہیں کل شب جہاں میں تھا

- آزاد نظم -

زوال

اس بستی کی ویرانی سے
وہ شیش محل ہے دُور بہت
پر اُس بستی کی ویرانی
اُس شیش محل پر چھائی ہے
وہ بام و در زنگ آلودہ
اُن دیواروں پر کائی ہے!

پر جانے کیسے دیکھی ہے
اک اُجڑے شخص کی آنکھوں نے
اُس شیش محل کی بوسیدہ، بے رونق بارہ دریوں میں
اُس حسن کی اک پرچھائیں سی
ملتا ہے فقط جو پریوں میں
یا خواب کے رنگیں لمحوں میں
یا سبز طلسمی قریوں میں
یا محبوبہ کی آنکھوں میں!

اُس اجڑے شخص کی آنکھوں نے
جو شیش محل میں دیکھا ہے
وہ آیندہ ہونے والا ہے
یا گزرے کل میں دیکھا ہے؟
اک خواب ہے یا تعبیر ہے وہ؟
سچ مچ کا وہ کوئی منظر ہے
یا خواہش کی تصویر ہے وہ؟
ہم شیش محل ہوں یا آنکھیں
کیا اپنی بھی تقدیر ہے وہ؟

کیا اُس نے جو کچھ بھی دیکھا ہے
اک ردِعمل میں دیکھا ہے
جو شیش محل میں دیکھا ہے؟

رباعی

غنچہ تری چاہت کا چٹک جاتا ہے
اور گلشنِ احساس مہک جاتا ہے
کیا سوچ کے جانے مِرا رہوارِ خیال
اِک وہم کے صحرا میں بھٹک جاتا ہے

ہائیکو

سردی کا موسم
اور زمیں کی قسمت میں
برف کی اک چادر!

کیوں کھولوں یہ راز
موسمِ گل میں سن لی ہے
پت جھڑ کی آواز

پیاسی مرغابی
دیکھ رہی ہے حیرت سے
جھیل کی بے آبی

پیاسی چڑیا نے
آگ میں جلتے ذرّوں کو
دریا سمجھا ہے

کیڑے کی دُنیا
ایک لکیر بنانے تک
اور مَر جانے تک !

عُمر گزرتی جاتی ہے
کوئلے بجھتے جاتے ہیں
راکھ بکھرتی جاتی ہے

- منقبتیہ قطعہ -

علم کا دروازہ

اُن ﷺ کے فرمان پہ تشکیک کی جرأت کس کو؟
اُن ﷺ کا فرمان، علی علم کا دروازہ ہیں
اہلِ ایمان پہ لازم ہے، بنا لیں اِس کو
جزوِ ایمان، علی علم کا دروازہ

سہ سطری

انگارہ

یہ جو ہاتھوں میں دہکتا ہوا انگارہ ہے
پھول سے شخص نے رکھا ہے، سو اِس نسبت سے
پھول کی طرح مہکتا ہوا انگارہ ہے

گلاب

دُور صحرا میں اِک سراب کا پھول
ایسا سرخ، اور ایسا خوشبودار !
جیسے باغیچے میں گلاب کا پھول

ماہیے

لسّی کا پیالہ ہے
مشروب ہے گاؤں کا
چاہت کا حوالہ ہے

سَتّو ہی پلا دیتی
مہمان گیا تھا مَیں
نظریں تو مِلا لیتی!

ترویٰنی

خوشبو بھینی بھینی ہے
ہائیکو سے یکسر ہٹ کر
یہ میری ترویٰنی ہے

''وقت سے آگے کی زباں''

نسیم سحر

یارِ عزیز جنید آزر کی شاعری پر کچھ کہنا میرے لیے انتہائی مشکل ثابت ہوا ہے۔ کئی بار کسی نہ کسی زاویے سے اس پر کچھ لکھنا شروع کیا مگر دل کو تسلّی نہ ہوئی اور یہی احساس ہوا کہ اس زاویے سے جنید آزر کی شاعری پر اظہارِ خیال کرنا اسے ایک چھوٹے دائرے میں محدود کرنے کی ناکام کوشش ہوگا۔ جب اس نے اپنی کتاب ''کشف'' کا مسودہ مجھے دیا تو میں نے ایک بار نہیں، متعدد مرتبہ اس کی تمام غزلوں کی خواندگی کی اور ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہت اچھا شعر نظر آ گیا جس پر بات ہو سکتی تھی، عموماً مسودوں میں اچھے اشعار کی نشان دہی جلد ہو جاتی ہے، مگر جنید آزر کی رنگا رنگ اور تخلیقیت سے بھرپور غزلیں جتنی بار پڑھیں ہر غزل میں سے کچھ مزید شعر نشان زد کرنے پر مجبور ہو گیا اور یقین کریں ایک وقت وہ آیا کہ کچھ شعروں کے سوا تقریباً سبھی غزلوں کے سب اشعار نشان زد ہو گئے۔ اب بتایئے بندہ ایسی صورتِ حال میں کیا کرے جب کہ میں کوئی تنقید نگار بھی نہیں ہوں اور تنقیدی اصطلاحوں میں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں جانتا بس محبوبۂ غزل کا عاشق ہوں، غزل پرست ہوں اور اچھی غزل کہنے والے سے بھی عشق کرنے لگتا ہوں۔ غزل کے اچھے شعر مجھے ایک نشاطیہ کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جنید آزر کی اس کتاب کی زیادہ تر غزلوں نے مجھے جس کیف و سرور اور جس جمالیاتی و فکری لذّت سے ہمکنار کیا، یہ سطور قارئین کو بھی اس میں شامل کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اس کی شاعری کا محاکمہ کرنا میرا مقصود نہیں۔

مشاعروں میں اکثر شعراء کی طرح جنید آزر بھی اپنی دو تین چنیدہ غزلیں ہی سنانے پر اکتفا کرتا ہے جس سے تا حال اس کے سامعین کو اس کی شاعری کے وسیع تر کینوس پر نگاہ ڈالنے کا موقع نہیں ملا، وہ ادبی جرائد میں بھی کم کم دکھائی دیتا ہے۔ اس کی غزلوں کا اوّلیں مجموعہ ''کاغذ کی راکھ'' کے عنوان سے ۱۹۹۸ء میں اور دوسرا ''اشارہ'' کے عنوان سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کچھ ایسا ہے کہ جنید آزر کا درویشانہ مزاج اسے شہرت کے لیے مروّجہ حربوں سے گریز پر مائل رکھتا ہے اور یہی آج کے شعری منظر نامے پر اس کی ''اعلانیہ'' موجودگی کی راہ میں حائل ہے ورنہ میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کی معیاری اور فنّی رچاؤ سے مزیّن شاعری جو بہت سے اَن چھوئے موضوعات کا احاطہ ایک نئے اسلوب میں کرتی ہے، اسے اُن بہت سے دیگر شعراء سے بلند تر مقام دے چکی ہوتی جو اس کے مقابلے کا معیاری شعر نہ کہہ کر بھی ادبی منظر نامے پر چھائے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے تیسرے مجموعے کی اشاعت کے بعد اہلِ نظر اس کے شعری قد و قامت کا درست اندازہ لگا سکیں گے۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں وہ بجا طور پر اپنے عہد کے نقاد اور قلمکار سے گلہ مند ہے:

مرا اعزاز۔۔ مجھ کو دی سرشتِ خوش قرینہ
مرا یہ سانحہ۔۔ میں بے قرینوں میں پڑا ہوں

آج کل کی شاعری میں ظفر اقبال کے علاوہ بھی ہمارے کچھ اچھے بھلے اور اچھی غزل کہنے والے شعراء کو لسانی اور لفظی توڑ پھوڑ کا شوق چرایا ہے جسے وہ غزل کی صنف کو وسعت دینے کی خوش فہمی میں نادانستہ طور پر غزل کو ''ناغزل'' کی جانب لے جا رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لفظوں کی بے معنی توڑ پھوڑ کر کے ''غزل بنانے والے'' کئی غزل گو شعراء اچھی غزل کے معیاری اور مروّجہ ہیئتی منظر نامے سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ دوسری اصنافِ شعری میں چاہے ایسی توڑ پھوڑ کو کسی حد تک قبولیت مل بھی گئی ہو مگر غزل نے اپنے سانچے اور ساخت میں ایسی ''گستاخی'' کبھی برداشت نہیں کی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غزل کی ہیئت میں موجودہ لغت اور لفظی سانچوں کے اندر رہ کر اتنا کچھ کہنے کی گنجائش ہے کہ اسے کچھ اور مستعار لینے کی ضرورت ہی نہیں۔ جنید آزر کی غزلوں کا مزاج، اسلوب، موضوعات، لفظیات سبھی کچھ اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ غزل کی موجودہ ہیئت بھرپور انداز میں اظہار کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس مجموعے میں شامل جنید آزر کی غزلیں یکجا دیکھنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جنید آزر نے غزل کے معروف دائرے میں رہ کر بھی دائرے سے باہر کی شاعری کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، اس کی شاعری اکہرے مفاہیم کی شاعری نہیں ہے اور زیادہ تر شعروں میں اس نے نئے مضامین اور موضوعات کو بڑی تخلیقی ذہانت سے قلمبند کیا ہے۔ جو سنجیدگی اور جو وقار اس کی شخصیت میں ہے وہی اس کی شاعری میں بھی ہے۔ خوش لباسی اور خوش مزاجی اس کی شخصیت کا حصہ ہے اور غزل کو بھی وہ اسی انداز میں خوش لباسی کا پیرہن دیتا ہے۔ اس نے جمالیاتی اور فکری سطح پر غزل کو مزید وقار اور وسعت عطا کی ہے۔ بھرپور انداز میں سلیقے اور قرینے سے مصرع کہنا اس پر ختم ہے اور اس کی شاعری میں قاری اور سامع کو واضح طور پر ایک الگ ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کی تفکّر اور حسنِ اسلوب سے مزیّن شعریت کا ڈھب ایسا ہے کہ وہ اپنے ہم عصر شعراء بلکہ اکثر اپنے سے سینیئر شعراء سے بھی آگے جا کر بات کرتا ہے۔ کچھ اشعار میں تو وہ منظر کی ایسی فنکاری سے تجسیم کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ذرا اس غزل میں دیکھیں کہ اس نے ردیف ''پر اُٹھا'' کو کس قدر نئے مفاہیم اور زاویوں سے برتا ہے:

میں دیکھنے لگا ہوں خلاؤں کے اس طرف
اِک اَور آسمان مری آنکھ پر اُٹھا
یہ جست میں نے تیری ہی ترغیب پر بھری
لازم ہے اب یہ تجھ پہ، مرے بال و پَر اُٹھا
پیشانیِ قلم پہ اسیری کی مہر ہے
شوقِ شرف میں تہمتِ کارِ ہُنر اُٹھا

اس کی شاعری میں ایک قلندرانہ اور مجنونانہ انداز بھی ہے، اور نئی لفظی تراکیب اور ایک الگ سوچ کا اظہار بھی۔ اس کی بہت سی غزلوں میں سے نمونے کے طور پر ایک غزل کے یہ تین اشعار دیکھیے:

ذرا سی دیر ترا ہات ہات میں آیا
میں رقص کرتا ہوا اپنی ذات میں آیا
جمود ٹوٹ گیا یک بیک سمندر کا
حنوط برف کا خطّہ حیات میں آیا
ترا ہی ذکر رہا شب کے شامیانے میں
اسی کے ساتھ میں دن کی قنات میں آیا

جنید آزر کی شاعری میں تجسیم اور امیجری بڑی نمایاں ہے جو اس کی تخلیقی زرخیزی اور جمالیات و تفکر کے امتزاج کا ثبوت ہے۔ اس کی شاعری پر اپنے کسی سینیئر یا ہم عصر شاعر کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے انفرادی انداز سے شعر کہتا ہے۔ امیجری کے یہ بولتے ہوئے شعر ملاحظہ ہوں:

بھاتی نہیں ہے مجھ کو سمندر کی یہ ادا
ساحل پہ پھینک جاتا ہے لہریں مری ہوئی
انجامِ دید ہے یہ بگولوں کے رقص کا
لوٹا ہوں لے کے ریت سے آنکھیں بھری ہوئی

ایک اچھا شاعر ہمیشہ نئی نئی ردیفوں میں شعر کہنے کی کوشش کرتا ہے جن میں نئی بات اور نیا مضمون باندھنا اس کے لیے آزمائش بھی ہوتا ہے اور خوشگوار تجربہ بھی۔ جنید آزر کی اکثر غزلوں میں یہ التزام کیا گیا ہے، قافیوں کو ردیف کے ساتھ عمدہ انداز میں پیوست کرنے کی ایک بہت ہی عمدہ مثال اُس کی اُس غزل میں دیکھی جا سکتی ہے جس کا مطلع ہے:

تخلیق کر کے پھر نئے خورشیدِ روز و شب
کرنا پڑے گی کیا مجھے تجدیدِ روز و شب

طوالت کے خوف سے یہاں اس غزل کے مزید شعر درج نہیں کر رہا تاہم اس میں روز و شب کی ردیف کے ساتھ جس عمدہ انداز میں تردید، تولید، تسوید، صنادید، تمہید، تقلید، امید، تنقید، تائید جیسے قافیے باندھے گئے ہیں وہ اپنی جگہ جنید آزر کی ہنرکاری اور لفظی دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کی دو اور غزلوں کے مطلع دیکھیے:

دیدہ و لب سے الجھتی نہ جو حیرانیِ عمر
دے بھی سکتا تھا تحیر مجھے آسانیِ عمر
رکھتا ہے میرے دن پہ قلم کو کبِ قدیم
میراث میں ملی ہے مجھے اک شبِ قدیم

اِسی طرح کسی نئے اور اچھوتے زاویے سے بات کرنا بھی جنید آزر پر ختم ہے:

یہ حوصلہ تھا جو مجھ کو اُڑا کے لے آیا
کہاں تھا دھیان مرا ٹوٹتے پَروں کی طرف
پہلے مری فنا پہ لیے میرے دستخط
تب جا کے ممکنات میں رکھا گیا مجھے

شعری جمالیات کا رنگ اس کی شاعری کو جس طرح سنوارتا ہے اس کی ایک مثال دیکھیں:

یہ روشنائی جو ابھری ہے میرے لفظوں میں
کسی کی آنکھ سے کاجل دوات میں آیا

اِسی طرح اس کی اِس غزل میں طویل ردیف 'میں نے دیکھا نہیں' کے ساتھ کسی حد تک غیر مانوس قافیوں کے استعمال نے تو حسن پیدا کیا ہی ہے مگر اس غزل میں ایک اور کمال جنید آزر نے یہ دکھایا ہے کہ مصرعوں کے اندر بھی صوتی آہنگ اُجاگر کرنے کے لیے ہر شعر کے پہلے مصرعے کے اندر بھی قافیے کا اہتمام کیا ہے۔ پہلے اس کی غزل کا مطلع دیکھیے، پھر آگے چلتے ہیں:

کوئی آسیب تھا میری آنکھوں سے لف، میں نے دیکھا نہیں
بھول کر بھی کبھی آئنے کی طرف میں نے دیکھا نہیں

اب اسی غزل کے چند اشعار کے کچھ مفرد مصرعے ان کے اندر موجود صوتی آہنگ سے لطف اندوز ہونے کے لیے:

☆ میرا غم جب خرد کے حوالوں میں تھا، میں اجالوں میں تھا
☆ کوئی امید، کوئی وسیلہ نہ تھا، کوئی حیلہ نہ تھا
☆ حرفِ کُن جب کسی کی سماعت میں تھا، استطاعت میں تھا
☆ جس گھڑی دوست آنکھوں کے گھیرے میں تھا، میں اندھیرے میں تھا

جنید آزر نے کچھ مشکل بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں جو اس کی وسعتِ مطالعہ اور فن پر دسترس کا پتہ دیتی ہیں:

آ ذرا کھل کے سامنے گردِ حجاب سے نکل
رنگ کا پیرہن پہن، بوئے گلاب سے نکل

جنید آزر نے غالباً مشاعروں کی مجبوری کے تحت کچھ معروف زمینوں میں بھی طرحی غزلیں کہی ہیں مگر یہاں بھی اس نے یہ کمال دکھایا ہے کہ مکھی پر مکھی نہیں ماری، ان پامال زمینوں میں بھی ایسے انداز سے شعر کہے ہیں کہ زمین ازسرِ نَو سرسبز و شاداب ہو گئی۔ ایک معروف اور بڑی حد تک پامال زمین میں اس کی یہ غزل اس کی فنی ریاضت کا پتہ دیتی ہے:

میں تہذیبِ محبت کی تر و تازہ روایت ہوں
مری دستار سے حرمت کی تابانی نہیں جاتی
عجب یہ ہے کہ سارا باغ خوشبو کو ترستا ہے
مگر منظر سے رنگوں کی فراوانی نہیں جاتی

جنید آزر غزل میں ضرورت سے زیادہ شعر کہنے کا قائل نہیں، تاہم

کہیں کہیں جب اس پر آمد کا زور غالب ہوتا ہے تو اس کی غزل مروّجہ اشعار کی تعداد سے بھی تجاوز کر جاتی ہے اور یہ کوئی جرم نہیں، اگر غزل کسی شاعر کو اپنی آمد کے تحت نئے نئے موضوعات پر کہنے پر مجبور کرتی ہے تو شاعر کو شاید یہ حق بھی نہیں کہ اس کا راستہ روکے۔ جنید آزر نے جن چند غزلوں میں معمول سے ہٹ کر کچھ زیادہ شعر بھی کہے ہیں تو اُن میں کوئی شعر بھرتی کا نظر نہیں آتا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، جنید آزر نے غزل کے سانچے میں رہ کر اور لفظوں کو بگاڑے بغیر بھی کچھ شعروں میں منظر کو بڑی کامیابی کے ساتھ تجسیم کر دیا ہے۔ اُس کے اِس ہنر کی مثالیں اُس کی غزلوں میں جا بجا بکھری پڑی ہیں جنہیں یہاں دہرانے کی بجائے اس میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جنید آزر نے نئی نئی تراکیب بھی شعری لفظیات کا حصہ بنائی ہیں اور اس کی غزلوں میں ایسی نئی تراکیب کی کثرت دیکھ کر اس کی فنی ریاضت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، یقیناً اس سے پہلے کسی شاعر کی غزلوں میں ایسی تراکیب نظر سے نہیں گزریں، جیسے زانوئے حسرت، چوبِ فلک، قیدِ کتاب، قریۂ آب، غلافِ صبح، شگافِ صبح، چوبِ قدیمی، شعلۂ تخلیقِ ہنر، تخمِ امید، نشانِ صرفِ ہوس، شغلِ دُعا، آبِ تحیّر، بَر بریدہ تن، صبر کی زنبیل، شب دان، خواہشِ آزار، صبر کی آیت، خوئے قناعت، برجِ نحوست۔ واضح رہے کہ نئے الفاظ و تراکیب کا بذاتِ خود استعمال اتنا بڑا کمال نہیں، مگر انہیں ایک ایسے سلیقے اور انداز سے غزل کے مصرعے یا شعر کا حصہ بنا دینا کہ ایک منظر نئی شکل و صورت میں تجسیم ہو کر سامنے آجائے، ایسا کمال ہے جو مسلسل فنی ریاضت اور مطالعے اور تفکّر کی گہرائی کے بغیر نصیب نہیں ہوتا۔ جنید آزر کے ہاں جدید عصری حسیّت اور اس کا انوکھا اظہار نمایاں ہے اور اس پر طرفہ نئی ردیفوں کا فطری استعمال اسے موجودہ شعری منظر نامے پر انفرادیت سے ہمکنار کرتا ہے:

ہوا پر رہگزر کا واہمہ تھا
مجھے اڑتے سفر کا واہمہ تھا
اڑانیں تھیں فقط پرچھائیوں کی
پرندہ تو شجر کا واہمہ تھا

سر اٹھاتی فنا کی بے چینی
اُف یہ خلقِ خدا کی بے چینی
لحظہ لحظہ دہل رہی ہے بقا
بڑھ رہی ہے قضا کی بے چینی

منظر کا عکس دیدہ وروں سے نکال کر
لایا ہوں آنکھ بازی گروں سے نکال کر
خوف کا رزق ہو رہا تھا میں
آدھی کروٹ پہ سو رہا تھا میں
اک طرف شہر بھر کا ہنگامہ
اک طرف خالی گھر کا ہنگامہ
دن میں ہے نیم شب کی خاموشی
رات میں دوپہر کا ہنگامہ

میں نے کوشش بہت کی کہ ایسا نہ ہو
میرے گھر سے نہ ہو زندگی لاپتہ
تو نے غائب کیے میرے خوابوں کے رنگ
تیرے ہاتھوں ہوئی روشنی لاپتہ
نہیں کہ آب و ہوا سے ہرا بھرا ہوں میں
کسی شجر کی دعا سے ہرا بھرا ہوں میں
یہ زندگی تو مجھے خشک شاخ کر دیتی
کمالِ خوفِ قضا سے ہرا بھرا ہوں میں

ان اشعار کا پیش منظر اور پس منظر تہ در تہ نئی اور تازہ تر معنویت اور تفہیم کو آشکار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان اشعار کی بار بار کی خواندگی نئے نئے مناظر کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ اعلیٰ شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جب جب اس کا مطالعہ کیا جائے تب تب تازگی کی نئی لہر فکر و احساس کو معطر کر دے۔

میں جنید آزر کو غزل گو شعرا کے اس قبیلے کا فرد سمجھتا ہوں جس نے اپنے لہجے کی انفرادیت، اسالیب کی فنی آرائش اور خیال کی اچھوتی پیش رفت سے نئی غزل کو موضوعاتی وسعت دینے میں اہم کردار ادا کیا اور حسی سطح پر احساس کے کرب کو محسوس کرنے اور ذہنی بالیدگی کے ساتھ بالغ نظر مشاہدے کی روشنی سے شعور و آگہی کے زیر اثر اپنی تخلیقات کو سامنے لائے۔

آخر میں جنید آزر کے کچھ اور شعر جو مجھے بہت اچھے لگے ہیں، اس یقین کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ قارئین بھی میرے ساتھ ان کی پسندیدگی میں شریک ہوں گے:

دلیلِ کشف و کرامات میں نہیں پڑتا
فقیر ایسی خرافات میں نہیں پڑتا
جو پیرِ عشق سے مل جائے اس پہ قانع ہوں
سوالِ صدقہ و خیرات میں نہیں پڑتا

قصہ ہمارا شورِ نفس ہی میں رہ گیا
یہ نغمۂ جنوں تو جرس ہی میں رہ گیا
لرزنے لگتے تھے اہرامِ آرزو کے ستون
جو شہ سوار کوئی واقعہ سناتا تھا
جس نے میرے گھر میں بسیرے کیے
میں نگر میں ہوا بانٹتا رہ گیا
اتنی شدت سے میں نے پکارا اُسے
لب پہ آواز کا آبلہ رہ گیا
غبار بنتا ہوں خود کو اڑا کے اٹھتا ہوں
سفر کا آخری منظر بنا کے اٹھتا ہوں

باقی صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ کیجیے

- ترجمہ -

میرا بہادر دوست

نسیم سحر

ہر وہ پیشہ جس میں ناجائز آمدن کے مواقع نہ ہوں، بڑا قابلِ احترام ہوتا ہے۔ یہ اصول عموماً سب لوگوں کے لئے قابل قبول ہوتا ہے۔ اسی لئے جب مجھے یہ علم ہوا کہ میرے ایک دوست نے کتے سدھانے کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو میں بڑا خوش ہوا۔ جہاں تک مجھے علم تھا کتوں سے ناجائز آمدن بٹورنے کے مواقع میسر نہیں آسکتے تھے۔

تاہم یہ ضروری نہیں کہ جو بات مردوں کے لئے باعثِ مسرت بنے وہ عورتوں کو بھی خوشی کے لمحات بخش سکے، آئندہ چند ماہ میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ کتے سدھانے کا پیشہ چند اندیشوں کی بناء پر نوجوان لڑکیوں میں ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس افسوس ناک حقیقت کی بناء پر میرا عزیز دوست تیس برس کا ہوجانے کے باوجود کنوارا ہی پھر رہا تھا۔ میں اس کی شادی کا بڑی بے چینی سے منتظر تھا مگر اب یہ انتظار ناکامی کی حدوں کو چھو رہا تھا تاہم چند روز پہلے وہ تقریباً دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ میں اس کے بتانے سے قبل ہی سمجھ گیا کہ اس کی شادی کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ پھر اس نے بڑے ملتجیانہ انداز میں مجھ سے ایک ایسی درخواست کی جسے میں کسی صورت ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔

''پیارے دوست۔ تمہاری مدد کے بغیر میں شاید اس وحدۂ لاشریک رشتے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔ تم اگر میرے ساتھ نہ گئے تو بس کام بگڑا۔

''کیا تم اس لڑکی کے بارے میں میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے سامنے میرے اس انوکھے پیشے کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کرو تاکہ وہ لڑکی مجھے دلیر اور لائق سمجھ کر رشتے سے انکار نہ کردے، اگرچہ میں احتیاطاً یہ بھی اپنے ساتھ لئے جارہا ہوں لیکن تم بہتر طریقے سے یہ کام کرسکوں گے۔'' اس نے ایک بڑے سائز کی فریم شدہ تصویر سے کاغذ ہٹا کر مجھے دکھائی۔ اس تصویر میں میرا دوست آٹھ بڑے خونخوار قسم کے کتّوں کے درمیان کھڑا انہیں تربیت دیتا نظر آرہا تھا۔ کتے واقعی انتہائی خوفناک قسم کے نظر آرہے تھے اور میں اپنے دوست کی جرأت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے اس کی ازدواجی زندگی بھی کامیابی سے گزرنے کی اُمید پیدا ہوگئی، آخر جو شخص آٹھ لڑاکا کتوں کے درمیان اتنے اطمینان سے کھڑا تھا ایک بیوی اس کا کیا بگاڑ سکتی تھی؟

میں نے محسوس کیا کہ میرا دوست اپنی شادی کے معاملے میں بے حد سنجیدہ تھا۔ میں سچے دل سے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کے ساتھ لڑکی والوں کے ہاں جانے کی حامی بھر لی۔ مجھے علم تھا کہ میرا دوست بعض اوقات شیخیاں بھی بگھارنے لگتا ہے اس لیے میرا جانا اور بھی ضروری تھا تاکہ اگر کسی موقع پر وہ محض ترنگ میں آکر کوئی بے موقع بات کردے تو میں اول تو اسے باز رکھ سکوں یا پھر صورتِ حال کو سنبھال سکوں۔

جب ہم اس کی محبوبہ کے والدین کے ہاں پہنچے تو سب لوگ پہلے سے ہم دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ دعاسلام کے بعد ہمیں رسمی تعارف کے ناخوشگوار مراحل سے گزرنا پڑا اور میں نے متوقع دلہن اور اس کے باپ کا بغور جائزہ لیا۔ لڑکی بے حد ذہین اور سمجھی ہوئی نظر آرہی تھی لیکن لڑکی کے باپ سے مل کر مجھے کوئی مسرت حاصل نہ ہوئی۔ وہ خاصا خونخوار اور کرخت نظر آتا تھا اور میں نے نہ جانے کیوں چشمِ تصور سے اپنے دوست کو ناکام رہتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ ایسے حالات میں میری مدد بھی میرے دوست کو عبرتناک انجام سے بچا نہیں سکے گی۔

سب لوگ جب اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو میرے معزز دوست کے پیشے کی رعایت سے کتوں کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔ لڑکی کے باپ نے کہا'' کائنات کی ابتداء سے ہی کتا انسان کے لئے بہترین وفادار دوست کی حیثیت رکھتا ہے۔''

ایک اور مہمان نے دلہن کے باپ کو یا ہمیں اس بارے میں اپنے علم کا یقین دلانے کے لئے جبڑے پھیلا پھیلا کر کہنا شروع کیا'' ویسے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان کے ساتھ دوستی سے پہلے کتا محض ایک وحشی جانور تھا اور اس کی نسل محض اپنے دانتوں اور جبڑوں کی قوت کے بل بوتے پر قائم رہی۔ پھر انسان نے کتے کو سدھانا سیکھا اور زنجیروں میں باندھ باندھ کر اس کی وحشت دور کی اور اب تو جناب انسان کے لئے کتا کئی لحاظ سے اور کئی مقامات پر بڑی کارآمد مخلوق ہے۔ شکاریوں کے لئے کتا لازمی ہے۔ مجرموں کا کھوج لگانے کے لئے وہ موجود ہے۔ ڈوبتے انسانوں کی جانیں بچانے کے لئے وہ پیش پیش ہے۔ ہاں البتہ اگر کتا پاگل ہوجائے تو پھر۔۔۔''

میں نے جب یہ محسوس کیا کہ کتے سدھانے کے موضوع سے آگے بڑھ کر یہ حضرت بہت دور جاچکے ہیں تو مداخلت کرکے دوبارہ اسی جانب گفتگو کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

''آپ لوگ یہ نہ بھولیں کہ اگر کتے نہ ہوتے تو انہیں سدھانے والے بھی نہ ہوتے۔''

''آپ نے بجا فرمایا'' ایک صاحب بولے۔ اور سدھانے والوں کا کمال ہے کہ اب کتا کسی کام میں بھی انسان سے پیچھے نہیں ہے۔ میرے ایک پڑوسی نے کتا پالا ہوا ہے اور آپ یقین کیجئے کہ اسے اب خود بازار جاکر سودا سلف لانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اس کا پالتو کتا یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کر رہا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' دولہن کے باپ نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''اگر وہ ایسا بھی کرتا ہے تو مہنگی اشیاء خرید لاتا ہوگا کیوں کہ وہ دکاندار سے قیمتوں میں کمی

کے لئے جھگڑا تو نہ کرسکتا ہوگا۔''

''مہنگی؟ توبہ کیجئے۔'' جوش سے ان صاحب کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ ''قیمتیں کم کرانا انسانوں سے زیادہ کتوں کے لئے آسان ہے۔ جب وہ جبڑے کھول کر خوفناک انداز میں اپنی سرخ آنکھوں سے دوکاندار کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اُسے قیمت خرید سے بھی کم قیمت میں سودا سلف دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔''

''خیر۔ یہ بات اتنی زیادہ حیرت انگیز نہیں ہے۔'' ایک اور صاحب بولے۔ ''ایسے معمولی کام تو کتوں کے لیے کوئی بات ہی نہیں۔ میرے ایک پڑوسی نے بھی کتا پالا ہوا تھا اور جب وہ بچارا پڑوسی انتقال کر گیا تو وہ کتا کئی روز تک پھول چڑھانے اس کی قبر پر بھی جاتا رہا۔''

اس طرح گفتگو بڑی دیر تک چلتی رہی۔ ہر شخص کتوں کے بارے میں اپنے عجیب وغریب مشاہدات بیان کرتا رہا، اور حاضریب کی گرمجوشی سے مجھے احساس ہوا کہ یہ پیشہ اب اتنا خراب بھی نہیں کہ شادی کے معاملے پر اثر انداز ہو سکے۔ شاید میرے ابتدائی احساسات غلط ہی تھے اور دلہن کا باپ میرے دوست کو داماد بنانے پر آمادہ ہو ہی جائے گا۔

''میرے پاس ایک ایسا کتا تھا جو کبھی کسی اجنبی کے ہاتھ سے کھانے کی کوئی شے لینا پسند نہیں کرتا تھا۔'' ایک صاحب نے کہا۔

''پھر تو وہ بھوکا ہی مر گیا ہوگا۔'' ان کے کسی بے تکلف دوست نے ان کی کنجوسی کے بارے میں بھونڈا سا مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''افسوس کہ وہ مر چکا ہے۔'' ان صاحب نے کہا۔ ''لیکن بھوک سے نہیں بلکہ ایک روز وہ میرے ہمسائے کے باورچی خانے میں گوشت کھاتا ہوا پکڑا گیا اور ان لوگوں نے اس پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیا کر اُسے ہلاک کر دیا۔''

یہی وہ موقع تھا جہاں میرے دوست اور دلہن کے امیدوار کو چاہیئے تھا کہ وہ بھی بجائے منہ لٹکا کر کتوں کے بارے میں گفتگو سننے کے اس میدان میں اپنی مہارت اور تبحر علمی سے دوسروں کو سرفراز کرے لیکن وہ گم سم سا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہوشیار کرنے کے لئے کہنی چبھو کر موقع کی اہمیت کا احساس دلایا۔ میرے عقل مند دوست نے اشارہ پاتے ہی کہا۔

''میرے پاس تو ایک ایسا کتا ہے جو روزانہ مجھ سے بہت پہلے بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ بازار جا کر میرے لئے اخبار خرید لاتا ہے اور واپس آ کر مجھے بیدار کرتا ہے۔ پھر مجھے ناشتہ لا کر دیتا ہے اور اس کے بعد،''

لڑکی کا باپ بڑے خوفناک انداز سے آنکھیں نکال کر بولا۔ ''اگر اب تم نے یہ بھی کہا کہ پھر وہ کم بخت تمہیں اخبار کی خبریں پڑھ کر سناتا ہے تو میں اس جگ سے تمہارا سر پھوڑ ڈالوں گا۔''

لیکن میرا دوست اپنے متوقع سُسر کے اس دل شکن رویے کی پروا کئے بغیر کہتا گیا۔

''دنیا کے تمام جانوروں میں سے سب سے زیادہ ترجیحی سلوک کتے ہی سے کیا جاتا ہے۔ ہماری گفتگو سے اکثر اوقات پتہ چلتا ہے کہ ہمارے لاشعور میں کتے کی اہمیت کا احساس پنہاں ہے۔ مثلاً جو شخص بہت زیادہ باتیں کریں اسے ہم کہتے کہ تم کتے کی طرح کیوں بھونک رہے ہو۔ اور بھی اسی طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔''

''تو آیئے ہم انسان کے اس عظیم دوست کا جامِ صحت نوش کریں۔'' ایک صاحب نے جو بڑی دیر سے کچھ پینے کو بے چین ہو رہے تھے، فرمایا۔

''اور متوقع دولہا کا جامِ صحت بھی۔'' میں نے لقمہ دیا۔

محفل برخاست ہوئی تو ہم سب لوگ کمرے سے نکل کر باہر لان میں آ پہنچے اور یہی وہ موقع تھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ زبانی گفتگو کے علاوہ عملی تجربے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں ایک بڑی جسامت کا کتا زنجیر سے بندھا ہوا موجود تھا جس کے تیور بگڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے اپنی زنجیر تڑانے کی کوشش کی اور ناکام ہونے پر بھونک کر اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ میرے دوست نے بہت بہادر بنتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

''یہ کس کا پلّا یہاں بندھا ہوا ہے۔''

لیکن میں اس کی آواز کی کپکپاہٹ صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔

''پلا۔؟ تم اسے پلّا کہہ رہے ہو؟ یہ تو ایک سانڈ سے بھی ٹکر لینے کے قابل ہے۔'' متوقع سُسر نے متوقع داماد کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ وہ تو کتے سے بھی زیادہ ناراض نظر آ رہا تھا۔

''چلیے جناب۔ آپ کہتے ہیں تو میں اسے کتا ہی سمجھ لیتا ہوں۔'' میرے دوست نے اپنے ہونے والے سُسر سے جنگ مول نہ لینے کا ارادہ کر کے کہا۔ ''بہرحال ذرا اس کی زنجیر تو کھولیے۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا گویا اس کے نزدیک اس کتے کی حیثیت ہی کچھ نہیں تھی۔

''نہیں۔ اسے کھولا گیا تو وہ تمہارے ٹکڑے کر ڈالے گا۔'' متوقع سُسر نے جیسے میرے دوست پر رحم کھاتے ہوئے کہا۔

''کون؟ یہ کتا میرے ٹکڑے کر ڈالے گا؟ مَیں، جو کتے سدھانے میں ماہر ترین شخص ہوں۔ جس نے ہنری رامولو سے خاص طور پر تربیت حاصل کرنے میں دو سال لگا دیے ہیں۔ مجھے یہ گھٹیا قسم کا کتا کوئی نقصان پہنچائے گا؟ ہرگز نہیں۔ آپ اسے کھولیں تو سہی۔ میں تو اس سے بڑے بڑے اور خونخوار کتوں کو رام کر چکا ہوں، بھلا یہ کیا شے ہے!'' میرے دوست نے بڑے جوش سے کہا۔ ہم سب میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ہنری رامولو کون تھا اور میرے دوست نے اس کا نام کیوں لیا تھا۔ بہرحال ہم سب یہ سمجھ جانے کی اہلیت تو رکھتے ہی تھے کہ ہنری رامولو ضرور کسی بڑے مشہور کتے سدھانے والے کا نام ہوگا۔ اب ہر شخص یہ دیکھنے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ بے چین ہو گیا کہ استاد ہنری رامولو

نے کس حد تک میرے دوست کو اس خطرناک کام کے داؤ پیچ سکھائے تھے اور میرا دوست اب کون سی تدابیر کا سہارا لے کر ایسے گرانڈیل کتے کا مقابلہ کرے گا۔ لڑکی کے باپ نے میرے دوست کی یہ باتیں سن کر آگے بڑھ کر کتے کی زنجیر کھول دی۔ شاید میرے دوست کے لئے اب سوائے اپنے فن کے مظاہرے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا۔ اس نے کتے کے کوئی مزید حرکت کرنے سے پیشتر ہی قابلِ داد پھرتی سے لپک کر زمین پر پڑی ہوئی ایک چھڑی اٹھالی۔

اب آپ لوگ ذرا دیکھئے گا کہ یہ کتا کس طرح میرا ایک ایک لفظ سمجھ کر اس کی تعمیل کرے گا۔ میں اس چھڑی کو دور پھینک دوں گا اور ایک سیکنڈ میں یہ کتا اسے اٹھا کر مجھے واپس لا دے گا۔''

میرے دوست نے چھڑی کو معمولی سی حرکت ہی دی تھی کہ کتے کی دُم فوراً اوپر اٹھ گئی اور اس کے بدن کے سارے بال کھڑے ہو گئے۔ کتا نہایت حساس طبع نظر آتا تھا۔ میرے دوست نے چھڑی کو لان کے دوسرے کونے کی طرف پھینک دیا اور تحکمانہ انداز سے کتے کو اشارہ کر کے کہنے لگا۔

''ٹونی۔ جاؤ چھڑی واپس لے کر آؤ۔''

یہ دیکھ کر کہ میرے دوست کے ہاتھ سے اپنی مدافعت کا واحد ہتھیار دور چلا گیا ہے کتا اپنی خوش نصیبی پر پھولا نہ سمایا اور حملہ کرنے کے انداز میں میرے دوست کے پاس آ کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ میرا دوست اپنی بارعب آواز میں اب بھی اسے چھڑی لانے کا حکم دے رہا تھا جس کے جواب میں کتا پہلے سے زیادہ اشتعال انگیزیوں پر اُتر آیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد تو یہ تمیز کرنا دشوار ہو گیا کہ ان دونوں میں سے زیادہ کون شور مچا رہا ہے، میرا دوست یا کتا۔ کیوں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی زبان میں کچھ کہہ رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ کتا اپنی حرکات وسکنات میں میرے دوست سے زیادہ ہی تیز اور مستعد نظر آ رہا تھا۔

باقی سب لوگوں نے خوفزدہ آوازوں میں چیخنا شروع کر دیا۔

''ارے وہ کتا تو اس کے ٹکڑے کر ڈالے گا۔''

''کوئی اسے بچاؤ۔ اسے اس کتے سے چھڑاؤ۔''

''جلدی سے اس کی مدد کرو ورنہ دیر ہو گئی تو۔''

''تم سب لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔ تم لوگ اپنی دخل اندازی سے حالات کو اور بھی خراب کر دو گے۔ لڑکی کے باپ نے اُن سب کو ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''انہیں بالکل اکیلا چھوڑ دو۔ اگر یہ لڑکا واقعی کتے سدھانے کا مالک ہے تو کتے کو قابو میں کر لے گا۔ دوسری صورت میں کتا اسے قابو کر لے گا۔ یہ ایک عقلمند کتا ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ اب تو وہ اسے مزہ چکھا کر ہی چین سے بیٹھے گا۔''

''مدد کرو۔ یہ ناانصافی ہوگی۔ اس بیچارے کو نقصان ہی نہ پہنچ جائے۔''

''اوہ خدایا۔ کتا تو اسے مار ہی ڈالے گا۔''

''کیا یہاں کوئی شخص ایسا نہیں جو کتے کو معقول رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرے؟''

اس طرح کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ شاید سب ہی لوگ کچھ نہ کچھ کہہ رہے ہوں گے لیکن چونکہ کتا اور میرا دوست اب پورے زور سے چلا چلا کر ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہے تھے اس لیے باقی لوگوں کی آوازیں مشکل سے سنائی دے سکتی تھیں۔ البتہ لڑکی کے باپ نے کہا۔

''کتے کو اس طرح کی کوئی تربیت نہیں دی گئی کہ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ دے۔ اسے روکنا بے کار ہے۔''

لیکن لوگ میرے دوست کی عملاً مدد نہیں کر سکتے تھے تو زبانی اسے قسم قسم کے مشورے دے کر کتے سے اپنی جان بچانے کا مشورہ تو دے ہی سکتے تھے چنانچہ لگاتار اس قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''اپنے منہ کو بچاؤ وہ پنجہ نہ مار بیٹھے۔''

''دیکھو دیکھو وہ تمہاری ٹانگ ہی نہ ادھیڑ ڈالے۔''

''اس کی تھوتھنی پر زور سے مکا لگاؤ۔''

''ناک بچاؤ اپنی۔ ارے ذرا سنبھل کر آگے بڑھنا۔''

''یہ کتا تو اب اس لڑکے کی جان لے کر ہی ٹلے گا۔''

بے چارے آفت زدہ امیدوار کے متوقع خسر نے پُر امید انداز میں کہا۔ اس افراتفری میں ایک صاحب نے حاضر دماغی سے کام لیا اور پانی سے بھری ہوئی بالٹی ان دونوں پر انڈیل دی۔ یعنی ایک انسان اور ایک کتے پر۔ کتا اس عمل سے فوراً ہوش میں آ گیا اور یوں چپ اور ساکت ہو گیا جیسے کسی نے چلتی گاڑی کو بریکیں لگا دی ہوں لیکن میرے دوست کے کھولتے لہو پر پانی کوئی اثر نہ کر سکا۔ وہ اب بھی کتے پر جیسے جھپٹ جھپٹ پڑ رہا تھا۔ آخر دو آدمیوں نے بڑی تگ و دو کے بعد میرے دوست کو بھی قابو میں کر لیا۔ اب یہ خوفناک لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ کتے پر تو اس کا کوئی اثر نظر نہ آتا تھا لیکن میرے دوست کی حالت کچھ اس طرح تھی جیسے کئی گھنٹے خاردار تاروں میں الجھا رہا ہو۔

متوقع خسر نے نہایت بدتمیزی سے کہا۔ خواتین کمرے میں چلی جائیں۔ اس لڑکے کے کپڑے دھجیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ عورتوں نے اس حکم کی تعمیل بادلِ نخواستہ کی۔ جیسے کوئی بچے کو مداری کے تماشے سے ہٹانا چاہ رہا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا پتلا دبلا دوست لڑکی کے باپ کی ایک بیحد لمبی چوڑی اور پُرانی پتلون میں کسی طرح اپنے آپ کو ملفوف کر کے لنگڑاتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی قمیض کے رہے سہے ٹکڑے اس کے بدن سے چیتھڑوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس مضحکہ خیز حلیے میں اسے دیکھ کر ہنسی روکنا آسان کام نہ تھا مگر میں اس کا دوست تھا اس لئے اپنے آپ قابو پا کر اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔ اب شادی کے بارے میں کسی قسم کی گفتگو کرنا لاحاصل تھا۔

''ذرا ٹھہریے۔''ہمیں ایک سریلی سی آواز نے روکا۔ یہ اس لڑکی کی آواز تھی جس سے میرا دوست شادی کرنا چاہتا تھا۔ شاید وہ لڑکی ہم سے اپنے والد کی زیادتی کی معذرت کرنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں نے مڑ کر تیزی سے لڑکی کی طرف دیکھا جو اپنے ہاتھوں میں ایک بنڈل لیے ہماری طرف آرہی تھی۔''اس نے بنڈل مجھے پکڑا دیا۔ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''اس میں کیا شے ہے؟'' جواب میں اس نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرے دوست کے لئے اس لڑکی کی جانب سے کوئی تحفہ ہے۔ گویا اب بھی شادی کا امکان باقی تھا۔ گویا اب بھی!۔

اس منحوس گھر سے باہر آتے ہی میں نے وہ بنڈل کھول دیا تا کہ دیکھوں کہ لڑکی کے تحفے کا معیار کیا ہے۔ مگر۔ مگر صد افسوس کہ اُس بنڈل میں میرے مظلوم دوست کی مرحوم پتلون کے باقیماندہ ٹکڑے لپٹے ہوئے تھے۔ اور۔۔ اور یہ جس کاغذ میں لپیٹ کر ہمیں دیے گئے تھے وہ کاغذ نہ تھا بلکہ وہ تصویر تھی۔ جی ہاں۔ وہی تصویر جس میں میرا دوست آٹھ لڑاکا کتوں کے درمیان کھڑا انہیں سدھار رہا تھا!

(صرف مرکزی خیال رُوسی سے لیا گیا)

بقیہ: ''وقت سے آگے کی زباں''

نور کی ہر امید کو زندہ رکھتی ہے
ایک کرن خورشید کو زندہ رکھتی ہے
لمحہ لمحہ ڈوبتی صدیوں بوڑھی آنکھ
خوابوں کی تجرید کو زندہ رکھتی ہے
بہار روکنے والے اسی پہ حیراں ہیں
یہ پھول باغ کے اندر کہاں سے آتے ہیں
مری بیاض کے صفحوں پہ رنگ بھرنے کو
یہ تتلیوں کے حسیں پَر کہاں سے آتے ہیں
تمام عمر میں چھاؤں کو اتنا ترسا ہوں
کہ اب مرے ہی بدن سے شجر نکلنے لگے

اس تحریر کا اختتام جنید آزر کو اسی کا ایک شعر نذر کر کے کر رہا ہوں جو بلاشبہ اس خوبصورت شاعر کی خوبصورت شاعری کے مستقبل کا سمت نما ہے:

چپ رہ کے بھی اسرارِ صدا کھول رہا ہوں
میں وقت سے آگے کی زباں بول رہا ہوں

بابالوگ --- افسانچہ

(منبع: غیاث احمد گدّی)

ہمیشہ کی طرح آج بھی، سورج ڈوبنے کے بعد بڈھا انکل کے گھر کے باہر رکھی چارپائی کے اردگرد محلے کے بابا لوگ جمع تھے۔ کئی برس بیت گئے کہانی سنتے سناتے۔ اب بابا لوگ بچے نہیں رہے، سب جوان ہو گئے تھے۔

لیکن بڈھا انکل کے لیے یہ سبھی اب بھی 'بابا لوگ' ہی تھے۔ وہ اپنی عادت کے مطابق گویا ہوا۔''بابا لوگ ---آج ام تم کو اپنا کہانی سنائے گا ایک دم نیو کہانی۔۔۔ بیس سال پہلے کا بات ہے۔۔۔ ام ایک انگریج ساب کے یہاں نوکر ہوتا۔۔۔ اس بکھت امارا ایج تیس ہوتا۔۔۔ امارا ساب آجادی کے بعد یہیں رہنا مانگتا۔۔۔ ساب کا جوان بے بی مارگریٹ، مون کا ما پھک بیوٹی پھل ہوتا۔۔۔ وہ کسی سے لَو کرتا۔۔۔ لو میں بے بی مسٹیک کیا جس کا نتیجہ میں وہ پریگنٹ ہوتا۔ ساب نے بے بی کو بوت مارا، پوچھا کس کا پاپ ہے۔۔۔ پر بے بی اپنا لور کا نام نہیں بتایا۔۔۔ ساب نے محلے اور رستے داروں میں، کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلنے دیا۔ گھر پر ہی ڈیلیوری کا سارا انتجام کرایا۔۔۔ ساب بوت پیسہ کھرچ کیا اس بات کو دبانے میں۔۔۔ مارگریٹ کو بے بی پیدا ہوا۔۔۔ اپنا اجّت بچانے کا کھاتر وہ نیو بے بی کو مروا دینا چاہتا۔۔۔ یہ کام اس نے ام کو دیا کہ اسے مار کر جنگل میں پھینک دو۔۔۔ وہاں جنگلی جانور اسے کھا جائے گا۔۔۔ اس کام کے لیے امارا ساب ہم کو بہت انام دیا۔۔۔ پھر کچھ مہینے بعد ساب اپنا پھیملی لے کر ولایت چلا گیا۔۔۔ اُدر کیا ہوا، بے بی کا سادی بنتا کہ نہیں بنتا نہیں مالوم۔۔۔''

بڈھا انکل ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کی جوان اور خوبصورت بیٹی نے دروازے پر کھڑی ہو کر آواز دی۔''بابا، کھانا نکال دیں؟''

اس کی نقرئی آواز پر سبھی لوگ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تھوڑا ویٹ کرو۔۔۔ ام ابی اپنا اسٹوری سناتا۔'' انکل نے جواب دیا۔

''یہ کون ہے چاچا؟۔۔۔ آپ نے آج تک شادی نہیں کی پھر یہ بیٹی کہاں سے۔۔۔ ہم لوگ برسوں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔۔۔ لیکن آج تک نہیں بتایا۔۔۔ آج بتا ہی دیجئے؟''

''یہ وہی مارگریٹ کا بے بی ہے۔۔۔ امارا ساب کا گرینڈ ڈاؤٹر۔''

''تو آپ نے اسے مار نہیں ڈالا تھا؟'' کئی نے ایک ساتھ حیرت سے پوچھا۔

بڈھے انکل نے جواب دیا۔''نہیں۔۔۔ ام اپنا بے بی کو کیسے مار ڈالتا؟''

تنویر احمد رومانی (جمشید پور)

مئی دادا

اسد محمد خان
(کراچی)

مایا کے تین ناموں کی طرح مئی دادا کے بھی تین نام تھے: مجیتا، مجید اور مئی دادا۔ مجیتا کہنے والے ان کے سامنے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مجید، یا ارے ماں مجید کہنے والے دو تین بڑے بوڑھے ان کے بعد بھی کچھ دن زندہ رہے۔ باقی تمام لوگوں کے لیے، سارے شہر، سب زمانوں کے لیے وہ مئی دادا تھے۔

خود مئی دادا کا بیان تھا کہ ان کا اصل نام ابدل مزید کھاں ایسپ جئی ہے۔ چناں چہ پولیس کے مشیر ناموں، راشن کارڈوں، سرکاری اسپتال کے کاغذوں اور آخر میں قبرستان کے رجسٹر میں ان کا نام عبدالمجید خاں یوسف زئی لکھا گیا۔ اگر ان کا کوئی وارث ہوتا تو لوحِ مزار پر بھی عبدالمجید خاں یوسف زئی ہی لکھا جاتا۔ اس لیے کہ ان کی وصیت یہی تھی۔ مئی دادا کے بارے میں محلے کے دھوبیوں نے اڑا رکھا تھا کہ وہ ذات کے ہندو تیلی ہیں اور ان کی مسلمانیاں تک نہیں ہوئی ہیں۔

دھوبیوں کی اس حرمزدگی کی وجہ خود مئی دادا یہ بیان کرتے تھے کہ جوانی میں دھوبیوں کے سلسلے میں ان سے کچھ لغزشیں ہوئی تھیں اور یہ بدجنا وروں کی اولاد اب ان باتوں کا انتقام لے رہی ہے۔

دھوبی محلے میں ان کی تگ وتاز کے بارے میں مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ جوانی میں مئی دادا دیکھنے دکھانے کی چیز تھے اور یہ کہ ان کی آخری محبوبہ جمرت دھوبن سنہ ۶۵ء میں ۷۰ سال کی ہوکر مری ہے۔

میں نے ڈبا کیمرے سے کھینچی ہوئی بادامی رنگ کی ایک بوسیدہ تصویر بھی دیکھی ہے جس میں اٹھارہ بیس برس کے مئی دادا کان کی لو تک پہنچی ہوئی لوہا چڑھی لاٹھی تھامے، تارا سی آنکھوں میں بہت سا سرمہ بھرے ایک زبردست پگڑ باندھے کیمرے کو گھورتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ مئی دادا کی یہ تصویر مرحوم پھوپھا ابا کی کھینچی ہوئی ہے، جنھوں نے شہر میں سب سے پہلے سنہ اٹھارہ سو کچھ میں بمبئی کی کسی پارسی فرم سے کیمرے کا وی پی پارسل منگوایا تھا۔ خاندان کے اسکینڈل باز بوڑھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مئی دادا، پھوپھا ابا مرحوم اور ان کے یاروں دوستوں کے لیے اغوا کی وارداتیں کیا کرتے تھے اور اربابِ نشاط سے رابطے قائم کراتے تھے۔ مگر یہ نری خباثت تھی، پھوپھا ابا کھرے پٹھان اور حافظِ قرآن تھے اور مئی دادا تو تھے ہی یوسف زئی، ایسی گھٹیا باتیں ان کے دائرۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں، پھوپھا ابا نے انھیں ایک تپنچا خرید کر دیا تھا جسے چلانے کی نوبت تو شاید کبھی نہ آئی ہو مگر دھمکانے کے کام ضرور آتا تھا۔

میں نے اکثر مئی دادا سے اس تپنچے کا ذکر سنا ہے۔ تقسیمِ ملک سے بہت پہلے کسی حرامی ازل گر پھتا بھان کے گھوڑے نے اسے چرا لیا اور دھوبیوں نے اڑا دیا کہ چرانے والے نے یہ تپنچا ٹین ڈبے بھوسی ٹکڑے والے کو خستہ گنج کے بدلے میں تلوا دیا ہے۔ مئی دادا تپنچے کے واقعے پر ہل کر رہ گئے تھے اور پولیس میں رپورٹ لکھانے چلے تھے مگر لوگوں نے سمجھایا کہ کیا غضب کرتے ہو، پولیس کو ہوا بھی نہ لگے، بلا لائسنس کا ہتھیار تھا، الٹے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ مجبوری تھی۔ مئی دادا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بعد میں کئی برس تک اس انتظار میں رہے کہ بس مجھے پتا چل جائے کہ میرا تپنچا کس سالے کے کنے ہے۔ آنتیں نکال کے اس ازل گر پھتا بھان کے گھوڑے کے گلے میں پنا دوں گا۔

آنتیں نکال کر گلے میں پہنا دینا ان کی پسندیدہ دھمکی تھی اور ''اجل گرفتہ'' انھوں نے میرے چچا سے سنا تھا جو اس زمانے میں زور زور سے طلسمِ ہوش رُبا پڑھ کر ہم سب کو سنایا کرتے تھے۔

مئی دادا کا خیال تھا کہ ''یہ یو'' طلسم ہوش رُبا اور قصہ طوطا مینا اور انوارِ سہیلی وغیرہ ہیں یہ سب ٹھیک ہیں مگر انگریزی تعلیم جو ہے یہ آدمی کو ''نامرد'' بنا دیتی ہے... یہ لفظ وہ بزدل کے معنوں میں استعمال کرتے تھے اور اکثر بڑے تأسف سے کہا کرتے تھے کہ غضب خدا کا، جب سے ان پٹھان بچوں نے انگریزی پڑھنا شروع کی ہے، اس خاندان کے لوگوں نے کوئی ''کتل'' ہی نہیں کیا۔

ایک بار ابا نے یہ بات سن لی اور انھیں ایسی ڈانٹ پلائی کہ سب سے چار دن تک روٹھے رہے، کسی سے بات نہیں کی۔ آخر پانچویں دن مجھے اشارے سے بلا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے کہ تیرے باوا علی گڑھ جا کے خراب ہوئے ہیں، پہلے ایسے نہیں تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے ایک قاعدے کی بات کہی اور وہ بگڑ گئے۔ ''بلاوجے۔''

مگر یہ طے تھا کہ ابا کو اور ہم سب بہن بھائیوں کو ان سے جتنی محبت ملتی تھی، دوسروں کو اس کی آدھی بھی نصیب نہیں تھی۔ ویسے مجموعی طور پر وہ پورے کنبے قبیلے کے عاشق تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ میں تیرے کنبے قبیلے کے ''ساکھ سجر'' کا ماشٹر ہوں اور یہ کہ ''ایسا چاروں کھونٹ ساکھ سجر'' میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔

''ساکھ سجر'' سے ان کی مراد شجرۂ نسب ہوتی تھی مگر ''چاروں کھونٹ ساکھ سجر'' کیا ہوتا ہے، یہ نہ میں نے کبھی پوچھا، نہ انھوں نے کبھی بتایا۔

اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میرے کنبے کی حد تک مئی دادا علمِ اسم نویسی کے ماہر تھے۔

اس مرحوم خاندان میں بڑوں کا طریقِ کار یہ تھا کہ جوں ہی لڑکا اپنا پورا نام لکھنے کے قابل ہوا اس کا دادا، تایا، باپ یا چچا اسے شجرۂ نسب کی ایک وصلی تھما دیتے تھے کہ لو بیٹا، سنبھال سنبھال کے اس کی سو نقلیں تو بنا دو۔ ظاہر ہے کہ کلک اور گاڑھی سیاہ روشنائی سے لمبے لمبے کاغذوں پر یہ شاخ شجر بنائے جاتے تھے۔ پنسل، فاؤنٹین پین، فولادی نب وغیرہ سے پرکھوں کے نام لکھنا سخت بے ادبی بلکہ مداخلت فی الدین سمجھی جاتی تھی۔ انھیں درست طریقے سے بنانے میں مہینوں لگ جاتے تھے مگر یہ ایک طے شدہ طریقِ کار بلکہ پیدائشی جبر تھا جس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ شاخ شجر مکمل ہو جاتے تو خاندان کا اس دور کا پیڑی آرک، لمڈوں کو بلا کر ان کی کارکردگی ملاحظہ کرتا اور تمام کلمے، الحمد شریف اور چاروں قل سننے کے بعد پہلے

اس لڑکے کی مین لائن پھر برانچ لائنیں زبانی سنتا اور ایک روپیا کلدار عطا کرتا تھا۔ درمیان میں بھول جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے کہ مہینوں تک فلاں محمد خاں کے بیٹے فلاں محمد خاں اور ان کے بیٹے فلاں محمد خاں خوابوں تک میں تلواریں لیے ٹہلتے پھرے تھے۔ انھیں بھول کون سکتا تھا۔

دوسرے پیٹری آرکوں کے برخلاف میرے دادالمڈوں کی بدخطی کو نظرانداز فرماتے تھے۔ مگر لمڈے بندہ بشر ہوتے ہیں۔ اگر غلطی سے اِن محمد خاں کے بیٹے اُن محمد خاں کی بجائے ''وہ دوسرے'' محمد خاں لکھ دیا اور دادا کی نظر پڑ گئی تو سمجھو مارے گئے۔ انگلیوں پر کلک تقریباً توڑ دیے جاتے تھے کہ سور، میرے نگڑ سگڑ دادا کو ولدالحرام بتا رہا ہے! اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس قدر خفا ہونے کی کیا بات ہے، ہم درست کیے لیتے ہیں... مگر اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب کے یہاں یہ شدت کس لیے تھی۔ شاید اپنی زاد بوم سے ہزار میل دور اور سیکڑوں برس کے بُعد میں، یہ پشتون قبیلہ جو اپنی زبان بھی بھول چکا تھا، کاغذوں پر اپنے نسب کے تحفظ کی ہارتی ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔

اس لیے کہ لوگ کبھی کبھی شیخوں، مغلوں میں بھی شادیاں کر لیتے تھے اور بعضے تو اتنے بے ادب تھے کہ سیدوں تک کی بیٹی لے آتے تھے۔ معاذ اللہ۔ آلِ رسولؐ سے خدمتیں لینا اور کبھی کبھی سخت سست کہہ دینا!... اس بے ہودگی کا تصور ہی بدنوں میں لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

تو دوسری اولادِ نرینہ کی طرح اس اذیت سے، کہ جو ہمارے یہاں ختنہ ہی کی طرح لازمی تھی، مجھے بھی گزرنا پڑا۔ عالم گیر بادشاہ کے عہد سے میرے ہوش سنبھالنے تک آٹھ پیڑھیاں بھگتانا بہ ظاہر کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مگر وہ سپاہی لوگ تھے اور پھر ان زمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ چناں چہ میں چیں بول گیا، مثلاً فلاں محمد خاں کے پانچ بیٹے، ان پانچ بیٹوں کے مجموعی طور پر اٹھائیس انتیس بیٹے (جن میں بمشکل ایک دولاولد) باقی ستائیس اٹھائیس کی اتنی اولادیں اور ان کے اتنے اتنے نونہال... اور معلوم ہوتا تھا ابھی ہم چار پیڑھی ہی اترے ہیں کہ ایک وضاحتی شجرہ اور تھما دیا گیا کہ بیٹا ذرا اب ماؤں کی طرف سے ان چاروں پیڑھیوں کا حساب تو کر لو۔

اور یہاں سے ایک تہ دار عذابِ مزید شروع ہوتا تھا۔ اس لیے کہ کہیں خال خال انحراف کے سوا یہ خاندان آپس میں ہی شادیاں کرتا رہا تھا کیوں کہ ہڈی اور خون کے تحفظ کا سوال تھا اور اس بات نے میرے لیے ایک عجیب صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ یعنی ایک رشتے سے جو صاحب میرے دادا یا نانا ہیں، وہ دوسرے حساب سے چچا اور تیسرے، ذرا دور کے رشتے سے، ماموں ہوتے ہیں اور اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں... کئی ہزار کاغذوں پر اسی طرح لکھا ہے۔ اور اب جو یہ صاحب میری پھوپھی کی صاحب زادی سے شادی کرنے پر تلے ہیں تو یہ میرے بہنوئی بن جائیں گے اور ذیلی شاخ شجر، جدول پانچ کے حساب سے دیکھو تو یہی صاحب میرے بھائی بنتے ہیں، ہر چند کہ یہ رشتہ ذرا گھما کر ہے۔

اس عذاب سے گھبرا کر میں باقاعدہ رو پڑتا۔ تب ایسے میں مئی دادا خدا کے بروقت فرشتوں کی طرح میری مدد کو آتے اور اسم نویسی کا مسئلہ پانی کر دیتے۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر گتھیاں سلجھاتے اور ہمت بندھاتے۔

خود ان کے شجرۂ نسب کے بارے میں سوال کرنے کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ یا آیا ہوگا تو دھوبیوں کی اڑائی ہوئی افواہوں کے تناظر میں یہ سوچ کر کہ مئی دادا اس بارے میں بہت حساس ہیں، ہم لڑکوں نے کبھی پوچھا نہیں ہوگا۔ ایک بار کسی بزرگ خاتون نے خوش مزاجی سے پوچھ لیا کہ مجید! تو سب کے شجرے یاد کیے بیٹھا ہے، خود اپنا شاخ شجر بھی یاد ہے تجھے؟ تو اتنی ہی خوش مزاجی سے بولے، ''ہاں بیا! کیوں نہیں۔ سنو، سمسیر اپنے سمسیر اپنے ابدل مزید کھاں ایسپ جئی'' اور ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنسے۔ نادر شاہ درانی کا یہ تاریخی لطیفہ بھی انھیں چچا نے ہی سنایا تھا۔

ہم لڑکوں کے لیے ان کی جو حیثیت تھی، اگر اسے کسی ایک دو لفظی اصطلاح میں بیان کیا جاسکتا تو وہ اصطلاح تھی ''ماہر پشتونیات'' کی۔ وہ ہمارے لیے ''پٹھان ساگا'' کے عالم تھے مثلاً یہ کہ پشتو زبان جو دنیا کی پُرشکوہ زبانوں میں سے ایک ہے، کچھ اس طرح بولی جاتی ہے کہ دغا دا روڑا دا پستہ دا بادام روڑا داہینگ اور یہ ہمیں بہت شان دار لگتا تھا کہ ہمارے پرکھے ایسی زبردست زبان بولتے ہوئے کفار کے علاقوں میں در آئے تھے اور انھوں نے سیاہ فام بھیلوں، کورکوؤں اور گونڈوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلائے کلمۃ اللہ کیا تھا اور یہ زبان بولی تھی۔ کیسا رعب پڑتا ہوگا مقامی آبادیوں پر!

اپنے ہم عمر کنبہ قبیلے والوں میں شاید میں سب سے زیادہ پُرتخیل واقع ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے، منھ کھولے مئی دادا کا بولا ہوا ایک ایک لفظ پیتا رہتا۔ اور جب میری عمر کے دوسرے لڑکے پتنگیں اڑانے اور ہاکیاں کھیلنے میں لگے ہوتے، مَیں باڑے کی کوٹھریوں والی چھت پر چڑھ جاتا اور اپنے قبیلے کے وطن تیراہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور، اپنے پشتون اجداد سے ڈھائی تین سو سال پرے، ٹین کی نالی دار چھت پر لیٹا ہوا قبائلی جنگیں لڑا کرتا یا بقول مئی دادا درۂ خیبر میں ''ڈنڈم ڈنڈا اور تلوارم تلوارا'' کیا کرتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا پسندیدہ کھیل یہ ہوتا تھا کہ میں کاٹھ کباڑ والے تاریک کمروں میں گھس جاتا، یا تل گھروں میں اتر جاتا یا دھاووں پر چڑھ جاتا اور کھیتی باڑی کے آلات میں دبے ہوئے زنگ خوردہ آدھے پون ہتھیاروں میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز نکال کر اسے اپنے طور پر صیقل کرتا۔ کبھی کوئی پوری تلوار، کٹار بھی مل جاتی جو زنگ سے نڈھال ہو کر ہل یا ہسیئے یا پاسے کی طرح بوجھل اور بے ڈول ہوگئی ہوتی؛ تو اسے دیکھ کر مجھے عجیب سا خیال آتا اور میں سوچتا کہ یہ تلوار جو اب ہل یا ہسیئے یا پاسے کی شکل ہوگئی ہے، یہ شاید ہمارا سپاہی پیشہ خاندان ہے اور اسے زمین پر پڑے پڑے ایک ''عدم استعمال'' یا ''غلط استعمال'' نے کسان بنا دیا ہے۔ سو میں اپنے زنگ خوردہ سپاہی کو بحال کرنے کی کوشش میں بہن بھائیوں کے روبہ رو ناٹک کیا کرتا تھا۔ پر دادا کی کام دار مخمل کی

''چہارسُو''

پھٹی ہوئی فرغل پہن کر، کمر سے آدھی پون تلوار باندھ کر میں پشتو مکالمات میں (جو ظاہر ہے مئی دادا کی ایجاد ہوتے تھے) کفار کو للکارا کرتا، پشتو رجز پڑھا کرتا۔ مئی دادا کو یہ ناٹک اور ہتھیاروں کی یہ بحالی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ گھنٹوں ہم لوگوں کے ساتھ اس کھیل میں شریک رہتے کیوں کہ ان کا بیان تھا کہ وہ ہتھیاروں کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ ان کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے عشق تھا۔

۴۶۔۴۷ء کے پُرآشوب زمانے میں پڑوس کی غیر مسلم ریاست سے مسلمان ہجرت کر کے ہمارے شہر آ رہے تھے، کیوں کہ ہمارا شہر مسلمان اکثریت کا شہر تھا، شاید اب بھی ہوگا اور یہ پٹھانوں کی بسائی ہوئی ریاست تھی۔ مئی دادا ایک روز ریلوے اسٹیشن سے گھیر گھار کے صیقل گروں، اسلحہ سازوں کا ایک خاندان لے آئے اور انھیں باڑے میں بٹھا کر ابا کی تلاش میں اسکول پہنچ گئے۔ پتا نہیں کس طرح ابا کو قائل کر لیا کہ بے چارے بے آسرا لوگ ہیں۔ جہاں چار کنبوں کو باڑے کی کوٹھریوں میں پناہ دی ہے تو میاں! ان کے لیے بھی جگہ نکالیے۔ پھر مئی دادا نے بڑی کوشش اور سیاست سے اسلحہ سازوں صیقل گروں کے لیے ایک کوٹھری خالی کرائی، لکڑی کے کھوکھے لالا کر تختے نکالے اور جگہ کر، باڑے میں ایک چھوٹا سا کمپاؤنڈ بنا دیا۔ اسلحہ سازوں، صیقل گروں نے دوسرے ہی دن گڑھا کھود کر دھونکنی نصب کر دی اور کھٹا کھٹ چھریاں، تلواریں بنانی شروع کر دیں۔ پہلا زنبیہ مئی دادا کے لیے تخلیق ہوا؛ جس کے نیام پر اماں کی پرانی مخملیں صدری سے حاصل کیا ہوا کپڑا مڑھا گیا اور مرحوم تپنچے کے بعد مئی دادا ایک اصل نسل زنبیے کے مالک بن گئے۔ تپنچے کی گم شدگی اور زنبیے کے حصول کے درمیان کی عذاب ناک مدت کے بارے میں پہلی بار مئی دادا تقریباً مسکرا کر کہنے لگے، ''یہ یو تپنچا گایب ہوا ہے تو اس میں بھی مالک کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوئے گی۔ کیا پتا میں گصے میں کسی بھان کے گھوڑے کے پیٹ میں جھونک دیتا، بلاوجے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ پلس کچیری ہوتی پھرتی۔'' کسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ مئی دادا تپنچا لے لینے اور زنبیہ دے دینے میں مالک کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ اب آپ کسی گھوڑے کے پیٹ میں زنبیہ اتار دیں گے۔ تو زور سے ہنسے اور زنبیے کے مخملیں نیام کو تھپکنے لگے، ''ابے کیا کھوجی سمجھ لیا ہے۔''

رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے میرے چچا نے اور سروانٹے کے ڈون کیہوٹے سے میں نے متعارف کرایا تھا۔ مگر کیہوٹے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہتے تھے، ''گورے سب... تیا ہوتے ہیں۔''

یہی زمانہ تھا کہ ریاستی حکومت نے آتشیں اسلحہ اور چند انچ سے زیادہ پھل کے ہر دھار دار آلے کے لائسنسوں کی سختی سے پڑتال شروع کر دی۔ نئے لائسنس جاری ہو رہے تھے مگر بڑی سفارشوں کے بعد۔ اور لائسنس کی سالانہ فیس بھی ہوتی تھی جو بڑی ''جیادتی'' کی بات تھی، مگر پہلا مسئلہ لائسنس کا حصول تھا۔ مئی دادا نے اماں کی خوشامد کر کرا کے ماموں سے سفارش کروائی۔ وہ پولیس میں کوئی توپ افسر تھے۔ اور مئی دادا کا کام بن گیا۔ زنبیے کا بارہ آنے سالانہ کا لائسنس جاری ہو گیا۔ مئی دادا کو یہ بارہ آنے ہمیشہ کھلتے رہے مگر انھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ ان کا زنبیہ اب کوئی بھان کی گھوڑی گورمنٹ بھی نہیں چھین سکتی، دوسروں کا ذکر ہی کیا۔ اماں نے اور ماموں نے سفارش گزارنے سے پہلے مئی دادا سے تقریباً حلف اٹھوالیا تھا کہ وہ کسی کو اس زنبیے سے دھمکائیں گے نہیں۔ ''ناہیں میاں! جیسی چاہے کسم لے لو، میں کسی ازل گر پھتا بھان کے.....''

مئی دادا سال میں ایک بار خود اپنا لائسنس اور میرے ابا، تایاؤں، چچاؤں، پھوپاؤں، خالوؤں کے اور میری اماں کے نام کے بندوقوں، رائفلوں، تیغوں، تلواروں، خنجروں، کٹاروں، کرچوں کے لائسنس اکٹھے کرتے اور فیس بھرنے کے لیے لائن لگاتے۔ واپس آتے تو مردانہ ڈیوڑھی سے ہی بڑبڑانا شروع کر دیتے کہ غضب خدا کا، ایک زمانہ وہ دیکھا سنا تھا کہ گدی نشین تو نہیں تھے مگر فلاں محمد خاں کے محل پے پانچ پانچ توپیں چڑھی رہتی تھیں۔ ''مزال تھی کوئی ازل گر پھتا بھان کا گھوڑا نجر بھی ڈال کے دیخ سکتا''... اور فلاں محمد خاں بھی اگرچہ گدی نشین نہیں تھے مگر ''ون کے کنے سولھے سو تروار یں تھیں۔'' وہ وہ سروہیاں، تیغے، کھانڈے، کرچیں، زنبیے، کٹاریں، کھکھریاں، پیش قبض تھے کہ رہے نام مالک کا۔''

ابا کہتے تھے، مجید کو تو ریاست کے اسلحہ خانے کا داروغہ ہونا چاہیے تھا، ہتھیار دیکھ دیکھ کر اس کا خون بڑھتا رہتا۔ پھر حکومت نے حکم جاری کیا کہ تمام ہتھیار سرکاری مال خانے میں جمع کرا دیے جائیں۔ مئی دادا نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ یہ خبر سنی۔ دو روز تک مغلظات بکتے رہے۔ غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میرے دو تین بزرگوں کو اپنا ہم خیال کیا اور ابا کو مشورہ دیا کہ لائسنس والے ہتھیار بے شک جمع کرا دیے جائیں مگر کونوں کھدروں، تل گھروں میں، دھاووں پر اور دیواروں میں پرکھوں کی جو امانتیں محفوظ ہیں، ان کا کہیں کوئی اندراج نہیں ہے سو ان کو صیقل کرا کے تیار رکھا جائے۔ زمانہ خراب ہے اور پٹھان بچے تو اچھے زمانے میں بھی تیار رہتے ہیں۔

ابا علی گیرین تھے، اصول پرست آدمی تھے، انھیں حکومت کے واضح احکام کی خلاف ورزی کسی صورت منظور نہیں تھی۔ پھر ان کا کہنا تھا کہ سو پچاس برس کے دفن کیے ہوئے ہتھیار اب کھاد بن چکے ہوں گے پھر اس تردّدِ بے جا سے کیا حاصل؟ اس لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مئی دادا بظاہر مایوس ہو کر بیٹھ رہے مگر ہم لڑکے دیکھ رہے تھے کہ ان کے گرد و پیش اور ہمارے دُہرے دالانوں، دھاووں، تل گھروں، زینوں میں ایک پُراسرار سرگرمی جاری ہے جس کا ابا کو کوئی پتا نہیں۔

لائسنس دار اسلحے جمع کر دیے گئے۔ دو تانگوں میں کنبہ قبیلے کے دو چار بڑے اور مئی دادا ہتھیار لاد کر پولیس کے مال خانے پہنچے اور رسیدیں کٹوا کر خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

میں اسکول سے آیا تو دیکھا کہ مئی دادا ڈیوڑھی میں دیوار سے ٹیک لگائے سر نیہوڑائے اکڑوں بیٹھے ہیں۔ یوں لگتا تھا، اپنے کسی خون کے رشتے کو مٹی کے سپرد کر آئے ہیں۔ دکھ اتنا گہرا اتر گیا تھا کہ آج مغلظات بھی نہیں سنا رہے تھے۔ پھر جو تین چار دن بعد میرے ایک تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے گئے

تو مئی دادا لوٹ کر نہیں آئے۔

خبر آئی کہ انھیں گرفتار کرلیا گیا ہے؛ کوتوالی خاص کے لاک اپ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور مغلظات سے شغل ہے۔ ہاں ہاں کر کے تقریباً پورا قبیلہ دوڑ پڑا۔ مئی دادا ویسے تو شاید ملازم تھے مگر میرزائی خیلوں کی ڈیوڑھیوں کے پروردہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دوسرے قبیلے کے ہی سہی، پٹھان تھے... وردیوں کے نرغے میں انھیں اکیلا کیسے چھوڑا جاسکتا تھا۔

اماں تانگے میں بیٹھ ترنت اپنے پولیس بھیا کے یہاں پہنچیں اور میز پر سر وتا مار مار کر بھائی کو حکم دے دیا کہ ابھی اسی وقت مئی دادا کو گھر آجانا چاہیے۔ میاں... آج ہمارے پشتینی اہلکار کو... ایک بوڑھے کو بند کردیا ہے تم نے، تو کل ہمارے بچوں کو باندھ لے جاؤ گے۔ پرکھوں نے کیا اسی لیے اپنی تلواروں سے جنگل کاٹ کاٹ کے یہ ریاست بسائی تھی؟ آئیں! اس روز میری اماں کا جلال دیدنی تھا۔ بولتی ہی چلی گئیں۔ غالب کے شاگرد نواب یار محمد خاں شوکت کی پوتی تھیں۔ ایک جید نواب زادے کی فکرمندی، ایک توانا شاعر کی طلاقتِ لسانی اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔

ماموں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، ''مگر منجھلی آپا! پتا تو چلے کہ اسے کیوں بند کیا گیا ہے... سنیے تو... میں بھیجتا ہوں کسی کو... آپ اندر تو چلیے۔ کھانا تو کھا لیجیے۔'' مگر اماں چٹان کی طرح ان کی مردانہ بیٹھک میں جمی رہیں اور جلال کے عالم میں بیٹھی چھالیا کترتی رہیں۔ ماموں کا پورا گھر ایک ایک بسکٹ اور ایک ایک پیالی چائے پر صبر کیے انھیں گھیرے بیٹھا رہا۔ ماموں کو وردی پہن کر خود جانا پڑا۔

دو گھنٹے بعد مئی دادا ہماری ڈیوڑھی میں بیٹھے تھے اور کوئی دو درجن میرزائی خیلوں کو اپنی روداد سنا رہے تھے۔

''اجل گرفتہ'' اور وہ دوسری بات ہٹا کر میں جو سمجھ سکا، وہ یہ تھا کہ جب وہ تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے پہنچے تو حوالدار سکھیا رام؛ جو ذات کا تیلی ہے اور وردی پہننے کے باوجود کسی طرف سے سپاہی نظر نہیں آتا، اس دن مال خانے کا انچارج تھا۔ مئی دادا اور سکھیا رام کی پہلی مشترکہ بدقسمتی یہی تھی کہ ڈیوٹی پر سکھیا رام تھا۔ اگر بیلا سنگھ ٹھاکر یا گلاب خاں حوالدار ڈیوٹی پر ہوتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔

پہلے تو سکھیا نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا۔ دوسری واضح حرمزدگیاں یہ کیں کہ انھیں بڑے میاں کہہ کر مخاطب کیا اور چپراسی کے اسٹول پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ مئی دادا ایک طرف کھڑے اسے گھورتے رہے۔ آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس کی آخری اور ناقابلِ معافی بدمعاشی جس سے آتش فشاں کا ڈھکنا ایک ''بوم'' کے ساتھ اڑ گیا، یہ تھی کہ اس تیلی کے بچے نے ہمارے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار اٹھالیا اور بے نیازی سے بیڑی پیتے ہوئے اس سے اپنی پنسل چھیلنے لگا۔

یہ نواب غوث محمد خاں فتح جنگ بہادر کا پیش قبض تھا؛ جس کا قبضہ سنگِ یشب کا تھا، جس پر سنگ تراش نے پھول پتیوں کے نقش کچھ اس طرح ابھارے تھے کہ لگتا تھا موم سے ڈھال کر نکالے گئے ہیں۔ پیش قبض کے ایک چوتھائی پھل پر سونے کے پانی سے خلد آشیانی پرکھے کا نامِ نامی درج تھا اور فارسی زبان میں خبردی گئی تھی کہ یہ ہتھیار ایک ایرانی کاری گر نے بطورِ خاص نواب بہادر کے لیے تخلیق کیا ہے کہ جو زمین پر کھڑے ہو کر روبہ روشیر کا شکار کیا کرتے ہیں۔

سو پہلی بات تو یہ کہ سکھیا رام ذات کا تیلی تھا اور آخری بات یہ کہ بیڑی پیتے ہوئے نواب غوث بہادر جنت مکانی کے پیش قبض سے پنسل چھیل رہا تھا۔

مئی دادا نے ''ازل گرپھتا'' یا ''بھان کے'' کہہ کر جو ایک زناٹے کا تھپڑ مارا تو حوالدار سکھیا کی بیڑی اور پنسل دور جا پڑی پھر انھوں نے اس تیلی کے پودے کو اطلاع دی کہ یہ شیر بچوں کی میراث ہے... تیری تر کاری کاٹنے والی چھری نہیں؛ اور یہ تیرے ہاتھ لگنے سے تو نجس ہو ہی چکی تھی مگر میں نے صبر کیا اور اب جو تو بھان کے گھوڑے اس سے پنسل چھیلتا ہے، اب تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا وغیرہ۔

ظاہر ہے اس کے بعد مئی دادا کو کوتوالی خاص کے لاک اپ میں منتقل کردیا گیا۔

کوتوالی انچارج بڑے چکر میں تھا۔ تین فیتوں والے ایک چھوٹے موٹے پولیس افسر کو، جو سرکاری وردی میں ڈیوٹی پر تھا، ایک سویلین نے زدوکوب کیا تھا اور سرکاری فرائض کی بجا آوری میں مزاحم ہوا تھا۔

مگر ریاست ابھی یونین میں ضم نہیں ہوئی تھی۔

ایک پٹھان نواب ابھی ماہی مراتب کے سائے میں ریاستی گدی پر بیٹھا مقدور بھر فرماں روائی کرتا تھا اور ایک ہزار سے زائد مسجدوں کے ایک ہزار سے زائد منبروں سے ابھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا جارہا تھا کہ خلد اللہ ملکہ وسلطانہ...؛ ہر چند کہ ریاستی پرچم کا مستول ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا اور نئی دِلّی میں بات چل پڑی تھی کہ ریاست ضم کردی جائے گی۔

تو نواب کے خوش حال، نیم خوش حال، تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ اور مہذب، نیم مہذب مگر بااثر کنبہ قبیلے کے معززین، اور ذرا کم معزز، کئی سو پٹھان کوتوالی خاص کو گھیرے کھڑے تھے کہ اتنے میں ماموں پہنچ گئے۔ انھوں نے علی گڑھ سے نفسیات میں فاضل کی سند خواہ مخواہ تو نہیں لی تھی۔ دس بیس منٹ میں اپنے توپ عہدے کی دھونس دیے بغیر؛ بڑے پیار سے، اپنے اس ماتحت افسر کو قائل کرلیا کہ یہ غنڈا گردی اور فوج داری سے زیادہ تاریخ کی بازی ہارتے ہوئے ایک غیرت مند قبیلے کی جھلاہٹ اور مجروح انا کا مسئلہ ہے۔ کوتوالی انچارج ذات کا چوہان راجپوت تھا اور تلوار باندھنے والے ہارتے ہوئے ہاتھوں کی تکلیف کو شاید سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بے وقوف، غیر سپاہی ہیڈ کانسٹیبل کی وجہ سے اپنے افسرانِ بالا کے لیے مزید مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

حوالدار سکھیا رام کو جواب طلبی کا پروانہ ملا کہ ہرگاہ ہمارے علم میں آیا ہے کہ تم نے ریاست سے متعلق نہایت بیش قیمت، نادر اور تاریخی اہمیت کے حامل ایک ہتھیار کو کہ جو تمھاری تحویل میں وغیرہ وغیرہ... سکھیا رام کو لائن حاضر کردیا گیا۔

ابا نے مئی دادا کو آرام کرنے کے لیے، زمینوں پر بھیج دیا۔ یہ اس

لیے بھی ضروری تھا کہ وہ ہر کس و ناکس کو حوالدار سکھیا، سابق انچارج اسٹیٹ مال خانہ کے زوال کی داستان سناتے پھرتے تھے۔

مگر کسے معلوم تھا کہ مئی دادا کا تقریباً زوال بھی ہم لڑکوں کو دیکھنا پڑے گا۔ ایک بات پر ابا ان سے سخت ناراض ہوئے، باڑے کی ایک کوٹھری خالی کرائی گئی، اور مئی دادا کو پہلی بار ہماری ڈیوڑھی سے کچھ دور چھاؤنی چھانا پڑی۔

ہوا یوں کہ دادا کے انتقال کے بعد شاید پہلی بار ہماری ایک بہن قبیلے سے باہر بیاہی گئی۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر سخت سویلین تھا کہ اس کا تعلق کسی مارنے دھاڑنے والے قبیلے سے نہیں تھا۔ شادی کے بعد، ہمارے یہاں کے دستور کے مطابق، داماد کو لے جایا گیا کہ وہ مئی دادا کو سلام کرے اور مئی دادا اسے دو روپے سلامی کے دیں۔ ظاہر ہے، وہ اس کے بزرگ تھے۔ کوئی بوڑھا ادھیڑ اس وقت موجود نہیں تھا اس لیے ہم لڑکوں کو مقرر کیا گیا کہ داماد کو لے جا کر رسم پوری کرائیں۔ مئی دادا علیل تھے، نئے داماد کو دیکھ کر مسکرائے، جیوٹ کر کے اٹھ بیٹھے۔ ہم نے دائیں بائیں تکیے لگا دیے۔ سلام لے کر انھوں نے داماد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سلامی کے دو روپے عطا کیے اور پھر ''پشتونیات'' کی بساط پھیلا دی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک نیا داماد منھ کھولے مئی دادا کے انکشافات سنتا رہا۔ ''ساکھ سجر'' پر ایک سیر حاصل تبصرے کے بعد مئی دادا نے داماد کو بتایا کہ یہ میرزائی خیل بڑے جیوٹ والے کمٹب ہیں، خونخوار اتنے کہ ''مزال'' ہے کوئی ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے؛ اور یہ کہ جو چالیس بیالیس گھر اس محلے میں ایک ساتھ چلے گئے ہیں، یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ہر گھر نے دوسرے گھر میں ایک کھڑکی اتنی بڑی نکال رکھی ہے کہ ایک سالم آدمی مع تلوار یا ''رفل'' کے گزر سکتا ہے۔ اگر محلے کے اس سرے پر میرزائی خیلوں کے کسی گھر پر حملہ ہو تو ''دس منٹی'' میں اِس سرے سے اُس سرے تک، سو سوا سو مسلح پٹھان بچے صورتِ حال پر قابو پانے اور حملہ آور کو تہس نہس کرنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سنہ فلاں میں فلاں محمد خاں ایک ذرا سی بات پر نائب کوتوال کو مع اس کے گھوڑے کے قتل کر دینے کے بعد کھڑکیوں کھڑکیوں، گھروں گھروں گزرتے ہوئے صاف نکل گئے تھے۔ تو یہ فائدہ ہے ان مربوط مکانوں کا۔ پھر اس طرح عزیز پیاروں میں آپس میں میل محبت بھی رہتی ہے۔ اس کی مثال مئی دادا نے یوں دی؛ کہ یہ جو اپنے بچو میاں بیٹھے ہیں تو ان کے فلانے پردادے نے انھی کے فلانے پرنانے کو صرف اتنی سی بات پر قتل کر دیا تھا کہ دونوں ایک جگہ ولیمہ کھانے گئے تھے؛ پردادے پہلے سے موجود تھے کہ پرنانے آئے۔ دونوں میں جائیداد پر معمولی سا مقدمہ چل رہا تھا (ویسے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ان لوگوں میں نالشیں، فوجداریاں ہوتی ہی رہتی تھیں؛ ڈنڈم ڈنڈا، تلوارم تلوار ابھی چلتی رہتی تھی، کس لیے کہ شیر بچے ہیں آخر کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی) اب جوان کے پرنانے ولیمے کی فرشی نشست پر جانے کے لیے پاپوشیں اتارنے لگے تو ان کی ایک پاپوش ان کے اس پردادے کی پاپوش پر چڑھ گئی کہ جو پہلے سے موجود تھا اور نووارد پر کھے کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ پاپوش کا پاپوش پر چڑھنا تھا کہ ان کا پہلے والا پرکھا چمک کر اٹھا اور خبردار کہہ کر تلوار کا جو بھرپور ہاتھ مارا ہے تو دوسرے پرکھے کی گردن بھٹاسی دور جا پڑی۔

داماد کے چہرے سے پسینا بہہ بہہ کر شادی کی نئی شیروانی کے کالر میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دو تین بار پانی پی چکا تھا اور حد درجہ بے چین تھا۔ دیر بھی بہت ہو گئی تھی، ہم اسے زنانے میں لے آئے۔

دوسرے دن طوفان پھٹ پڑا۔ مئی دادا بیمار تھے، ان سے تو ابا نے کچھ نہیں کہا، اماں کے سامنے گرجتے برستے رہے کہ کیا مجید کا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ داماد کو اس قدر دہلا دیا کہ وہ گھر جا کر گم صم لیٹ گیا۔ لڑکی سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ سب باتیں صحیح ہیں؟ اور کیا تم قاتلوں، خوں خواروں کی اولاد ہو؟ کیا تمھارے یہاں بات بات پر تلوارم تلوارا ہوتی ہے؟ پوچھ رہا تھا: تمھارے گھر میں اب کتنی تلواریں ہیں؟ اور کیا سب لوگ اب بھی ولیمے کی دعوتوں میں تلواریں باندھ کر جاتے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں آسانی ہو؟ حد ہو گئی۔ آخر یہ گڑے مردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر گھرانے میں کچھ نہ کچھ پاگل پن ہوتا ہی رہتا ہے۔ تو کیا اس کو اس طرح مشتہر کیا جاتا ہے؟ لاحول ولاقوۃ!

ہفتے بھر بعد باڑے میں ایک کوٹھری تیار کر دی گئی اور مئی دادا کو وہاں فروکش ہونا پڑا۔

ڈیوڑھی سے دوران کی بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ ویسے تو انھیں ہم سب گھیرے رہتے تھے؛ مگر وہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ انھیں پتا چل گیا تھا کہ داماد والے معاملے میں میاں خفا ہو گئے ہیں اور اسی لیے ان کو ڈیوڑھی سے دور کر دیا گیا ہے۔ بڑی حسرت ناکی باڑے پر اور اس کے گرد و پیش چھائی ہوئی تھی۔ ایک روز کہنے لگے، ''اب مزید کھاں ایسپ جئ جمین کا بوجھا بنتا جا ریا ہے۔ چل چلاؤ کا ٹیم ہے۔'' وہ ابا کو بلوا کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے جا عرض کیا کہ مئی دادا بہت بیمار ہیں، آ کر دیکھ لیجیے۔ ابا آئے تو جیسے مئی دادا کھل اٹھے۔ حکیموں ویدوں کے ''نکھسوں'' پر باتیں کرتے رہے... ''ازل گرپھتا'' اور ''بھان کے'' وغیرہ بھی شروع ہو گیا۔ پھر اچانک بڑی چمک دار آواز میں، جیسے ابا کو کوئی لطیفہ سنا رہے ہوں، کہنے لگے کہ میاں، وہ داماد والے معاملے میں آپ خفا ہو گئے، شاید اسی لیے مجھے یہاں پھنکوا دیا۔ ابا نے کچھ ہوں ہاں کر دی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مئی دادا کی بیماری سے، ان کی حسرت ناکی، ان کے لطیفہ سنانے کے انداز سے؛ جو ظاہر ہے ابا کو راضی کرنے کی بڑی رقت انگیز کوشش تھی، وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ مئی دادا کہنے لگے، ''میاں! ویسے تو آپ ماسے الاّ بال بچے والے ہو، برے میرے آگو کے بچے ہو۔ میری مصلے تیں آپ نہیں سمج سکتے۔ یہ یو کہتے ہیں نا کہ داگڑ با کستن دا روجے اوّل، تو میں نے صائب جادے کو کھبر دار کر دیا ہے کہ ہاں کھبر دار! پٹھانوں سے ماملا ہے... اب صائب جادے جیادہ کج چیں پٹا کھ نہیں کریں گے انسا الاّ۔''

ابا نے اسی دن مئی دادا کی ڈیوڑھی میں بحالی کے احکام صادر کر دیے۔ تو جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ مئی دادا کی حالت بہتر ہونے لگی مگر

وہ بہت بوڑھے ہوگئے تھے، زیادہ دن چلتے نظر نہیں آتے تھے۔ اماں نے ان کی محبوبہ جمرت کو ان کی دیکھ بھال کی اجازت دے دی۔ وہ آ کر منہ دھلاتی، کپڑے بدلواتی، اپنے ہاتھ سے دلیا کھلاتی، پرچ میں انڈیل انڈیل کر چائے پلاتی۔ مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ابا نے ڈاکٹروں کو دکھایا، کئی طرح کے علاج بدلوائے مگر مئی دادا پھر سنبھل نہ سکے، گرتے ہی چلے گئے۔ ان کا آدھا بستر سمیٹ دیا گیا۔ چارپائی کی بان دوطرف سے کھینچ کر درمیان میں ایک خلا بنا دیا گیا اور اس کے نیچے تام چینی کا تسلا رکھ دیا گیا۔ حوائجِ ضروری کے لیے وہ اب بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جمرت نے ان کی صفائی ستھرائی کی سب ذمہ داری سنبھال لی تھی مگر وہ کنبے دار عورت تھی، رات میں نہیں رک سکتی تھی۔ راتوں میں، میں دیکھتا کہ ابا گرم پانی کے لوٹے لیے کئی کئی بار ڈیوڑھی کی طرف جاتے اور کئی بار کم زور سی آواز میں مئی دادا کے احتجاج کرنے اور رونے کی آواز آتی۔ وہ ابا سے خدمتیں نہیں لینا چاہتے تھے۔ اماں نے ان کی دیکھ بھال کے لیے اپنے میکے سے کوئی ملازم بلوانے کو کہا تو مئی دادا نے سختی سے منع کر دیا۔ میرے ابا ان کے سامنے کے بچے تھے، بیٹوں کی طرح تھے۔ تو بیٹوں کی بات ٹھیک ہے ''میں گیروں کے سامنے ڈھکا کھلا نہیں ہوسکتا۔ بیا! وس سے تو اچھا ہے مجھے اسپتال پنچا دیو'' مگر سب جانتے تھے، وہ اسپتال میں دو گھنٹے بھی نہیں نکال سکیں گے۔ ختم ہو جائیں گے۔ انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں مرنا چاہتا ہوں۔ وہ کئی کئی گھنٹے غشی کی حالت میں پڑے رہتے۔ دن میں جمرت اور ہم لڑکے، رات میں ابا، امکان بھران کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر سب تھک چکے تھے۔

اور اس تھکن اور بوکھلاہٹ میں جمرت کو مئی دادا کی ایک واضح ہدایت کا خیال نہیں رہا۔ وہ غشی کی حالت میں تھے کہ میں نے انھیں ''ڈھکا کھلا'' دیکھ لیا... میں نے دیکھا کہ ان کی مسلمانیاں نہیں ہوئی تھیں۔

اپنے چھوٹے سے ذہن میں بہت سے سوالات لیے میں خاموشی کے ساتھ ڈیوڑھی سے چلا آیا۔ اس نئی اور عجیب بات کی سنسناہٹ مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ چھت پر گیا، باڑے میں ٹہلا، اماں کے پاس بیٹھا۔ بہت دیر آنڈے بانڈے گھومتا پھرا۔ مگر مئی دادا بہت بیمار تھے اور وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں پھر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔

میں نے سنا، ان کے ٹھہر ٹھہر کر غصہ کرنے اور رونے کی کم زور سی آواز آ رہی تھی۔ جمرت نے شاید انھیں بتا دیا تھا کہ کیا غضب ہو گیا ہے۔

''بھان کی گھوڑی مرتے مرتے کا لک لگوادی تو نے... لڑکے کیا سوچیں گے۔'' پھر ان کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی ''ٹھی ی ی ی ک ہے۔ تیلی کا لمڈا اپٹھانوں کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔''

میں اب ڈیوڑھی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر باڑے کی طرف نکل گیا۔

تو کیا مئی دادا ساری زندگی ہم سے جھوٹ بولتے رہے؟ تو کیا محلے کے دھوبی ٹھیک کہتے تھے؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے شکر کا نام لے کر کسی نے مجھے مٹھی بھر ریت پکڑا دی ہے۔ مگر یہ بات میں کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

وہ چار دن اور زندہ رہے مگر یہ چار دن غشی اور بیداری کی بھول بھلیاں تھے۔

ان کے انتقال کے کئی مہینے بعد وہ ایک سوال جو اس سنسناہٹوں والے دن سے برابر میرے ساتھ تھا، مجھے بے چین کیے ہوئے تھا، میں نے یک بارگی ابا کے سامنے رکھ دیا۔ ابا مسجد جانے کے لیے ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے کہ مئی دادا کی کوٹھری کے سامنے مجھے خاموش کھڑے دیکھ کر رک گئے۔ آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، بولے ''کیا بات ہے؟''

میں نے بات بتا دی۔

وہ بہت دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے، ''وہ کوئی بھی تھے؛ تمھیں بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پردادوں کی طرح عزت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ... سمجھے! جاؤ اب کھیلو۔'' پھر وہ جاتے جاتے غصے سے پلٹ پڑے، ''اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے؟ کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے؟''

چٹکارا

کہتے ہیں فرانس سے آزادی کے بعد کانگو میں فرانس نے اپنا سفیر تعینات کیا۔ ایک دن فرانسیسی سفیر شکار کی تلاش میں کانگو کے جنگلات میں نکل گیا۔ چلتے چلتے فرانسیسی سفیر کو دور سے کچھ لوگ نظر آئے۔ وہ سمجھا شاید اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔ قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک آدم خور قبیلہ ہے۔ چنانچہ فرانسیسی سفیر کو پکڑ کر انہوں نے ذبح کیا، اسکی کڑاہی بنائی اور جنگل میں منگل کر دیا۔

فرانس اس واقعے پر سخت برہم ہوا اور کانگو سے مطالبہ کیا کہ سفیر کے ورثاء کو کئی ملین ڈالر خون بہا ادا کیا جائے۔ کانگو کی حکومت سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ خزانہ خالی تھا۔ ملک میں غربت و قحط سالی تھی۔ بہرحال کافی غور وخوض کے بعد کانگو کی حکومت نے فرانس کو ایک خط لکھا جس کی عبارت درج ذیل تھی:

کانگو کی حکومت محترم سفیر کے ساتھ پیش آئے واقعے پر سخت نادم ہے۔ چونکہ ہمارا ملک خون بہا ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، لہٰذا غور وفکر کے بعد ہم آپ کے سامنے یہ تجویز رکھتے ہیں کہ ہمارا جو سفیر آپ کے پاس ہے، آپ بدلے میں اسے کھالیں۔ شکریہ

اس واقعے میں کتنی صداقت ہے، یہ تو نہیں معلوم، لیکن پاکستانی عوام کے لئے ایک سبق ضرور ہے اور وہ یہ کہ انہیں آئی ایم ایف کو ایک خط لکھنا چاہیے، جس کا مضمون درج ذیل ہو:

پچھلے ستر سالوں میں ہماری حکومتوں نے جو قرضے لئے ہیں، کم وبیش سارے کے سارے، ہماری اشرافیہ اور سیاست دانوں، کے ذاتی اکاؤنٹس میں آپ ہی کے بینکوں میں پڑے ہیں، لہٰذا تجویز ہے کہ ہماری اشرافیہ کے بنک بیلنس اور اثاثے جو آپ ہی کے ممالک میں ہیں، اپنے قرض کے بدلے آپ ان سب کو کھالیں۔

دیش دروہی

شموئل احمد
(پٹنہ)

وہ درپن کی کسی بات پر اعتراض کرتا تو درپن کولڈ ہو جاتی۔۔۔!

اس کو عجیب لگتا کہ عورت بستر پر کولڈ ہو جائے۔

شادی سے پہلے اس کو پتہ نہیں تھا کہ درپن اجگری پارٹی کی کمیٹیڈ ممبر ہے۔

وہ اسے پہلی نظر میں پسند آ گئی تھی۔اصل میں ہونٹوں کے خم اس میں ہیجان پیدہ کرتے تھے۔اس کے ہونٹ دبیز تھے جو ہمیشہ بھیگے بھیگے سے رہتے جیسے بھرا گلاس شربت پی کر آئی ہو۔اوپری ہونٹ کمان نما تھا اور نچلا کمان میں جیسے پھنسا ہوا۔۔۔اک زرا دبیز۔۔۔اس کی بات چیت کا انداز بھی عجیب تھا۔دوران گفتگو ہش ہش، بھک بھک، اور ہو ہو جیسے لفظوں کا استعمال کرتی۔ایسا لگتا جیسے کوّے ہنکا رہی ہو۔اور چپ رہتی تو ہونٹ کھلے بھی رہتے اور بند بھی رہتے۔دونوں ہونٹ سکڑ جاتے اور ان میں ہلکا سا شگاف ہوتا۔۔۔جیسے اندر ہی اندر سسکیاں لے رہی ہو۔اور یہی اس کے ہیجان کا سبب تھا۔اس کے جی میں آتا شگاف میں اپنی انگلیاں پھنسا دے۔اس کو اپنی اس عجیب سی خواہش پر حیرت بھی ہوتی۔اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔؟ اس سے ہم کلام ہوتے ہوئے یہ کیسی بے قراری ہے جس میں وہ مبتلا ہو جاتا ہے۔کیا اس کے ہونٹوں کا لمس محسوس کرنا چاہتا ہے۔؟ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔لاکھ قربت کے باوجود بھی ایک دوری تھی۔اس کی ہمت نہیں تھی کہ اسے بانہوں میں بھر لیتا اور اس کے ہونٹوں پر ستارے ثبت کر دیتا۔

درپن سے پہلی ملاقات سنہا لائبریری میں ہوئی تھی۔وہ وویکا نند کی سوانح حیات ڈھونڈنے آئی تھی۔اتفاق تھا کہ اس وقت لائبریری میں وہ یہی کتاب پڑھ رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں سوانح دیکھ کر وہ چونک پڑی تھی۔

''میں یہ کتاب ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔ہو ہو ہو۔''

''ایشو کرالیں۔''اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

''بھک۔۔۔بھک۔۔۔بھک۔۔۔ایشو نہیں ہو سکتی۔''

''کیوں؟''

''ہش۔۔۔ہش۔۔۔ہش۔۔۔ایک ہی نسخہ ہے۔''

''لیجیئے۔۔۔آپ ہی پڑھ لیجیئے۔۔۔'' اس کی طرف کتاب بڑھاتے ہوئے بولا

''ہو۔۔۔ہو۔۔۔ہو۔۔۔شکریہ''

اس کو عجیب لگا۔۔۔یہ ہش ہش اور بھک بھک۔۔۔؟

اس نے غور کیا کہ وہ جب جلدی میں ہوتی ہے تو ایسے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ ہونٹ ہلتے نہیں ہیں۔بند ہونٹوں سے آواز نکلتی ہے۔لیکن جملہ ادا کرتے وقت دہانہ کھلتا ہے۔

''ہو۔۔۔ہو۔۔۔ہو۔۔۔آپ کو وویکا نند پسند ہیں۔''

''وہ سچے ہندو تھے۔سبھی مذہب کا احترام کرتے تھے۔''

''ہش ہش۔۔۔مجھے وہ بھاشن چاہیئے جو انہوں نے شکاگو میں دیا تھا۔''

''اس کتاب میں نہیں ملے گا۔میرے پاس ان کی شخصیت پر ایک کتاب ہے۔بھاشن اس میں درج ہے۔''

''ہو۔۔۔ہو۔۔۔ہو۔۔۔مجھے مل سکتی ہے یہ کتاب۔؟''

''ضرور۔''

''ہش۔۔۔ہش۔۔۔کب دینگے؟''

''ہش ہش۔۔۔اگلی ملاقات میں۔''اس نے نقل کی تو درپن ہنسنے لگی۔

دونوں نے ایک دوسرے کا فون نمبر نوٹ کیا۔

ملاقاتیں ہونے لگیں۔اس نے درپن کو کبھی اپنے فلیٹ میں نہیں بلایا۔وہ پارک میں ملتے۔گھومتے پھرتے۔کبھی ریستوراں میں لنچ لیتے۔اس دوران اس نے محسوس کیا کہ درپن ہندو سنسکرتی کی دلدادہ ہے۔متھ میں اس کی دلچسپی تھی۔اس نے یونانی متھ کا بھی مطالعہ کیا تھا اور مصری صنمیات کا بھی علم رکھتی تھی۔وہ ہنومان کی کہانی کو متھ نہیں مانتی تھی۔اسے یقین تھا کہ ہنومان جی نے سورج کو نگل لیا تھا۔وہ اکثر یونانی دیومالا کو ہندو اساطیر سے جوڑ کر دیکھتی تھی۔اس کا خیال تھا کہ کیوپڈ کام دیو کا ہی روپ ہے۔

درپن اسے اچھی لگی۔اس نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

شب عروسی میں راز کھلا کہ مرد کو عورت ہی سرور کے معراج پر پہنچا سکتی ہے۔

اور وہ حیران تھا۔یہ بات اس کے سان وگمان میں نہیں تھی کہ نئی نویلی دلہن پہل کرے۔

وہ سرخ جوڑے میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔وہ بستر پر آیا تو اس سے پہلے کہ درپن کو مخاطب کرتا درپن نے خود مینا ہاتھ میں اٹھا لیا۔اس نے اس کے چہرے کا اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے کٹورہ سا بنایا اور پلکیں چومیں۔۔۔پھر پیشانی۔۔۔پھر لب ورخسار پر بوسے ثبت کیئے۔

''میرے محبوب!''وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

''آپ کو پتہ ہے ہندو سنسکرتی میں عاشق کا تصور نہیں ہے محبوب کا ہے۔کرشن عاشق نہیں ہیں۔کرشن محبوب ہیں رادھا کے بھی۔۔۔رکمنی کے بھی۔۔۔میرا کے بھی۔۔۔گوپیوں کے بھی۔۔۔''

''میں تو تمہارا عاشق ہوں۔''

''نہیں۔۔۔آپ عاشق نہیں ہیں۔آپ میرے محبوب ہیں۔''

''چہارسُو''

وہ ایک ایک کر کے اسے کپڑوں سے بے نیاز کرنے لگی۔ پھر اس کا سینہ سہلاتی ہوئی بولی۔

''مرد کے سینے پر سر رکھ کر عورت خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔ مرد میں پیار کرنے کی چیز اس کا سینہ ہے۔''

پھر اس نے سینے پر کئی بوسے ثبت کیئے۔ نپل پر زبان پھیرا۔۔۔ وہ تڑپ اٹھا۔ عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ وہ اس کے جسم پر ہر جگہ زبان پھیر رہی تھی اور اس پر لذّت کے نئے باب کھل رہے تھے اسے پتہ نہیں چلا سحر کب ہوئی اور کیسے ہوئی۔

صبح اٹھا تو نشے میں تھا او پھر ہر صبح و شام اس پر سرشاری کی کیفیت طاری رہتی۔

صبح صبح چائے لے کر آتی۔ آنکھیں چومتی۔

''اٹھ گئے محبوب۔۔۔؟''

اس کی زندگی خوشیوں سے بھر گئی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتی تھی۔ جوتوں پر پالش کرتی۔ کپڑے دھوتی۔ کتابیں سجا کر رکھتی۔ آفس جانے لگتا تو ٹفن تیّار کرتی دروازے تک الوداع کہنے آتی۔ الوداعی بوسہ لیتی اور سرگوشیاں کرتی۔

''آجایئے گا جلدی جان۔۔۔!

وہ سر سے پاؤں تک محبّت میں سرشار تھا۔

دن گزرتے رہے۔ گل کھلتے رہے۔

لیکن پھولوں کی کیاری میں سانپ بھی رینگتے ہیں۔۔۔!

اور وہ حیران ہوا۔ اجگروں سے اتنی محبت۔۔۔؟ اسے حیرت تھی کہ پہلے پتہ کیوں نہیں چلا؟ بات بہت معمولی سی تھی۔ ذکر روس اور یوکرین کی جنگ کا ہو رہا تھا۔ درپن نے کسی اجگری لیڈر کا قول دہرایا کہ ہندوستانیوں کو یوکرین سے نکالنے کے لئے کھیانے چھ گھنٹے تک جنگ رکوادی تھی۔

وہ ہنسنے لگا۔

درپن نے چونک کر اس کو دیکھا۔

''کیوں ہنس رہے ہیں۔۔۔؟''

''عوام کو چوتیا سمجھا ہے کیا۔۔۔؟؟

درپن نے تیکھی نظروں سے اس کو دیکھا اور اٹھ کر چلی گئی۔ وہ آفس جانے لگا تو بہت خاموشی سے ٹفن کا ڈبّہ تھمایا۔ کچھ بولی نہیں۔ درپن کا یہ رویّہ اس کو اچھا نہیں لگا۔

دفتر میں اس کا دل نہیں لگا۔ درپن کی سرد مہری خلاف توقع تھی۔ شام کو گھر آیا تو گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ درپن نے خاموشی سے چائے بنائی اور ناشتے کی پلیٹ رکھ کر کمرے میں چلی گئی۔

رات بستر پر بھی فضا اجنبی معلوم ہوئی۔ وہ ایک کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے حسب معمول درپن کو بانہوں میں بھر لیا۔ لیکن اس کا جسم بھاری محسوس ہوا۔ وہ عموماً بوسے کا جواب بوسے سے دیتی تھی لیکن اس بار کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

تب اس نے درپن کو سینے سے لگا کر زور سے بھینچا۔ وہ خاموش رہی۔

''کیوں جان۔۔۔ چپ چپ ہو۔''

جان چپ رہی۔

اس نے پیشانی چومی۔ پھر پلکیں۔ پھر لب و رخسار لیکن درپن کا کوئی ردعمل نہیں تھا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''؟ کیا بات ہے۔؟''

پھر بھی چپ۔۔۔

''کچھ بولوگی۔''

''ہم لوگ تو عوام کو چوتیا بناتے ہیں۔'' آخر وہ پھوٹی

''ہاہاہا۔۔۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

اتنی سی بات۔۔۔؟ عوام تو ہے ہی چوتیا۔

اس نے درپن کو پھر آغوش میں سمیٹا۔ گردن پر بوسے ثبت کیئے۔ کان کی لوؤں کو ہونٹوں سے دبایا۔

لیکن اس کے رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

تب اس نے درپن کو بے لباس کرنا شروع کیا۔ ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیئے۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ چپ چاپ بت کی طرح پڑی رہی۔

اس نے ہر جگہ ہونٹ رکھ دیئے۔۔۔ سینے پر۔۔۔ پیٹ پر۔۔۔ ناف پر۔۔۔ نیچے۔۔۔ لیکن بندی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

عجیب عورت ہے۔ یہ کیسا احتجاج ہے۔۔۔؟

اس نے کھسیاہٹ سی محسوس کی۔ ایک نظر درپن کو دیکھا۔ وہ چاروں خانے چت پڑی تھی۔ ایک دم برہنہ۔۔۔ پتھر کی سل کی طرح بے حس۔۔۔ چھت کو گھورتی ہوئی۔ اسے نفرت کا احساس ہوا۔ کیا وہ اس عورت کا محبوب ہے۔۔۔؟ کس کی نمائندہ ہے یہ۔۔۔؟ یہ عورت ہے یا کوئی بدروح۔۔۔ یہ ننگے نظام کی پروردہ ہے جو نفرت پھیلاتا ہے۔۔۔ کیا حال کر دیا ملک کا۔۔۔؟

اس نے پھر کاسنی رنگ بکھیرنے کی کوشش نہیں کی اور بستر سے اٹھ گیا۔ ایک سگریٹ سلگائی اور بالکنی میں بیٹھ کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

درپن کو نارمل ہونے میں تین چار دن لگے۔ لیکن گھر کے کاموں میں اسی طرح مستعد رہی۔ اس کے کپڑے دھوتی۔ ٹفن تیّار کرتی۔ چائے بھی ساتھ پیتے۔ لیکن بستر پر دھند چھائی رہتی۔

''چہارسُو''

ایک دن ایک معمولی سا ویڈیو پھر وائرل ہوا۔کھیا اتوار کے روز اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ میٹرو سے جا رہا تھا۔لڑکیاں یونیفارم میں تھیں لیکن ساتھ میں اسکول بیگ نہیں تھے۔نیتا جی لڑکیوں کے بیچ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

وہ ویڈیو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

''دیکھیئے ہمارے نیتا کتنے مہان ہیں۔اسکول کی بچّیوں کی دلجوئی کر رہے ہیں۔''

اس نے ایک نظر ویڈیو پر ڈالی۔

''نیتا جی کو فوٹو کھنچانے کا بہت شوق ہے۔کبھی ندی میں ڈبکی لگاتے ہیں۔کبھی مندر کے اندر فوٹو گرافر کو لے جاتے ہیں۔کبھی منجیرہ بجاتے ہیں۔طرح طرح کے لباس میں نظر آینگے۔وہ ہنسنے لگا۔

''آپ منفی سوچ رکھتے ہیں۔''

''جو سچ ہے وہ کہہ رہا ہوں۔''

''کیا ہے سچ۔۔۔؟'' وہ چڑ گئی۔

یہ لڑکیاں اسکول نہیں جا رہی ہیں۔ان کے پاس اسکول بیگ نہیں ہے۔اتوار کے روز اسکول کھلے نہیں رہتے۔نیتا جی دو چار لڑکیوں کو لے کر میٹرو میں بیٹھ گئے۔تصویر کھنچالی ویڈیو وائرل کر دیا کہ پبلک وہی سمجھے جو تم سمجھ رہی ہو۔ گویا پبلک چوتیا ہے۔''

''آپ گندے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں؟''

''آج کی سیاست گندی ہے تو اچھے الفاظ کہاں سے آئینگے؟''

درپن اٹھ گئی۔وہ بستر پر آیا تو درپن پتھر کی سل کی طرح بے حس پڑی تھی۔

دھند سے بھرے دن پھر شروع ہو گئے۔

ایک دن اجگر پارٹی کا ایک لیڈر ملنے آیا۔اس کے ماتھے پر لمبا سا تلک کا نشان تھا۔کلائی پر لال دھاگا بندھا تھا۔چندیا صاف تھی۔آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔کھیا کو دشوگرو بتانے پر مصر تھا۔درپن بھی کھیا کے گن گان کر رہی تھی۔

اس نے خود کو بحث سے الگ رکھا تھا لیکن گفتگو نے ایسا موڑ لیا کہ وہ مداخلت کر بیٹھا۔

''کھیا تو ٹیلی پرومپٹر سے بولتے ہیں۔ٹیلی پرومپٹر خاموش تو وہ بھی خاموش۔کیا دشوگرو ایسا ہی ہوتا ہے؟''

اجگر نے اسے گھور کر دیکھا۔

''یہ سب اپوزیشن کی پھیلائی ہوئی افواہ ہے۔''

''میرے پاس ویڈیو ہے۔''

''آپ دیش دروہی ہیں۔اس قسم کا ویڈیو رکھنا اپرادھ ہے۔''

اجگری کا لہجہ بدل گیا۔

اس کو غصّہ آ گیا۔

''میں دیش دروہی ہوں اور آپ بہت دیش بھگت۔آپ جو نفرت پھیلا رہے ہیں۔دھرم سنسد میں جن سنہار کا اعلان کرتے ہیں۔موب لنچنگ کو عام کر دیا۔آپ کا کھیا کشمیر فائل کی وکالت کرتا ہے۔آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیئے۔

''کیا بول رہے ہیں آپ۔۔۔؟''

''وہی جو آپ سن رہے ہیں۔''

اجگری صوفے سے اٹھ گیا۔

''درپن جی۔میں جا رہا ہوں لیکن یہ جیل جائینگے۔''

اجگری چلا گیا۔وہ تیکھے لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

آپ دیش دروہی ہیں۔''

''آپ جانتے ہیں دیش دروہی کی سزا کیا ہے؟''

''معلوم ہے۔''

''سسٹم سے باہر جاؤ گے تو مارے جاؤ گے۔''

درپن اسے نفرت سے گھورتی ہوئی اٹھ گئی اور کمرے میں بند ہو گئی۔

اسے احساس ہوا کہ پارٹی سے درپن کا رشتہ اٹوٹ ہے۔حیرت ہوئی کہ انہیں یہ نہیں سوجھتا کہ ملک بربادی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ بے روزگاری بڑھتی جا رہی ہے۔نفرت پھیل گئی۔کھلے عام نسل کشی کے نعرے لگتے ہیں۔موب لنچنگ عام سی بات ہو گئی۔دلت لڑکیوں کا ریپ تماشہ ہو گیا۔ملک کا اثاثہ بیچا جا رہا ہے۔اور یہ خوش ہیں۔

وہ درپن کو سمجھانا چاہتا تھا کہ یہ فاشسزم کے آثار ہیں۔فاشسزم جمہوریت کے رستے آتی ہے اور جمہوریت کو ختم کر دیتی ہے۔ایسا لیڈر راشٹر کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔اپنے گرد آبھا منڈل تیار کرتا ہے۔پوری قوم پر مذہبی اصول نافذ کئے جاتے ہیں۔جو اتفاق نہیں کرتے ان کو سزا دی جاتی ہے۔ فاشسزم اپنے نشانے پر ہمیشہ اقلیت کو رکھتی ہے اور ان کے خلاف اجتماعی سوچ پیدہ کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ان پر ظلم ہوتا ہے تو اکثریت خاموش رہتی ہے۔

لیکن زبان کھولنا مشکل تھا۔وہ کچھ کہتا تو درپن کے تیور بدل جاتے۔سب سے تکلیف دہ تھا بستر پر درپن کا رویّہ۔

اور اب بے کیف دن تھے بے کیف راتیں تھیں۔اسے شب عروسی یاد آتی تھی۔پیار میں ڈوبی ہوئی وہ رات۔۔۔سرشاری کی وہ کیفیتیں۔۔۔اور اب۔۔۔؟

اب کوفت محسوس کرتا تھا۔دن بھر تو دفتر میں گزر جاتا لیکن رات ایک دم سرد ہوتی۔دھند سے بھری ہوئی۔اسے لگتا یخ بستہ موسم میں وہ ننگے پاؤں پتھریلی سڑک پر چل رہا ہے اور جھاڑیوں میں منھ چھپائے دو توام آہو بچے اسے معصوم نظروں سے تک رہے ہیں درپن دامن میں چنگاریاں چھپائے برف کی نامعلوم گزرگاہوں میں نکل گئی ہے۔

باقی صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ کیجیے

شیشے کا گھر

دیپک کنول
(ممبئی)

رحمت اللہ کشمیر کے ایک دور افتادہ علاقے پلوامہ کا رہنے والا تھا۔ گردش روزگار اُسے سری نگر لے آیا تھا۔ وہ محکمہ ٹرانسپورٹ کے ہیڈ آفس میں کلرک کی نوکری کرتا تھا۔ چونکہ وہ ٹرانسپورٹ محکمے کا ملازم تھا اسلئے وہ سرکاری بسوں کی مفت سواری کرتا تھا۔ وہ صبح پلوامہ سے آتا تھا اور چار بجنے سے پہلے اُسکے ساتھی اُسے کام سے فارغ کر دیتے تھے تا کہ وہ شام کی بس پکڑ سکے۔ اُنہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر وہ جلدی نہ نکلا تو اُس کی بس چھوٹ جائے گی اور پھر اُسے رات یہیں بتانی پڑے گی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ جب وہ بس اڈے پر پہنچا تو بس نکل چکی تھی۔ اُسے یا تو کسی مسجد میں رات بتانی پڑی یا کسی ساتھی کے گھر میں ٹھہرنا پڑا۔

وادی میں شورش کی ابتدا کیا ہوئی کہ رحمت اللہ کا ٹائم ٹیبل ہی چوپٹ ہو گیا۔ اب دیر سے بسیں چلنی بند ہو گئیں۔ حالات ایسے ہو گئے کہ رحمت اللہ ہر دن گھر سے سر پر کفن باندھ کے نکلتا تھا۔ کبھی کرفیو، کبھی ہڑتال، کبھی کریک ڈاون تو کبھی مسلح تصادم۔ رحمت اللہ کی جان آفت میں پڑ گئی تھی۔ وہ مالی لحاظ سے کافی کمزور تھا۔ زمین جائیداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس ایک بوسیدہ مکان تھا اور اُس سے لگا ساگ زار۔ یہی اُسکی کل جائیداد تھی۔ ایسے میں اگر نوکری چھوٹ جاتی تو اُسکے بچے بھوکوں مر جاتے۔ یار دوستوں اور سنگی ساتھیوں نے یہی مشورہ دیا کہ وہ پلوامہ سے جتنی جلدی ہو سکے نقل مکانی کرے اور یہاں سری نگر میں کہیں کرایہ کا مکان لے کر رہے۔ اُسنے ساتھیوں کے مشورے سے اتفاق کیا اور اُنکی مدد سے کرن نگر کے اس علاقے میں منتقل ہوا۔ یہاں آکر سر سے گویا خوف کی تلوار ہٹ گئی۔ وہ صبح گھر سے نکلتا اور پیدل دفتر پہنچ جایا کرتا تھا۔ کبھی مہینے میں ایک آدھ بار اپنے گھر کی ٹوہ لینے گاؤں جاتا اور وہاں ایک رات بتا کر دوسرے دن واپس چلا آتا تھا۔

حالات دن بہ دن ابتر ہو رہے تھے۔ اب پیش گوئی بھی حالات کی متلون مزاجی کے آگے ہار مان چکے تھے کیونکہ پل پل میں حالات بدل جاتے تھے۔ ایسے میں کسی پیشگو کے لئے پیشن گوئی کرنا آسان نہ رہا تھا۔ رحمت اللہ یہاں آکے خوش نہیں تھا۔ اُسے رات کو سوتے ہی اپنا گھر، اپنے کھیت کھلیان، اپنی چراگاہیں اور اپنا اڑوس پڑوس یاد آجاتا اور وہ بن آب ماہی کی طرح تڑپنے لگتا تھا۔ بچے بھی اپنے ساتھیوں کو یاد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہاں کے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال نہیں پایا تھا۔ وہ سویرے گھر سے نکلتا۔ شام کو جب لوٹتا تو کسی سے ملنے جلنے کی بجائے اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں قید کر کے رکھ دیتا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے تین مہینے سے زیادہ ہو چکے تھے مگر ان تین مہینوں میں وہ صرف دو تین لوگوں کو ہی جان پایا تھا۔ ان جان پہچان والوں میں میں ایک پنڈت تھا جس کا مکان رحمت اللہ کے مکان کے ٹھیک سامنے تھا۔ یہ پہچان بھی گھر کے باہر ہوئی تھی۔ کبھی دونوں اطراف میں سے کسی ایک نے ایک دوسرے کے گھر میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ دراصل لوگ ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ ایسا پہلے نہیں تھا۔ گھروں کے دروازے ایک دوسرے کے لئے صدا کھلے رہتے تھے۔ حالات نے اعتماد کی فضا کو اس حد تک مکدر کر دیا تھا کہ لوگ گھروں کے دروازے ایک پل بھی کھلے نہیں چھوڑتے تھے۔ طرفہ یہ کہ لوگ تو اب اپنے سایے سے بھی خوف کھانے لگے تھے۔

رحمت اللہ کا مالک مکان بڑا ہی نیک اور پارسا آدمی تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار کرایہ لینے آتا تھا۔ باقی کے اُنتیس دن وہ بھولے سے بھی یہاں کا رخ نہیں کرتا تھا۔ اتنی آزادی کے باوجود رحمت اللہ اس مکان میں خوش نہیں تھا۔ ہر پل اُسے یہی احساس ہوتا کہ وہ کسی اور کے گھر میں رہ رہا ہے۔ وہ جو اپنے گھر کے ہونے کا ایک لطیف احساس ہوتا ہے اُسکے اندر کا وہ احساس ہی مر چکا تھا۔ وہ بہت دنوں سے اس تلاش میں تھا کہ اُسے اسی علاقے میں کوئی جگہ مل جائے جہاں وہ اپنا آشیانہ تعمیر کر سکے۔ اُسنے کئی دلالوں سے بات کی۔ کئی مکان دیکھے۔ بیل منڈھے چڑھی نہیں۔ کہیں قیمت زیادہ تھی تو کہیں جگہ کم تھی۔ تین مہینے سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔

اُسکے سامنے والے مکان میں جو پنڈت رہتا تھا اُسکا نام پشکر ناتھ تھا جو کہ محکمہ مال میں ملازم تھا۔ وہ اُسے کبھی آتے جاتے مل جاتا۔ اُسکے گھر میں اور کتنے لوگ رہتے ہیں، نہ اُسنے کبھی جاننے کی کوشش کی اور نہ ہی پشکر ناتھ نے اُسے بتانے کی ضرورت سمجھی۔ وہ سڑک پر جب کبھی ملتے تو ہائے ہیلو کر کے نکل جاتے۔ جب حالات انتہائی ابتر ہو گئے تو کشمیری ہندوں نے ایک ایک کر کے نقل مکانی شروع کی۔ پشکر ناتھ بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اسلئے رکا تا کہ کوئی مل جائے جس کے ساتھ مکان کا سودا ہو جائے۔ اور کوئی وقت ہوتا تو اُسے اس مکان کے عوض اچھے خاصے پیسے مل جاتے مگر حالات ایسے تھے کہ وہ اس بات کی بھنک بھی کسی کو لگنے نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے جا رہے ہیں۔ بیشتر ہندوں نے اپنے پیچھے سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور وہ آگے ہاتھ اور پیچھے پات لے کے بھاگے تھے۔ پشکر ناتھ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جو یہاں سے بھاگ کر جموں میں پناہ لے کے بیٹھے ہیں وہ بڑی کسمپرسی کی حالت میں جی رہے ہیں۔ اسلئے وہ اونے پونے داموں میں ہی گھر فروخت کر کے نکلنا چاہتا تھا تا کہ اُسے جموں میں دھکے کھانے نہ پڑیں۔ اُسے اس بات کی آگہی تھی کہ رحمت اللہ بہت دنوں سے ایک مکان کی تلاش میں ہے۔ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ رحمت اللہ ہی وہ واحد انسان ہے جس پر وہ بھروسہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ یہاں کا نہیں تھا۔ وہ گاؤں سے یہاں آیا تھا اور اُسکا میل جول بہت کم لوگوں سے تھا اسلئے وہ ایک رات گھر میں کسی کو کچھ بتائے بنا

''چہارسُو''

دبے قدموں کے ساتھ نکلا اور کوچہ پار کر کے رحمت اللہ کے گھر کے باہر کھڑا ہو گیا۔ رحمت اللہ سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اُسکا ماتھا ٹھنکا۔ من میں طرح طرح کے وسوسے سر اُٹھانے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب رات کو دروازے پر دستک موت کی دستک سے تعبیر کی جاتی تھی۔ رحمت اللہ نے ایک پل کچھ سوچا اور دوسرے پل وہ ہمت کر کے اُٹھا اور اُسنے دروازہ کھولا۔ سامنے پشکر ناتھ کھڑا تھا۔ اطمینان کا سانس لے کر اُسے اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ اندر آ کے پلاسٹک کی کرسی بیٹھ گیا۔ رحمت اللہ نے پوچھا۔

''پہلی بار میرے غریب خانے پر آئے ہو اسلئے بتاؤ کیا پیو گے؟''

''میں اس وقت یہاں کھانے پینے نہیں بلکہ تم سے ایک کام کی بات کرنے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت دنوں سے کسی مکان کی تلاش میں ہو۔''

''ہاں یہ سچ ہے کہ میں بہت دنوں سے ایک مکان ڈھونڈ رہا ہوں۔ اب کرایے مکان میں رہنے کو دل نہیں کرتا''

''میں اپنا مکان بیچ کے جا رہا ہوں۔ تم خریدو گے کیا؟''

''بھائی تمہارا مکان خریدنے کی حیثیت نہیں ہے مجھ میں۔ تم بیس تیس لاکھ مانگو گے۔ میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے؟''

''تم بتاؤ تم کتنا دے سکتے ہو؟۔''

''سچ بتاؤں، میں اب تک مکان کیوں نہیں خرید سکا۔ میرا کل بجٹ تین لاکھ روپے ہیں۔ میں اگر کہوں کہ مجھے تین لاکھ میں اپنا مکان بیچو گے تو تم مجھے گالیاں دے کے چلے جاؤ گے؟''

پشکر ناتھ چند لمحے خاموش رہا۔ جس مکان کی مالیت تیس پینتیس لاکھ تھی وہ اُس مکان کو کسی بھی قیمت پر بیچنا چاہتا تھا کیونکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ کوئی بھی اُسکی مجبوری کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اُسنے سوچا کچھ نہ ملنے سے بہتر ہے کہ جو مل رہا ہے وہی لے کے چلا جائے۔ کیا پتا کہ پھر کبھی یہاں آنا نصیب ہوگا کہ نہیں۔ اُسنے بھاری من سے کہا۔ ''میں مجبور نہ ہوتا تو تین لاکھ میں اپنے مکان کی بالا دری بھی نہ بیچتا۔ کیا کروں اس وقت ہماری جان پر بن آئی ہے۔ آج ہیں پتا نہیں کل ہونگے بھی کہ نہیں اسلئے مجھے یہ سودا منظور ہے''

رحمت اللہ پر جیسے شادمرگی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ جو بات وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا، وہ بات حقیقت بنتی جا رہی تھی۔ اتنا بڑا گھر اُسے اتنے سستے داموں میں ملنے جا رہا تھا۔ اُسنے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پشکر ناتھ سے کہا۔ ''ابھی کتنا چاہیے؟''

''اگر تم مجھے ابھی ایک لاکھ دے سکتے ہو تو میں آج ہی یہ گھر خالی کر دوں گا۔ باقی کے پیسے لے کے تم جموں چلے آنا۔ ہم وہیں پر کاغذات بنوالیں گے۔ تم کاغذات لے جانا اور مجھے باقی کے دو لاکھ دے جانا''

رحمت اللہ نے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ اندر والے کمرے میں گیا اور وہاں سے ایک لاکھ روپے لے کے آ گیا۔ بیوی نے کچھ پوچھنا چاہا۔ اُسنے اُسکی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ ایک بوسیدہ ٹرنک میں سے نوٹ نکال کر باہر چلا گیا اور پھر پشکر ناتھ کے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈیاں تھماتے ہوئے بولا۔

''تم اس گھر میں جب تک چاہو رہ سکتے ہو۔ بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا''

''اگر یہاں رہنا ہی ہوتا تو میں اتنے سستے میں تم سے گھر کا سودا کیوں کرتا۔ یہاں اب ہمارے لئے زمین تنگ ہو رہی ہے۔ میری برادری کے بیشتر لوگ یہاں سے نقل مکانی کر گئے ہیں۔ میں اس اُمید کے ساتھ بیٹھا تھا کہ آج نہیں تو کل حالات سدھر جائیں گے مگر حالات تو بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب یہاں پھر سے وہ پہلی جیسی شانتی بنے گی اسلئے ہم نے آج آدھی رات کو یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔'' کہتے کہتے اُسکی آواز بھر آئی۔ رحمت اللہ نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا

''ہم کونسے سلامت ہیں یہاں میرے بھائی۔ ہم بھی پلوامہ چھوڑ کے یہاں چلے آئے۔ جہاں انسان اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرے اُس جگہ کو چھوڑنا ہی دانشمندی ہے۔ تم تو جموں جا کے محفوظ ہو ہم تو نہ وہاں اور نہ ہی یہاں محفوظ ہیں۔''

''میں اس وقت عجلت میں ہوں۔ میں جانے سے پہلے تمہیں گھر کی چابی دے کے جاؤں گا۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھ سے گھر کے کاغذات لے کے جانا۔ اس زندگی کا کیا بھروسہ۔''

''اس وقت تم اپنے بارے میں سوچو۔ میں کبھی بھی آ کے کاغذات لے جاؤں گا۔ مجھے تم پر پورا پورا بھروسہ ہے''

کہہ کر وہ پشکر ناتھ کے گلے ملا۔ پشکر ناتھ قدرے جذباتی ہو گیا۔ اُسکی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا چلا گیا۔

رحمت اللہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اُسکی مراد اتنی جلدی پوری ہو جائے گی یہ اُسنے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اُسنے پشکر ناتھ کا گھر اندر سے تو نہیں دیکھا تھا البتہ باہر سے وہ ہر روز اس مکان کو دیکھتا تھا۔ بہت ہی بڑا اور خوبصورت مکان تھا۔ صحن بہت بڑا تھا۔ چھت بھی ٹین کی تھی۔ اُسنے اندازہ لگایا کہ اس مکان میں کل ملا کر آٹھ دس کمرے ہونگے۔ رات کے دو بجے پشکر ناتھ نے روتے روتے اُسے گھر کی چابیاں تھما دیں اور پھر وہ سسکتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ اُسنے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ رحمت اللہ خوشی سے اسقدر شرابور تھا کہ پشکر ناتھ کی آہیں اور آنسو نہ اُسے سنائی دئے اور نہ دکھائی دئے۔ وہ رات بھر مارے خوشی کے سو نہیں پایا۔

اگلی صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو سب سے پہلے وہ گھر سے نکل کر مکان کا جائزہ لینے نکلا۔ گھر کے دروازے پر آہنی تالا لگا تھا۔ اُسنے جیب میں پڑی چابیوں کو چھو کر دیکھا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا تو وہ سینہ تان کے مکان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بہت دیر تک اس مکان کو

باہر سے ہی نہارنے لگا۔

مکان میں داخل ہونے سے پہلے وہ کسی مولوی سے قران شریف کی تلاوت کرانا چاہتا تھا۔ یہ مکان اب اُسکا مستقل گھر بننے جارہا تھا اسلئے اس میں مذہبی رسومات کے ساتھ جانا ہی سود مند سمجھتا تھا۔ایک دوروز ایک مولوی کو ڈھونڈنے میں نکل گئے۔تیسرے روز ایک مولوی ملا۔اُسنے ہزار روپے مانگے۔ ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ وہ تلاوت سے پہلے گھر کی پوری صفائی کروا کے رکھے۔ رحمت اللہ نے مولوی کی ہر تجویز کو لبیک کہا اور اُسے پانچ سو ایڈوانس دے کر وہ فرحان وشاداں گھر کی جانب چل پڑا۔

رات بہت ہوچکی تھی اسلئے وہ جلدی سے کھانا کھا کے سوگیا۔سونے سے پہلے اُسنے بیوی سے تاکید کی کہ وہ صبح نہ صرف خود جلدی اُٹھے بلکہ بچوں کو بھی نیند سے اُٹھالے کیونکہ اتنے بڑے مکان کی صفائی اُسکے اکیلے کے بس کی بات نہیں بلکہ سب مل جل کر ہی یہ کام کرپائیں گے۔یہ کہہ کر وہ رضائی لے کے لیٹ گیا۔صبح چار بجے کے قریب رحمت اللہ کی بیوی نے سب کو جگایا۔چائے اُسنے پہلے ہی چولھے پر چڑھا کے رکھی تھی۔بچے ابھی تک نندا سا کے عالم میں تھے۔وہ چاہ کر بھی اپنی آنکھیں کھول نہیں پارہے تھے۔رحمت اللہ نے اُنہیں ہلایا جلایا۔تب جا کے نندا سا کے عالم سے باہر آئے اور جاکر منہ دھونے چلے گئے۔

صبح پانچ بجے کے قریب یہ گھر سے جھاڑو اور پونچھا لے کے نکلے۔ رحمت اللہ سب سے آگے تھا۔ پیچھے پیچھے اُسکے تین بچے اور بیوی تھی۔اُسنے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا۔پھر وہ سب دروازہ کھول کے مکان کے اندر داخل ہوگئے ۔اندر کی سجاوٹ دیکھ کے وہ بلیوں اُچھل پڑے۔گھر میں سب کچھ جوں کا توں پڑا تھا ۔قیمتی صوفے۔عمدہ غالیچے۔کھڑکیوں پر خوبصورت پردے۔رحمت اللہ خوشی سے دوہرا ہوئے جارہا تھا۔اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ تین لاکھ روپے میں اُسے اتنا عالیشان گھر ملا تھا۔وہ بےصبری سے ایک ایک چیز ٹٹول کے دیکھنے لگا۔پھر وہ کمرے گننے لگا۔نیچے کے کمرے گنتے گنتے جب وہ پہلی منزل چڑھا تو دائیں جانب جو بیڈروم پڑتا تھا اُسمیں قدم رکھتے ہی اُسکی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔بیڈ پر ایک ضعیف آدمی لیٹا کراہ رہا تھا۔جونہی اس بوڑھے نے رحمت اللہ کو دیکھا وہ ہڑبڑا کے چلاّنے لگا۔"کون ہوتم۔بنابتائے تم میرے گھر میں داخل کیسے ہوگئے؟"

رحمت اللہ بدحواس ہو کے ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر اُسکے سامنے ہاتھ جوڑ کر اُسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کاکا میں کوئی چور نہیں ،سامنے والے گھر میں رہنے والا آپ کا پڑوسی ہوں۔میرا نام رحمت اللہ ہے۔آپ باہر جاکے کسی سے پوچھ لو۔خدا کی قسم میں سچ بول رہا ہوں۔بات یہ ہے کہ تین دن پہلے پشکر ناتھ مجھ سے اس مکان کا سودا کرکے گیا۔شاید وہ آپ کا بیٹا ہے۔پیشگی کے طور اُسنے مجھ سے ایک لاکھ روپے بھی لئے۔"

رحمت اللہ کی بات سن کر وہ بڈھا غصے سے اوپر نیچے ہونے لگا۔اُسنے بپھرے ہوئے انداز میں رحمت اللہ سے کہا"وہ اس گھر کا سودا کرنے والا کون ہوتا ہے۔اس گھر کا مالک میں ہوں۔میرے جیتے جی وہ اس گھر کو کیسے بیچ سکتا ہے۔جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔دوبارہ میرے گھر میں بھولے سے بھی قدم رکھنے کی کوشش مت کرنا میں ریٹائرڈ پولیس افسر ہوں۔نام ہے میرا دوارکا ناتھ۔ایک ٹیلی فون کروں گا نا تو ابھی تم کو جیل میں ڈال دیا جائے گا۔اب دفع ہوجاؤ یہاں سے۔دوبارہ مت آنا"

رحمت اللہ کا جی بیٹھنے لگا۔جو خوشی چند لمحے پہلے اُس کے دل میں ہلکورے ماررہی تھی وہ ایک دم غائب ہوگئی اور وہ ایسے کھڑا رہا جیسے اُسے لقوہ مار گیا ہو۔اُسکے چہرے پر مردنی چھا گئی۔اُسے کوئی جواب سوجھ نہیں رہا تھا۔اُسے لگ رہا تھا جیسے سر منڈھاتے ہی اولے پڑ گئے ہوں۔پشکر ناتھ تو ایک لاکھ روپے لے کے نکل گیا تھا۔اُسکے پاس نہ کوئی دستاویز نہ کوئی گواہ تھا۔وہ لوگوں کو کیسے یقین دلاتا کہ اُس نے اس گھر کا تین لاکھ میں سودا کیا ہے۔کوئی اُس کی بات کا اعتبار ہی نہیں کرتا۔لاکھ تو خاک ہوگیا تھا ساتھ میں اُسے لینے کے دینے پڑ جاتے کہ وہ زبردستی کسی کے مکان پہ قبضہ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔اُسکا دل ڈولنے لگا۔ برسوں سے پائی پائی جوڑ کر اُسنے جو رقم جمع کی تھی وہ یوں چلی گئی تھی جیسے کوئی اُسکی جیب کاٹ کے لے گیا ہو۔وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نیچے آگیا اور اپنے بچوں اور بیوی کو لے کر تیزی سے مکان سے نکل گیا۔اُسکی بیوی اُسکے اچانک برتاؤ سے سناٹے میں رہ گئی۔جب وہ اپنے گھر پہنچے تو اُسنے دیکھا کہ اُسکے شوہر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔اُسنے ہمت کرکے پوچھا۔

"کیا ہوا۔تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے اس مکان کا سودا کیا پھر تم صفائی بیچ میں چھوڑ کے ہمیں وہاں سے کیوں لے آئے؟"

وہ روہانسا ہوکے بولا۔"ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے۔پشکر ناتھ کا باپ زندہ ہے اور وہ اس مکان میں موجود ہے۔اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اُسکے بیٹے نے اُس سے پوچھے بنا اس مکان کا سودا ہمارے ساتھ کیا ہے۔اگر ہم کچھ دیر اور رکتے اور وہ بڑھا چلاتا کہ یہ لوگ مجھے مارنے آئے ہیں تو کوئی ہماری نہیں سنتا۔لوگ ہمیں پیٹ پیٹ کے مار ڈالتے۔"

"مرے پر سودرّے۔ہماری خون پسینے کی کمائی وہ پنڈت لے گیا اور ہمیں چھوڑ گیا سر پیٹنے کے لئے۔میں نے کتنی بار تمہیں سمجھایا کہ لالچ مت کیا کرو۔دیکھا لالچ کرنے کا نتیجہ۔بڑے پھدک رہے تھی کہ ہماری تقدیر کھل گئی۔تیس چالیس لاکھ کا مکان تین لاکھ میں مل گیا۔تقدیر کھلی نہیں بلکہ بگڑ گئی۔وہ کہتے ہیں نا نصیبوں کے ملیا پکائی کھیر ہوگیا دلیا۔اب کس کے آگے فریاد کرو گے۔کسے اپنا دکھڑا سناؤ گے؟"

رحمت اللہ سر جھکائے بیوی کی جلی کٹی سن رہا تھا۔غلطی اُسی کی تھی۔ اُسنے عجلت میں کسی سے صلاح مشورہ کئے بنا سودا کیا تھا۔کسی کو گواہ بھی نہیں بنایا۔ چپ چاپ پشکر ناتھ کے ہاتھ میں ایک لاکھ روپے تھمادیا۔یہ بھی پتا نہیں کیا کہ یہ

''چہار سُو''

مکان کس کے نام پر ہے۔ باپ کے ہوتے ہوئے پشکر ناتھ مکان بیچنے کا مجاز تھا ہی نہیں۔ اب یہ بڈھا کب مرے گا۔ کب پشکر ناتھ کے نام پر یہ گھر منتقل ہوگا۔

دو دن اُسنے بڑے قلق و اضطراب میں گزارے۔ بس اندر ہی اندر روتا اور آہیں بھرتا رہا۔ کسی کے ساتھ اپنا دکھ نہیں بانٹا۔ سوچا کہ جس کو بھی اپنی کہانی سناوں گا وہی مذاق اُڑائے گا۔ کوئی درد کا مداوا ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ زخم کو ہی کریدے گا اسلئے اُسنے کسی کو نہ بتانا ہی مناسب سمجھا۔ وہ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح اس بات کو بھولنے کے جتن کرنے لگا مگر لاکھ روپے کو بھولنا اتنا آسان نہ تھا۔ جب بھی روپے کی یاد آتی تھی تو جی لہولہو ہو جاتا۔

اس واقعے کے بعد اُس کے گھر میں ماتم کا ماحول تھا۔ اُسکی بیوی سارہ تو بس رات دن آنسو بہاتی اور پشکر ناتھ کو کوسنے دیتی رہتی۔ اُس کا ماننا تھا کہ پشکر ناتھ نے اُنہیں ٹھگا تھا۔ وہ اس بڈھے کی موت کی دعائیں مانگنے لگی تھی کہ یہ بڈھا جلدی سے اس دنیا سے اُٹھ جائے اور ان کی کشتی کنارے لگ جائے۔ ایک دن رحمت اللہ جب دیر سے گھر لوٹا تو پشکر ناتھ کے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُسے دوار کا ناتھ کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹھک کے رک گیا۔ ایسا لگا جیسے زمین نے پیر پکڑ لئے ہوں۔ اس بڈھے کو دیکھے یا نہ دیکھے وہ چند لمحے اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ جس طرح وہ اُس سے اُس دن پیش آیا تھا اُسے یاد کر کے وہ سہم گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُسنے ہمت کر کے مکان کے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ جب کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ دوار کا ناتھ درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ وہ اُس کے سرہانے بیٹھ کر اپنایت بھرے لہجے میں پوچھنے لگا۔

''میں آپ کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ میں نے آپ کے کراہنے کی آواز سنی۔ رہا نہیں گیا اندر چلا آیا۔ مجھے غلط مت سمجھنا۔ کیا بہت درد ہو رہا ہے؟''

''ہاں۔ میرے پیٹ میں السر ہے۔ دو دو بیٹوں کے ہوتے ہوئے میں اس بیماری کا ٹھیک ڈھنگ سے علاج نہ کرا سکا کیونکہ میں سہارے کے بنا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میں پچھلے ایک سال سے بستر پر پڑا ہوں اور بال بچوں کے ہوتے ہوئے بھی اناتھ کی طرح جی رہا ہوں۔ ایک تو پہلے ہی گھر کے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ دوسرا اپنے عیال کو لے کے جموں چلا گیا۔ مجھے یہاں چھوڑ دیا مرنے کے لئے۔ پچھلے آٹھ دن سے اکیلا ہوں۔'' رحمت اللہ نے اُسے تسلی دیکر کہا۔

''یہ مت سوچو کہ آپ کا کوئی نہیں۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا، اُن کا خدا ہوتا ہے۔ آپ بیمار ہو۔ چلئے میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے کے جاتا ہوں''

''جب میرے بچے مجھے یہاں مرنے کے لئے اکیلا چھوڑ گئے تم کیوں میرے غمخوار بننا چاہتے ہو۔ کہیں تم مجھ سے ہمدردی جتا کر میرا مکان ہتھیانا تو نہیں چاہتے؟''

اُس کے جی میں آیا کہ کہہ دے۔ ہاں میں اسی لئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں تا کہ میں یہ مکان اپنے نام کر سکوں کیونکہ تمہارے بیٹے نے اس مکان کا سودا مجھ سے کیا ہے۔ اس سودے کے بیچ تم آڑے آ رہے ہو اور جب تک تم ٹلو گے نہیں یہ مکان میرا ہو نہیں پائے گا اور میں یونہی درد کے انگاروں پر سلگتا رہوں گا۔ پر وہ یہ سب کہہ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اس معاملے میں وہ ماہر کھلاڑی تھا۔ اُسنے اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''یہ مت سوچنا کہ یہ سب کچھ میں اپنے غرض کے لئے کر رہا ہوں۔ میں یہ انسانیت کے ناتے کر رہا ہوں۔ ایک انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ میں نے اپنے والد کو بچپن میں کھو دیا تھا۔ آج اگر تمہاری جگہ وہ ہوتے تو کیا میں اُنہیں ڈاکٹر کے پاس لے کے نہیں جاتا۔ اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ اُٹھو میرا ہاتھ تھام لو۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کے جاتا ہوں۔''

رحمت اللہ کی باتیں سن کر دوار کا ناتھ بچے کی طرح بلک بلک کے رونے لگا۔ اُسکے بچوں نے اُسے بوجھ سمجھا تھا اسلئے وہ اُس سے دور بھاگتے تھے۔ یہ تو اس کا کچھ بھی نہیں لگتا پھر بھی اُس سے پیار جتا رہا تھا۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے کے جا رہا تھا۔ وہ اُسکا سہارا لے کے کھڑا ہو گیا۔ رحمت اللہ اُسے ایک آٹو میں بٹھا کر پاس ہی کے سی ایچ ایم اسپتال میں بھرتی کرا کے آ گیا۔ اُسکی حالت دیکھ کر یہی لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دن جی نہیں پائے گا اسلئے وہ اُسے اسپتال میں پھینک کے آ گیا تھا۔

سارہ بھی رو رو کر خدا سے یہی دعا مانگ رہی تھی کہ اس بڈھے کو جلدی اُٹھا لے۔ رحمت اللہ اپنے دماغ میں نئے نئے منصوبے بنا رہا تھا۔ اُسنے ایک عرضی نویس سے دوار کا ناتھ کی ایک وصیت تیار کروالی جس میں یہ لکھا تھا کہ اُسنے یہ مکان رحمت اللہ کو بیچ دیا ہے۔ اب وہ موقع کی تاک میں تھا کہ کسی طرح وہ دوار کا ناتھ کے دستخط اس وصیت پر لے سکے۔ وہ روز اُسے اسپتال دیکھنے اس لئے چلا جاتا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے دوار کا ناتھ کے دستخط اس کاغذ پر لے سکے۔ ایک دن جب وہ غنودگی کے عالم میں تھا اُسنے دوار کا ناتھ کے ہاتھ میں قلم تھما دیا اور اُسے اس کاغذ پر دستخط کرنے کے لئے کہا۔ دوار کا ناتھ نے غنودگی کے عالم میں اس کاغذ کو پڑھا اور پھر وہ کاغذ دستخط کئے بنا اُسے لوٹا دیا۔ اس معاملے میں تو وہ اُس سے بڑا گھاگ تھا۔ اُسنے اُسکے سبھی منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔

سارہ اپنے شوہر سے پوچھتی۔ ''ابھی اور کتنے دن یہ بڈھا جینے والا ہے؟''

رحمت اللہ سارہ کو خوش کرنے کے لئے کہتا۔ ''ہفتے عشرے میں اُسے بلاوا آنا چاہیے۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اُسے کینسر ہو چکا ہے۔ وہ ایک آدھ مہینے سے زیادہ جی نہیں پائے گا۔ ہمیں ایک آدھ مہینہ انتظار کرنا ہوگا''

وہ پندرہ روز تک اسپتال میں زیر علاج رہا۔ رحمت اللہ اپنا کام دام چھوڑ کے اُسکی تیمارداری میں لگا رہا۔ وہ اس بڈھے کو کسی بھی طرح اپنا گرویدہ بنانا چاہتا تھا تا کہ وہ خوشی خوشی یہ گھر اُسے سونپ کے جائے۔ پندرہ روز کے اندر رحمت اللہ نے اُسے پوری طرح شیشے میں اُتار لیا تھا۔ وہ بات بات پہ اُسی کے قصیدے پڑھتا رہتا تھا۔ اپنی اولاد کو تو وہ بھول چکا تھا۔ اُسکے ہونٹوں پر فقط رحمت اللہ کا نام تھا۔ پندرہ روز بعد جب وہ پوری طرح روبہ صحت ہو گیا تو اُسے اسپتال سے چھٹی ملی۔ رحمت اللہ اُسے گھر لے آیا۔

سارہ نے جب اُسے آٹو سے اُترتے دیکھا تو اُسکی چال دیکھ کے وہ

ٹھٹھک کے رہ گئی۔ وہ تو اُسکی موت کی خبر سننے کے لئے بے چین تھی یہ تو چست و چالاک ہو کے لوٹا تھا۔ پہلی بار اُسنے اپنے شوہر کو من ہی من میں خوب کوسنے دئے۔ جب وہ اُسے اپنے گھر میں چھوڑ کے آیا تو سارہ اُس پر برس پڑی۔

''تو تو کہہ رہا تھا کہ اسے کنسر ہو چکا ہے اور یہ ہفتہ پندرہ دن سے زیادہ جینے والا نہیں مگر اسکی چال دیکھ کے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ اتنی جلدی ٹلنے والا نہیں۔؟''

''ارے میں کوئی نعوذ باللہ خدا ہوں کہ کہہ دیا کہ یہ دس دن میں مرے گا تو دس دن میں ہی مرنا چاہے۔ زندگی لینا اور دینا اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک اسکا آب و دانہ ہوگا تب تک یہ جی لے گا۔ آسمیں نہ تیری دعائیں اور نہ ہی میری تدبیریں کوئی کام کر پائیں گی۔''

سارہ روہانسی ہو کر کچن میں چلی گئی اور وہیں بیٹھ کر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

دوسرے دن جب رحمت اللہ دوار کا ناتھ کو چائے دینے گیا تو وہ بڑا اُداس تھا۔ اُسنے رحمت اللہ کو اپنے سامنے بٹھایا اور پھر اُس سے کہا۔

''تم مجھ سے میری وصیت پر دستخط لینا چاہتے تھے نا۔؟''

رحمت اللہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ چہرے کا رنگ ایسے اُڑ گیا جیسے اُسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ دوار کا ناتھ اُسے سہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم نہ کہتے تب بھی میں یہ مکان تم کو ہی دینے والا تھا۔ تم نے میری جتنی سیوا کی ہے اسکے عوض یہ مکان کچھ بھی نہیں ہے۔ چل نکال وہ کاغذ میں اُس پر دستخط کرتا ہوں''

دوار کا ناتھ کے اس برتاو سے رحمت اللہ کا کلیجہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اُس نے جیب سے وہ کاغذ نکالا اُسکے پرزے پرزے کئے اور پھر وہ دوار کا ناتھ کے قدموں میں گر کر پھپھک پھپھک کے رونے لگا۔

بقیہ: دیش دروہی

اس نے فیصلہ کر لیا کہ درپن سے الگ ہو جائے گا۔ اسے درپن کی آنکھوں میں سفا کی نظر آتی۔ وہ اس سے آنکھیں ملانے میں بھی ڈرنے لگا تھا۔ رہ رہ کر وہ جملہ کانوں میں گونجتا۔ سسٹم سے باہر جاؤ گے تو۔

''ہم کیوں نہ الگ ہو جائیں؟''

''میں بھی یہی سوچ رہی۔''

اس نے کورٹ میں طلاق نامہ دائر کیا۔

اس دن درپن نے بہت لذیذ کھانے کا اہتمام کیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنا اہتمام کیوں جب کہ طلاق نامہ دائر ہو چکا ہے۔ وہ کھانے کی میز پر بیٹھی لیکن ساتھ کھایا نہیں۔ اس کو لگا درپن کی آنکھوں میں سفا کی بڑھ گئی ہے۔ بستر پر آیا تو وہ چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ وہ بھی ایک کروٹ لیٹ گیا۔ اس نے سونے کی کوشش کی لیکن عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ اٹھ کر پانی پیتا لیکن پیاس بجھتی نہیں تھی۔ بے چینی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ رہ رہ کر وٹ بدلنے لگا۔ درپن اس سے لاتعلق ایک طرف کروٹ بدل کر لیٹی تھی۔ اس کے جی میں آیا درپن کو مخاطب کرے لیکن یہ سوچ کر چپ رہا کہ جواب نہیں دیگی۔۔۔ جسم بھی پسینہ دے رہا تھا۔ اور پھر پیٹ میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہونے لگا۔ اس کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا اور در و دیوار پر کمزور سی خامشی رینگ رہی تھی اور بغل میں سوئی ہوئی تھی ایک ٹھنڈی عورت جو یقیناً جاگ رہی تھی۔ ایک پل کے لئے اس نے سوچا کہ وہ اس کا کبھی محبوب تھا اور آج۔

اچانک درد بڑھ گیا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ درپن اسی کروٹ لیٹی رہی۔ اس نے ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ وہ بھی اس کو مخاطب نہیں کر رہا تھا۔ درد بہت بڑھ گیا۔ سانس رکنے لگی۔ سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا۔ اچانک متلی محسوس ہوئی۔ بہت مشکل سے اٹھا۔ واش روم کی طرف بڑھا لیکن قدم لڑکھڑا گئے۔ واش روم کی دیوار کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھ گیا۔ سینے میں زور کی ٹیس اٹھی۔ سینہ پکڑ کر زور زور سے کراہنے لگا۔ کراہنے کی آواز کمرے کی کائی زدہ خامشی میں قبر سے آتی ہوئی کسی بدروح کی آواز لگ رہی تھی۔ اسے متلی محسوس ہو رہی تھی لیکن قے نہیں کر پا رہا تھا۔ آخر سینے میں زور کا درد اٹھا۔ سانس رکنے لگی۔ اسے لگا اب دم گھٹ جائے گا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح فرش پر تڑپنے لگا۔ درپن پھر بھی بستر پر خاموش کسی مرے ہوئے سؤر کی طرح پڑی رہی۔ اس کے زور زور سے کراہنے کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ پھر ایک بار وہ زور سے چیخا اور تڑپ کر خاموش ہو گیا۔

صبح کسی نے پوچھا۔

''کیسے مرا؟''

درپن نے مختصر سا جواب دیا۔

''دیش دروہی تھا۔''

آنسو کیوں۔۔۔

وحشی سعید
(سری نگر)

سورج میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک احساس ہے۔ اس احساس کی قدر تب ہوتی ہے جب آپ کے اردگرد ایسی چیزیں رونما ہوتی ہیں جن کو آپ اَن دیکھی کرتے ہیں۔ جب آپ پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے، احساس صرف آپ کا ہے۔

وہ چھوٹا بچہ جو اسکول جانے کی تیاری کرتا ہے۔ اُس کی ماں اُس کے خوبصورت بالوں کو بڑے پیار اور دُلار سے کنگھی کر کے اُنہیں ترتیب سے رکھتی ہے۔ وہ بچہ گھر کی دہلیز پار کر کے اپنے محلے کے کوچے میں ان ترتیب شدہ خوبصورت بالوں کو بگاڑتا ہے۔ اب یہ بے ترتیب بال اُس کے ماتھے پر ایسے بکھر جاتے ہیں کہ سورج اُس سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ سورج اُس سے بہت دور چلا گیا ہے۔

پھر جب وہ کچی عمر پار کر کے بالغ ہوتا ہے، تب بھی وہ شرمیلا ہی رہتا ہے۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا چلا گیا، اُس کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جنہیں یاد کر کے اُسے اُداسی گھیر لیتی تھی۔ اُسے اب بھی یاد ہے۔۔

جب وہ بہت چھوٹا تھا، عموماً اندھیری راتوں میں اپنے محلے کی چھوٹی اور تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے کشادہ سڑکوں پر پہنچ جاتا تھا۔ وہ اُن کالی راتوں میں اکیلے میلوں چلتا تھا اور خود کو تلاش کرتا تھا۔ وہ خود کو حساس ہونے کی سزا دیتا تھا اور یوں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا لیکن ہر بار گھر والوں کی تلاش کامیاب ہوتی تھی اور وہ گھر کے کمرے میں قید ہو کر رہ جاتا تھا۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ خود کے قریب ہو گیا اور دوسروں سے دور چلا گیا، کیونکہ وہ تنہا ہو گیا۔ پھر وہ یہ سوچ کر ایک ایسی دنیا کی تلاش میں نکلا کہ شاید وہ دنیا خوبصورت ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ اپنی پرچھائیوں میں قید تھا۔ وہ اب ان سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ کبھی کبھار اُس کی سوچ بھی مفلوج ہو کر رہ جاتی تھی۔ ایسے لمحات میں اُس کا واحد سہارا اُس کی ماں کا پُرنور چہرہ تھا، جو اُس کے لئے زندگی کی علامت بن جاتی تھی۔ یہی وہ علامت تھی جس نے اُس کو احساس دلایا کہ اور بھی لوگ تکلیفوں میں مبتلا ہیں اور ان تکلیفوں کو برداشت کرتے ہیں۔ یہی وہ وجہ تھی کہ اُس نے اُن تکلیفوں کو قلم کے حوالے کر دیا۔ وہ خود سے بھی لڑتا رہا اور بھاگتا رہا۔ اوروں کی تکلیفوں کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔

جب وہ یونیورسٹی پہنچا اُس کو ایک نئی دنیا ملی۔ اُس کے قلم نے ایک نیا انداز، ایک نئی رفتار پکڑی۔ یہ قلم ہی تھا جس سے کئی افراد اُس کے ساتھ جڑ گئے اور یوں وہ اپنے ہم خیالوں کے حلقے میں بندھ گیا۔ اسی حلقے میں اُس کو ایک ایسا دوست ملا جو اپنی زندگی کے آخری ایام تک اُس کے ساتھ رہا۔ اُس دوست سے اس کی جان پہچان کچھ انوکھے طریقے سے ہوئی۔ جب اُس نے اپنے اس دوست کو پہلی بار گھر بلایا تو وہاں اُس کی ماں نے، جو کہ ایک نورانی شخصیت کی مالک تھیں، پوچھا

''بیٹے! تم کون ہو۔۔؟''

''جی میں آپ کے بیٹے کا دوست ہوں''

ماں نے دوست سے کہا:

''اچھی بات ہے۔ سن بیٹا، اگر تم میرے بیٹے کے دوست ہو تو میں چاہتی ہوں کہ تم اُس کے ایسے دوست بنو کہ ہر وقت اُس کے ساتھ رہو۔ غم ہو یا خوشی، ہمیشہ اکٹھے رہنا۔ اُسے کبھی بھی یہ احساس نہ ہونے دینا کہ وہ زندگی میں اکیلا ہے۔ بیٹا! میرا بیٹا شرمیلا ہے، دنیاداری سے ناواقف ہے''

دوست نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا:

''ماں جی، فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں زندگی بھر آپ کے بیٹے کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا''

پھر دونوں میں ایسی دوستی ہوئی جو ہمیشہ قائم رہی۔ وہ ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتے، آپسی اُلجھنوں کو اکٹھے سلجھاتے، مشکلوں اور پریشانیوں کو حل کرتے، غرض ہر وقت ایک دوسرے کی فکر کرتے۔ آخر کار اُسے وہ راستہ ملا جس کی اُس کو تلاش تھی۔

کئی دفعہ ایسا بھی ہوا جب وہ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور رہے لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہے۔ اس دوستی نے اُسے خود اعتمادی کے اُس راستے پر ڈال دیا، جس پر چل کر اُس نے زندگی کی ہر لڑائی ایک پُراعتماد سپاہی کی طرح لڑی۔ وہ بچہ جو کل تک اپنے ماں کے ہاتھوں ترتیب دیے ہوئے بالوں کو بگاڑتا تھا، اُس نے اپنی ذات کا مینار کھڑا کر دیا۔ اس باوقار کامیابی پر اُس کا دوست پھولے نہ سمایا۔ وہ دونوں اپنی دشواریوں اور رُکاوٹوں پر کامیابی پانے کے لئے ایک دوسرے سے مشورہ کرتے تھے۔ جب حالات نے اُس کے دوست کو دیوار سے لگا دیا، وہ اُس کے ساتھ کھڑا رہا۔ لیکن جب اُس کا دوست بیمار ہوا، اُس کی ہمت جواب دینے لگی، کیونکہ اُسے اب محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا دوست اب اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔ وہ اپنے دوست کے لئے خدا سے عجز و زاری کر رہا تھا کہ اے میرے پروردگار میرے دوست کو شفا بخش دے۔

پھر ایک رات اُس کے دوست کے بیٹے کا فون آیا:

''انکل!۔۔ میرے ابو دنیا سے چلے گئے''

اُس کی آنکھوں سے رُکے ہوئے آنسو ایسے گرنے لگے جیسے گرمی کے کئی دنوں کے بعد اچانک برسات ہوتی ہے۔

اُس صبح جب دھوپ کی کرنیں پھوٹنے لگیں اُس کے سامنے اُس کا دوست کھڑا تھا۔ وہ مبہوط ہو کر رہ گیا۔ دوست نے اُس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کو صاف کیا اور دھیمی آواز میں کہا:

''تم کہتے تھے کہ سورج میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک احساس ہے پھر آنسو کیوں۔۔۔؟''

اُس برسات کی رات کی صبح بڑی خوبصورت تھی۔

"الفت کے تقاضے"

شان الحق حقی

(۱۵۔ستمبر۱۹۱۷ء تا ۱۱۔اکتوبر۲۰۰۸ء)

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب
زخم بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

ہم نگاہی کی ہمیں خود بھی کہاں تھی توفیق
کم نگاہی کے لیے عذر نہ چاہے جاتے

کاش اے ابرِ بہاری، ترے بہکے سے قدم
میری اُمید کے صحرا میں بھی گاہے جاتے

ہم بھی کیوں دہر کی رفتار سے ہوتے پامال
ہم بھی ہر لغزشِ مستی کو سراہے جاتے

ہے ترے فتنۂ رفتار کا شہرہ کیا کیا
گرچہ دیکھا نہ کسی نے سرِ راہے جاتے

دی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غمِ ہستی سے نباہے جاتے

○

محمود شام

(کراچی)

سہمی آنکھوں میں سسکتے منظروں میں کشمکش
ذہن میں اٹکے عقیدوں تذکروں میں کشمکش

راجدھانی میں بگولے۔ بیرکوں میں آندھیاں
اقتدارِ منتہیٰ کے محوروں میں کشمکش

زندگی آلودگی یا خاتم آلودگی
آج کے خود ساختہ پیغمبروں میں کشمکش

کاشت اکثر فصل ہوتی ہے مگر پکتی نہیں
درسگاہوں کھیتیوں اور دفتروں میں کشمکش

آیتوں کی مارکیٹیں۔ زہد کے نیلام گھر
مذہب و بازار کے پیشہ وروں میں کشمکش

سر اٹھاتے ہیں پیادے۔ ان کو شہ دیتا ہے کون
عالمی شطرنج کے بازی گروں میں کشمکش

آرزوئیں در بدر ہیں خواب اغوا ہوگئے
آگہی۔ تکنیک۔ آشفتہ سروں میں کشمکش

اک طرف جغرافیہ تاریخ بھی ہیں دوبدو
اک طرف عشاق میں اور دلبروں میں کشمکش

تجزیہ کاروں کا فیض عام ہے محمود شام
ہر محلّے کے گلی کوچوں گھروں میں کشمکش

○

اعتبار ساجد
(لاہور)

مجھے ایسا لطف عطا کیا کہ جو ہجر تھا نہ وصال تھا
مرے موسموں کے مزاج داں تجھے میرا کتنا خیال تھا

کسی اور چہرے کو دیکھ کر تری شکل ذہن میں آ گئی
ترا نام لے کے ملا اسے میرے حافظے کا یہ حال تھا

کبھی موسموں کے سراب میں کبھی بام و در کے عذاب میں
وہاں عمر ہم نے گزار دی جہاں سانس لینا محال تھا

کبھی تو نے غور نہیں کیا کہ یہ لوگ کیسے اجڑ گئے
کوئی میرؔ جیسا گرفتہ دل تیرے سامنے کی مثال تھا

ترے بعد کوئی نہیں ملا جو یہ حال دیکھ کے پوچھتا
مجھے کس کی آگ جلا گئی مرے دل کو کس کا ملال تھا

کہیں خون دل سے لکھا تو تھا ترے سال ہجر کا سانحہ
وہ ادھوری ڈائری کھو گئی وہ نہ جانے کون سا سال تھا

○

ناصر علی سید
(پشاور)

گدگداتا سا تبسم ہے تیرے ہونٹوں پر
جس نے چہرے پہ ترے میلہ لگایا ہوا ہے

ایک جادو سا جگاتا تری مسکان میں ہے
پاس ہونٹوں کے جو ڈمپل سا بنایا ہوا ہے

تو جو زلفوں کو جھٹکتا ہے خبر ہے تجھ کو
کیسا اودھم مرے سینے میں مچایا ہوا ہے

اک ترا نام جو ہونٹوں سے الگ ہوتا نہیں
اک ترا روپ جو آنکھوں میں سمایا ہوا ہے

سرخ ملبوس میں آتا ہے نظر خواب میں روز
اور اسی رنگ نے نیندوں سے جگایا ہوا ہے

اک مرا ذکر ہی کیا حسن نے تیرے جاناں
اک زمانے کو ہی دیوانہ بنایا ہوا ہے

یہ جو پیکر ہے ترا دودھ نہایا ہوا ہے
اور اس دودھ میں سیندور ملایا ہوا ہے

جو بھی دیکھے تجھے بس دیکھتا ہی رہ جائے
تجھ کو فطرت نے بھی فرصت سے بنایا ہوا ہے

تیری آنکھیں ہیں گلابی تو ترے گال گلال
اور ترا قد بھی قیامت سا اٹھایا ہوا ہے

○

اشرف جاوید

(لاہور)

جوزمیں کے رُخ پہ ہے سادگی، جو فلک پہ بل ہیں جلال کے
سبھی رنگ ہیں ترے حسن کے، سبھی روپ تیرے جمال کے

ہی اجنبی تھے، غریب تھے، سو، کہیں بھی اوڑھ کے سو رہے
کبھی دھوپ تیرے ملال کی، کبھی سایے تیرے خیال کے

نہ زباں کُھلی، نہ نظر اُٹھی رُخِ شہ جمال کے سامنے
کئی بار آ کے گزر گئے وہی لمحے، جو تھے سوال کے

سرِ بام رقصِ ہَوا ہُوا، تو شریک اِس میں دیا ہُوا
یہ تری ادا کے ہیں معجزے، یہ ہیں شعبدے تری چال کے

کسی آنے والے کی چاپ سُن، کسی کل کا راگ، الاپ سُن
نہ سنا ہمیں یہ کہانیاں، یہ فسانے ماضی و حال کے

وہ جو دو قدم کی خلیج تھی، وہی عمر بھر نہیں طے ہُوئی
رہے فاصلے بھی کمال کے، ہُوئے فیصلے بھی کمال کے

فقط ایک شب کے وصال سے کہاں سارے قرض ادا ہوئے!
نہیں پل دو پل کا معاملہ، یہ خسارے ہیں مہ و سال کے

تجھے کیا خبر، تجھے کیا پتا! یہاں کی روایت و ریت کا
ذرا ہولے ہولے قدم اُٹھا، ذرا کھول آنکھ سنبھال کے

کوئی پیش گوئی فضول ہے کہ چہار سمت میں دھول ہے
ابھی اختیار میں کچھ نہیں، ابھی رات دن ہیں زوال کے

○

آفتاب مضطر

(کراچی)

کوئی کیا جانے کیسی غضب ہے یاد کسی ہرجائی کی
بھُولی بسری یاد کسی کی شب بھر نیند چُرائی کی

پیاس کی شدت اتنی بڑھا کر دیری کر دی ساقی نے
شیشہ و ساغر ٹُوٹ پڑے تھے سُنتے ہی بات صراحی کی

یاد کہاں پھر قِصہ وِصہ صاحب عشق زلیخا کا!؟
یوں رُوداد سُنائے تھا بھائی کوئی یُوسُفی بھائی کی

کس کی سوچ پہ کس کا پہرا، کس کے ذہن پہ کون سوار
سب کی اپنی سوچ ہے صاحب سب کی اپنی سائیکی

رہ گیا مول دَھرے کا دَھرا سب کل بازار کے بیچوں بیچ
دل سودے میں اُبھری ایسی چیخ کسی سودائی کی

ٹائی پڑی کیا ایک تعلق اک رشتے میں کل کی ہے بات
کج رہتی ہے تب سے اکثر ناٹ ہماری ٹائی کی

مرہم و دُشنہ، سنگِ ملامت سب نے شوق کیے پورے
شوق میں اپنے حصے کی ہر ایک نے خوب بھلائی کی

جب سے پڑوس میں اہلِ سخن کے آن بسے ہیں اہلِ دل
اک ترکیب ہوئی مستعمل ہم سایہ، ہم سائی کی

جتنا جتنا بُھولنا چاہا دل سے اک ہرجائی کو
اتنی دل نے بات بنائی، اُتنی پیش صفائی کی

سانگلہ ہل کو، ہل اسٹیشن جیسا کر گئی ٹھنڈا ٹھار
جانگلی ساندل بار کی کھٹی میٹھی نار سرائیکی

وہ تو خیر سے جان چکے ہم تجھ کو بھی ترے شہر کو بھی
ورنہ مضطر کس کس نے نہیں تیری آن برائی کی

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

زندگی سے بڑی عطا ہی نہیں
کس صلے میں ملی، پتا ہی نہیں !

زندگی سے بگاڑ کر جینا
اِس سے بڑھ کر کوئی سزا ہی نہیں

آدمی روز و شب میں یوں گُم ہے
جیسے ہونا کبھی جُدا ہی نہیں

زندگی اور نعمتیں اتنی
وہ عطا ہے جسے فنا ہی نہیں

ایسا پیکر وہ خاک و آب کا ہے
جس کا ثانی کبھی ملا ہی نہیں

ایک پیکر میں عشق کے جذبات
ایسے ایسے کہ انتہا ہی نہیں

دُور دنیا کے ان جھمیلوں سے
اک جہاں ہے جہاں فنا ہی نہیں !

مِل گیا نفسِ مطمئن جس کو
اس کی قسمت کی انتہا ہی نہیں

کیسی کھیتی میں بیج بوئے ہیں
فصل کیا ہو گی کچھ پتا ہی نہیں!

جس سے ملتا ہوں میں ریاضؔ اکثر
شاید اب تک کبھی ملا ہی نہیں

○

ارشد مرشد

(راولپنڈی)

صدمہ تری جدائی کا از حد نہیں ہوا
دل پے ستم ہوا ہے تشدّد نہیں ہوا

رکھی ہے بود و باش ستاروں کے آس پاس
مرشد حصارِ جاں میں مقیّد نہیں ہوا

رہتا ہے بت کے سامنے ہر وقت سجدہ ریز
یہ دل ہمارا ہو کے بھی مرتد نہیں ہوا

مت ہو پشیماں درد یہ فطرت میں ہے مری
تیرا تو تزکرہ ابھی شاید نہیں ہوا

مشکور ہوں میں دل سے دلِ نارسا ترا
بدنام تُو ہوا ہے مگر بد نہیں ہوا

کیسا ملا ہے رتبہ یہ مجھ خاکسار کو
ارشد تو پہلے کوئی بھی مرشد نہیں ہوا

○

جنید آزر
(اسلام آباد)

کوئی ہنگام جسم وجاں کے اندر ہونے والا تھا
مری پہچان کا ہر مرحلہ سر ہونے والا تھا

مرے پاؤں کے نیچے سے زمیں تک کھینچ لی تو نے
مرا قد جب ترے قد کے برابر ہونے والا تھا

وہ سب کچھ ہی سمٹ آیا مرے فن کی ہتھیلی پر
وہی سب کچھ، جو میری حد سے باہر ہونے والا تھا

خدا کا شکر کہ راہِ ہوس پر میں نہیں نکلا
نہیں تو ساتھ سب کے، میں بھی پتھر ہونے والا تھا

مجھے دو لفظ بھی اُس نے تسلی کے نہیں بھیجے
مرے دَم پر جو قطرے سے سمندر ہونے والا تھا

اِسی دوران میں اُس نے بساطِ غم اُلٹ ڈالی
زمانہ جب مرے پاؤں کی ٹھوکر ہونے والا تھا

○

نبیل احمد نبیل
(لاہور)

اپنی شہرت سے نہ رُسوائی سے ڈر لگتا ہے
اب فقط اُس کی شناسائی سے ڈر لگتا ہے

جس نے پہلے بھی محبت کا بھرم توڑا تھا
اُس کی اب حوصلہ افزائی سے ڈر لگتا ہے

یوں تو قدموں میں ہے میرے یہ زمانہ سارا
ہاں مگر وقت کی انگڑائی سے ڈر لگتا ہے

دل یہ کم بخت ہے شیدائی اُسی ظالم کا
اب مجھے جس کی شناسائی سے ڈر لگتا ہے

بہتے دریا تری خاموش مزاجی ورنہ
اس روانی سے نہ گہرائی سے ڈر لگتا ہے

اب کسی سنگِ ملامت کا کوئی خوف نہیں
اب فقط رسمِ پذیرائی سے ڈر لگتا ہے

جان لینے کے ہنر سے جو شناسا ہے بہت
اُس مسیحا! کی مسیحائی سے ڈر لگتا ہے

وہ جسے بات بنانے کا ہنر آتا ہے
اُس کی اب حاشیہ آرائی سے ڈر لگتا ہے

عمر ہوتی ہے محبت کی بہت شوریدہ
گہرے پانی سے نہ گہرائی سے ڈر لگتا ہے

بیچ کر خود کو بھی خوشیاں نہ خریدی جائیں
جاں کو آئی ہوئی مہنگائی سے ڈر لگتا ہے

برف صورت ہوئی جاتی ہے محبت بھی نبیل
جان لیتی ہوئی پُروائی سے ڈر لگتا ہے

ایک خوشبو کی تمنّا لیے پھرتے تھے نبیل
اب تو پھولوں کی بھی رعنائی سے ڈر لگتا ہے

○

جیت

تابش خانزادہ
(لاس انجلس)

بھائی کلیم کی نسبتمیں اپنے ابّا جان سے زیادہ قریب تھا۔ میں نے ہی ان کی زندگی میں ان کا بہت سا کاروبار سنبھال یا تھا۔ میرے برعکس کلیم بھائی نہ کبھی کاروبار کی اور نہ زمینوں کی دیکھ بھال کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد باپ کی دولت کے بل بوتے پر چھڑے اڑانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس لیے ابّا جان کی وفات کے بعد جب ان کا وصیت نامہ کھولا گیا تو مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ انہوں نے اپنی جائیداد کا تین چوتھائی مجھے اور ایک چوتھائی کلیم بھائی کے نام کیا تھا۔

چند کروڑ روپے کے علاوہ بینک کا سارا کیش مجھے ملا تھا۔ کپاس کی مِل، دو کوٹھیاں اور پندرہ مربع زمین بھی میرے حصے میں آئی تھی جبکہ کلیم بھائی کے حصے میں ایک کوٹھی، چند کروڑ روپے کیش اور تقریباً پانچ مربع زمین آئی تھی۔

اس تقسیم پر غصے کی صورت میں کلیم بھائی نے اپنے علاقے کا سب سے مہنگے وکیل کی خدمات حاصل کر کے عدالت میں میرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا کہ میں نے اپنے باپ کو اس کے خلاف پھسلا کر سب کچھ کرایا ہے اور اسے عدالت باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے پچاس فیصد حصہ دلوائے۔ میں بھی بھلا کب پیچھے ہٹنے والا تھا۔ میں نے بھی ایک تگڑا وکیل کر لیا۔ دو سال کی مقدمہ بازی میں میں نے ابّا کی طرف سے ملنے والا سارا کیش روپیہ لگا کر مقدمہ جیت لیا۔

کلیم بھائی نے سیشن کی عدالت میں ہمارے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ اس بار اس نے صوبے کے سب سے طاقتور وکیل کی خدمات حاصل کیں۔ میں بھلا کب پیچھے ہٹنے والا تھا میں نے اپنے پرانے وکیل پر بھروسہ کرتے ہوئے جوابی کارروائیاں شروع کر دیں۔ سیشن کی عدالت میں ہم نے تقریباً چار سال مقدمہ لڑا، جس کے نتیجے میں مجھے ایک کوٹھی بیچنا پڑی۔ اس دفعہ مقدمے کا فیصلہ کلیم بھائی کے حق میں ہوا۔ لیکن میں نے ملک کے سب سے بڑے وکیل کی خدمات حاصل کر کے سیشن کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ باپ کی دی ہوئی ایک کوڑی بھی اسے نہیں دوں گا۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ آٹھ سال تک چلتا رہا اور میں پیسے کو پانی کی طرح بہاتا رہا۔ پھر میں مقدمہ جیت گیا۔ میں ابھی خوشی کے شادیانے بجانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میرے بھائی نے سپریم کورٹ میں ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔

سپریم کورٹ میں میرا مقدمہ دس سال تک چلتا رہا۔ پچھلے چوبیس سال کی مقدمہ بازی نے مجھے گھر کی، کاروبار کی اور زمینوں کی طرف سے غافل کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں میری کپاس کی مِل بِک گئی۔ زمینوں کا تمام پیسہ مقدموں میں لگ گیا۔ اس لیے زمین بھی بک گئی۔ میرے حصے میں آیا ہوا کیش بھی وکیلوں کی نظر ہو گیا۔ میرے پاس اب صرف ایک گھر بچا تھا اور میرے بھائی نے تو سپریم کورٹ کی اپیل کے دوران اپنا آخری سرمایہ یعنی گھر جس میں اس کے بچوں کا سر چھپا ہوا تھا بھی بیچ دیا تھا۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ نہ ہو سکا اس لیے کہ ہم دونوں بھائیوں کو وکیل کو دینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ دونوں بھائیوں کی کوٹھیاں ہمارے وکیلوں نے خرید لی تھیں۔ کلیم بھائی کو بے گھر دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اگر میں کلیم بھائی کو وہ سب کچھ دے دیتا جو اس نے شروع میں مجھ سے مانگا تھا یعنی پچاس فیصد تو آج ہم دونوں کے پاس سب کچھ ہوتا۔

آج کل کلیم بھائی اور میں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ہم خوش ہیں اور ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں اور اپنی بیوقوفیوں پر کبھی اکٹھے روتے ہیں اور کبھی ہنستے ہیں۔ اس مقدمہ بازی سے ہمیں جو سبق اتنا مہنگا پڑا تھا آپ کو کوئی فیس لیے بغیر بتائے دیتا ہوں۔ کسی بھی مقدمہ بازی میں ہمیشہ فریقین کی ہار اور وکلاء کی جیت ہوتی ہے۔

- بقیہ -

آدھی موت کا جشن

لئے خاصا دلکش بنایا گیا تھا۔ اُن کو ہر شخص مبارک باد دے رہا تھا۔ کھانے پینے کے اسٹال ترتیب وار لگے ہوئے تھے۔ اُن کی اہلیہ، اُن کے بچّے اور اُن کے خاندان والے اور بہت سارے لوگ وہاں موجود تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وفا محل کو ایک بار پھر دُلہا بننے کا موقع ملا ہو۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد وفا محل کے چند دوستوں اور اُن کے بچّوں نے انھیں ہنستا مسکراتا دیکھنے کے لئے ڈیک پر آنند بخشی کا لکھا فلم ''جینے کی راہ'' کا یہ گیت لگایا:

آنے سے اُس کے آئے بہار
جانے سے اُس کے جائے بہار
بڑی مستانی ہے میری محبوبہ
میری زندگانی ہے میری محبوبہ

اس گیت کی دُھن پر وفا محل کے کچھ ساتھیوں نے انھیں اپنے ساتھ ناچنے پر مجبور کیا۔ دیکھتے دیکھتے وفا محل کی بیوی آسیہ کو بھی کچھ عورتوں نے اُن کے ساتھ ناچنے پر تیار کیا۔ کچھ ہی وقت کے بعد وفا محل کی رٹائرمنٹ پارٹی اختتام کو پہنچی۔ ہر چیز سمیٹ دی گئی۔ اپنے اور پرائے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آخر میں جب دلشاد پیلس کے مالک نے وفا محل کے سامنے ایک لاکھ تیس ہزار روپے کی ادائیگی کے لئے بل رکھا تو وفا محل نے اپنے موبائل فون سے بل چکا دیا۔ لیکن انھیں بل چکاتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے انھیں اپنے اور پرایوں نے تابوت میں رکھ دیا ہو!

آدھی موت کا جشن

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
(بھارت)

وفا محل، ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔انھیں ہیڈ ماسٹر بنے بارہ سال ہوگئے تھے۔علم ریاضی میں ایم ایس سی تھے۔انھیں اپنے سبجیکٹ پر خاصا عبور حاصل تھا۔اُن کا یہ کہنا تھا کہ علم ریاضی ایک مشکل ترین سبجیکٹ ہے جو ہر کسی کو نہیں آتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس سبجیکٹ کے جراثیم ہر کسی کو عطا نہیں کرتا۔وفا محل ایک قابل استاد تو تھے ہی ایک اصول پرست اور خوش اخلاق انسان بھی تھے ۔بہت سے طلبہ وطالبات اُن کے گھر پر ٹیویشن پڑھنے آتے تھے۔وہ صبح دس بجے سے پہلے اور شام کو چار بجے کے بعد ٹیویشن پڑھاتے تھے۔اُن کے پڑھائے ہوئے کئی طلبہ وطالبات ڈاکٹر ،انجینئر اور ایڈمنسٹریٹیو آفیسر کی پوسٹ پہ تعینات تھا۔علم ریاضی کے علاوہ اُنھیں ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔وہ انگریزی، ہندی اور اردو کے بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں کے ادبی کارناموں سے بخوبی واقف تھے۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں وہ اکثر موقع ومحل کے اعتبار سے بڑے عمدہ اشعار سے اپنی بات کو بہت موثر بناتے تھے۔وہ درس وتدریس کو عبادت سے کم نہیں سمجھتے تھے۔وہ صفائی ،سچائی ،لکھائی، پڑھائی اور اچھائی پر جان چھڑکتے تھے۔غرضیکہ ایک بہترین مدّرس کے تمام اوصاف اُن میں موجود تھے۔وہ اپنے علاقے میں ایک مشہور اور قابل ترین مدّرس تسلیم کئے جاتے تھے۔پندرہ اگست اور یوم جمہوریہ کے موقعے پر جب وہ اسکول میں نظامت کے فرائض انجام دیتے تو طلبہ وطالبات اور عوام اُن سے بہت متاثر ہوتے۔وفا محل ایک پُر وقار مدّرس کی حیثیت سے طلبہ اور لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے تھے،لیکن ہائے !وقت کے دریا میں بہتے بہتے اب وہ حُسن وجوانی کھو چکے تھے۔اپنی سروس میں اب تک وہ اٹھارہ اسکولوں میں تعلیمی خدمات انجام دے چکے تھے۔اُن کی جس بھی اسکول سے ٹرانسفر ہوتی تو وہاں کے طلبہ وطالبات رونے لگتے۔اُن کے جانے سے ایک سوگوار سا ماحول پیدا ہوجاتا۔وہ اکثر طلبہ کو یہ بات سمجھاتے کہ تبدیلی قدرت کے قانون میں شامل ہے۔ہم ملازم حکمناموں کا احترام کرتے کرتے بالآخر سبکدوش ہوجاتے ہیں۔اسکول میں جب کبھی دو مدّرسوں کے درمیان کسی بات پر نوک جھونک ہوجاتی اور وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کے بجائے اپنے دلوں میں رنجش پالنے لگتے تو ماسٹر وفا محل اُن دونوں میں صلح کرواتے اور آپس میں گلے ملواتے۔تب اُنھیں بہت مسرت ہوتی۔وہ یوں محسوس کرتے کہ جیسے وہ کسی بہت بڑے امتحان میں کامیاب ہوئے ہوں۔ہیڈ ماسٹر بننے کے بعد بھی اُن کے مزاج میں کوئی اکّڑ پھوں داخل نہیں ہوئی تھی۔وہ تُم ،تیرا اور تُو ایسے الفاظ استعمال کرنا بہت معیوب سمجھتے تھے۔ہر کسی کو آپ اور جی کہہ کر پُکارتے تھے۔یہاں تک کہ وہ اپنے اسکول کے صفائی کرمچاری دھولُو رام کو بھی تُو کہہ کر پُکارنا معیوب سمجھتے تھے۔

گورنمنٹ ہائی اسکول محراب گڑھ میں وفا محل کو بحیثیت ہیڈ ماسٹر کام کرتے پانچ سال ہوگئے تھے۔اس اسکول میں چار سو سے زیادہ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ اٹھائیس اساتذہ کے علاوہ تین کلرک ،دو لیبارٹری اسسٹنٹ اور تین چپراسی بھی تھے۔مارننگ اسمبلی میں جب وفا محل ہیڈ ماسٹر طلبہ کو اخلاق وکردار پر لیکچر دینے لگتے تو تمام اساتذہ اور طلبہ وطالبات ہمہ تن گوش اُن کو سُنتے۔وہ اُنھیں حیات وکائنات کے کئی اسرار ورموز سمجھانے لگتے۔ہفتے میں ایک بار اسکول میں دیسی گھی کا حلوہ اور نمکین چائے پلانے کی روایت اُنھوں نے ہی قائم کی تھی۔طلبہ کی لکھائی، پڑھائی ،صفائی ستھرائی ،کھیل کود اور نظم وضبط پر وہ خاص دھیان دیتے تھے۔لیکن اب اُن کی رٹائرمنٹ کو ایک سال رہ گیا تھا۔وہ جب اپنی گذشتہ بتیس سالہ سروس پر دھیان دیتے تو اُنھیں یوں لگتا کہ جیسے وہ کل ہی گورنمنٹ سروس میں آئے ہوں۔تب اُنھیں وقت کے گزران کا احساس اندر ہی اندر نوچنے لگتا۔اُن کے پورے وجود میں یہ احساس ایک درد وکرب بن کر سرایت کرجاتا کہ دن ،مہینے سال گزرتے جائیں گے اور میرا وجود ایک ناکارہ وجود کی صورت اختیار کرلے گا!اور پھر ایک وقت آئے گا کہ بے بسی وبے سروسامانی کا عالم مجھے گھیر لے گا!وفا محل جہاں اپنی سروس کے بتیس سال پورے کرچکے تھے وہاں بقیہ ایک سال بھی گردش روز وشب میں گزر رہا تھا۔ایک روز وہ اپنے آفس میں بیٹھے کسی حد تک مغموم حالت میں تھے ۔اُن کی رٹائرمنٹ کو اب دو مہینے باقی رہ گئے تھے۔انھوں نے اپنی ٹیبل کی ڈرال سے آرڈر بک نکالی۔اُس میں دن کے دو بجے کے بعد تمام اسٹاف کے ساتھ میٹنگ کا آرڈر لکھا اور ٹیبل بیل بجائی۔چونی لعل چپراسی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔اُنھوں نے اُسے آرڈر بک پکڑاتے ہوئے کہا

''یہ لیجیے اس پر سب کے دستخط کروائیے اور کہہ دیجیے کہ آج دو بجے کے بعد آفس میں میٹنگ ہے''

دو بجے کے بعد تمام اسٹاف ممبران باری باری وفا محل ہیڈ ماسٹر کے سامنے کرسیوں پر بیٹھنا شروع ہوئے۔جب سب آفس میں آگئے تو وفا محل نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

''دوستو! اور ساتھیو! آج کی میٹنگ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ میں آپ کو یہ احساس دلانا لازمی سمجھتا ہوں کہ ہم سب وقت کے دریا میں بہہ رہے ہیں !میری رٹائرمنٹ کو دو مہینے رہ گئے ہیں۔لہٰذا آپ مجھ سے جو بھی اپنا دفتری اور کاغذی مسئلہ حل کروانا چاہتے ہیں۔وہ میرے سامنے لے آئیے تاکہ میرے جانے کے بعد آپ کو کسی بھی طرح کی مایوسی وپریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے''

وفا محل یہ کہنے کے بعد لمحہ بھر کے لئے خاموش رہے تو سوشل سائنس کے ٹیچر بھگوان داس کسی حد تک مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

''چہارسُو''

''سر! مجھے آپ کو دیکھ کے لگتا ہی نہیں ہے کہ آپ رٹائر ہو رہے ہیں یا رٹائر ہوں گے۔ چلیے اگر یہی مان لیں کہ آپ دو مہینے کے بعد رٹائر ہو رہے ہیں تو سر آپ اُن خوش نصیب آفیسروں میں ایک ہیں جو باعزت طریقے سے رٹائر ہو رہے ہیں۔ ورنہ بہت سے لوگوں کو رٹائرمنٹ سے پہلے ہی رٹائر کیا جاتا ہے۔ اس لئے خوش رہیے''

وفامحل نے کہا

''بھگوان داس جی! آپ صحیح کہہ رہے ہیں لیکن میں آپ سب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر ملازم کی رٹائرمنٹ اُس کے لئے آدھی موت ہوتی ہے!'' وہ ابھی اتنی ہی بات کہہ پائے تھے کہ انگریزی پڑھانے والی اُستانی ششی کلا بیچ میں بول اُٹھی

''سر! آپ نے رٹائرمنٹ کو اپنے اوپر بہت سیریس لیا ہے۔ ہر چیز وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے''

وفامحل نے اُستانی ششی کلا کی بات سُنی اور پھر رٹائرمنٹ کا معنی ومفہوم سمجھاتے ہوئے کہنے لگے

''دراصل رٹائرمنٹ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری وجودی حیثیت اور فطری صلاحیتیں وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ہم سے تمام سرکاری اختیارات واپس لئے جاتے ہیں۔ رٹائرمنٹ کے بعد ہمارا وجود ہمارے لئے ہر طرح سے بوجھ بن جاتا ہے۔ آپ ہی بتائیے کس چیز میں کمی نہیں آتی؟''

تمام اسٹاف ممبران وفامحل کی باتیں غور سے سنتے رہے۔ کچھ اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک اور بھی مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ آخر پرسب نے چائے پی اور آج کی یہ میٹنگ برخاست ہوگئی۔

اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد وفامحل اپنے گھر آئے تو اُن کی بیوی اور بچّوں نے رات کا کھانا کھانے کے بعد وفامحل کی رٹائرمنٹ کی بات چھیڑ دی۔ اُن کی بیوی آسیہ نے اُن سے پوچھا

''آپ کی رٹائرمنٹ کو کتنے مہینے رہ گئے؟''

وفامحل نے جواب دیا

''دو مہینے رہ گئے۔ اکتوبر میں میری رٹائرمنٹ ہے''

آسیہ نے کہا

''ہاں تو میری بہنیں اور بھائی پوچھ رہے تھے کہ جیجا جی کی رٹائرمنٹ کب ہے؟ وہ آپ کی رٹائرمنٹ پارٹی کے لئے نئے سُوٹ بُوٹ خریدنا چاہتے ہیں''

وفامحل کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا، بیٹیوں سے بڑا تھا۔ وہ گریجویشن کر چکا تھا۔ دو بیٹیاں گریجویشن کر رہی تھیں اور ایک بارہویں میں زیر تعلیم تھی۔ بیٹے نے وفامحل کو سمجھاؤ دیا:

''پاپا! دلشاد پیلس پہلے ہی بُک کرانا پڑے گا۔ اس کے علاوہ رٹائرمنٹ کا کارڈ بھی چھپوانا پڑے گا''

بیٹیوں نے بھی خوشی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی اپنی پسند کی شاپنگ کا اظہار کیا لیکن وفامحل اپنی بیوی اور بچّوں کی باتیں سُنتے ہوئے خاموش سب کے چہروں کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے بیٹے ابرار نے کہا

''پاپا! آپ نے کیوں چُپ سادھ لی؟ کچھ ہاں ناں کہیے نا''

وفامحل نے کہا

''کیسی بے وقوفانہ باتیں ہیں تمھاری۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ میں رٹائر ہو رہا ہوں اور آپ سب اپنے، پرائے میری رٹائرمنٹ کا جشن منانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ایک لاکھ بیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ لیتا ہوں۔ رٹائرمنٹ کے بعد بمشکل ساٹھ ہزار روپے لوں گا۔ میرے تمام سرکاری اختیارات مجھ سے چھن جائیں گے۔ اس سب کے باوجود آپ مجھ سے رٹائرمنٹ پارٹی چاہتے ہیں۔ سماج میں ایسی بھونڈی رسم کا خاتمہ ہونا چاہیئے''

وفامحل کی باتیں سُن کر بیوی اور بچّے اُن سے خفا ہوئے۔ بیوی نے کہا:

''آپ نے روز روز رٹائر تھوڑی ہونا ہے۔ یہ بھی ایک موقع ہے اپنوں اور پرایوں کے ساتھ ملاقات کا''

بیٹے نے کہا

''پاپا ہر چیز کو نفع ونقصان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے بغیر رٹائرمنٹ پارٹی کے لوگ کیا کیا طعنے دیں گے۔ کیا کیا باتیں کریں گے''

وفامحل کے بہت کچھ سمجھانے کے باوجود اُن کی بیوی اور بچّے اس بات پر اڑے رہے کہ اُن کی رٹائرمنٹ پارٹی ہو کے رہے گی۔ وفامحل نے بادل نخواستہ دلشاد پیلس بُک کرایا۔ پیشگی کے طور پر دلشاد پیلس کے مالک کو پچاس ہزار روپے دیے۔ اپنی رٹائرمنٹ کا کارڈ چھپوانے کے لئے بھیج دیا۔ تقریباً دو سو آدمیوں کو دعوت نامہ بھیجنا طے پایا۔

تیس اکتوبر کو گورنمنٹ ہائی اسکول محراب گڑھ کے اسٹاف ممبران نے وفامحل کو ایک شاندار پارٹی دی۔ تقریباً ہر اسٹاف ممبر نے اُن کے اوصاف بیان کیے۔ اکتیس اکتوبر کا دن وفامحل کے لئے ایک یادگار دن تھا۔ اسکول میں تمام بچّے اپنے اپنے ہاتھوں میں پھول لئے ترتیب وار باہر کھڑے اُن کے آفس سے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ہر مرد اسٹاف ممبر سے گلے مل رہے تھے۔ سب سے معافی چاہتے تھے۔ اُن کے گلے میں روپے اور پھولوں کے ہار پڑے ہوئے تھے لیکن اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ وہ بڑی حسرت سے اپنے اسکول کے آفس کو دیکھتے ہوئے جونہی باہر نکلے تو بچّوں نے اُن پر پھول برسانے شروع کیے۔ اُن کی ویڈیو بنائی جا رہی تھی۔ آٹھویں، ساتویں اور دسویں جماعت کے طلبہ وطالبات باری باری اُن کے گلے لگ کے رو رہے تھے۔ اُنھوں نے سب بچّوں کی طرف اپنا الوداعی ہاتھ لہرایا اور گاڑی میں سوار ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ سیدھے دلشاد پیلس پہنچ گئے۔ دلشاد پیلس وفامحل کی رٹائرمنٹ پارٹی کے

باقی صفحہ ۷۵ پر ملاحظہ کیجیے

طرفہ تماشا

وسیم عقیل شاہ
(جلگاؤں، مہاراشٹر)

وہ اپنی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ مایوسی اور ناامیدی اس کے چہرے سے صاف عیاں تھی۔ ہر پانچ منٹ میں اپنا موبائل فون دیکھ کر مزید فکر میں غلطاں تھا۔ آج پھر دن ختم ہونے کو تھا اور اب تک اس کی جیب میں صرف چار سو پچاس روپے ہی بچ رہے تھے۔

ماں کو آج سو ڈیڑھ سو بھی نہ دیے تب بھی ان چند سو روپیوں میں بھلا کیا سنیچر کی شام بن پائے گی؟ اور سونل۔۔۔! ایک بار پھر سونل کا پرکشش سراپا اس کے حواس پر چھا گیا۔ سونل کے خیال ہی سے اس کے پورے بدن میں جنسی آگ بھڑک اٹھتی اور وہ گویا بے قابو ہونے لگتا۔ لیکن اگلے ہی پل سونل کی رومان خیز باتیں اس کے اندرون میں تسکین وانبساط کی گداز لہریں متحرک کر دیتیں۔ وہ آج شام واقع ہونے والے پلوں کو سوچ کر آہیں بھی بھر رہا تھا اور بے چین بھی ہوا جا رہا تھا کہ کسی طرح روپیوں کا کچھ کا جُگاڑ ہو جائے۔ سال بھر میں ان دونوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ پورے ایک مہینے کے طویل دورانیے کے بعد یکجان ہونے والے تھے۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سایے مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے اور دھوپ اب بھی کنکریٹ کی سڑک سے پلٹ کر چٹاچٹ چانٹے مار رہی تھی۔ سڑک کے اُس پار بس اسٹینڈ اور بس اسٹینڈ سے کچھ فاصلے پر بے شمار لوگ کھڑے تھے۔ ان میں سے اکثر بسوں کے لیے تو بعض اپنی اپنی بک کی ہوئی اولا 'OLA)' یا 'اُبر (UBER)' کار کے انتظار میں تھے۔ اس کے علاوہ جو لوگ تھے ان سے بھی امید نہیں تھی کہ وہ اس کی ٹیکسی میں سوار ہوں گے۔

کیا کریں، آج کل ہر آدمی سہولت پسند ہے۔ شاید اس نے یہی سوچا۔ اور پھر سوچا کہ اب کسی سے روپیے ادھار مانگ ہی لیتا ہوں۔ لہٰذا ٹیکسی سے باہر نکل کر اپنے اسٹینڈ فرینڈ یوگیش کو ڈھونڈنے لگا۔ یوگیش سے اس لیے بھی اس کی امید بندھ رہی تھی کہ وہ آن لائن ٹریڈنگ کے چکر میں ہے۔ آئے دن تھوڑا بہت انویسٹ کر کے کچھ نہ کچھ کما ہی لیتا ہے۔

یوگیش کی گاڑی غالباً پندرہویں نمبر پر کھڑی تھی مگر یوگیش کا کچھ پتا اور ٹھکانہ نہ تھا۔ یوگیش کو نہ پا کر وہ اور بھی مایوس ہو گیا۔ اس نے اندازہ لگایا، ہو نہ ہو وہ کسی وائی فائی زون میں فرصت سے کھڑا ہوگا اور کم از کم دو گھنٹے تک اسٹینڈ پر نہیں لوٹے گا۔

کیوں نہ شیئرنگ ٹیکسی چلانی شروع کر دے۔' اس نے گویا خود سے کہا۔ اس مگج ماری سے تو بھلی ہے، کم از کم ایسے دن تو دیکھنے نہیں پڑیں گے کہ گرل فرینڈ کو ڈیٹ پر لے جانے کے لیے اوروں سے ادھار پیسے مانگنے پڑے۔ وہ پہلے بھی تو شیئرنگ ٹیکسی چلایا کرتا تھا۔ اُسی دوران کسی روٹ پر اس نے پہلی بار سونل کو دیکھا تھا۔ سونل تب ماڈرن ورلڈ مال میں کام کرتی تھی۔ اکثر صبح ساڑھے آٹھ بجے پھُلے واڑہ اسٹینڈ پر آتی اور نمبر پر کھڑی کسی ٹیکسی میں سوار ہو جاتی تھی۔ وہ جب بھی اس کی ٹیکسی میں سوار ہوتی، آئینے میں دونوں کی نظریں بار بار ٹکرا جاتیں۔ پھر کب ان کی محبت تنہائی کے آتش زدہ لمحوں کو پار کر گئی پتا ہی نہ چلا۔ اسی بیچ ایک منزل یہ بھی آنی تھی، سو آ گئی۔ 'لیکن کیا وہ پھر سے شیئرنگ ٹیکسی چلانی شروع کر دے؟'

اس نے سر کو جھٹک کر یوگیش کا خیال ذہن سے نکال دیا اور تھوڑے ہی فاصلے پر دائرہ بنائے کھڑے سات آٹھ ٹیکسی ڈرائیوروں کے پاس پہنچا۔ یہاں 'چندریان' کے ناکام ہونے پر بحث ومباحثہ جاری تھا۔ اس طرح کی بحثیں اس کے لیے بڑی دلچسپ رہا کرتی تھیں، اور ہمیشہ کی طرح آج وہ اس بحث میں بھی ضرور حصہ لیتا۔ مگر آج اس کے پورے وجود پر صرف سونل ہی سوار تھی۔ بہر حال اس نے سنجیدگی سے محسوس کیا کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنی پتا سنا کر ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ مڑتے ہی اس کی نظر شکیل بھائی پر پڑی جو کانوں میں ہیڈ فون ٹھونسے یقیناً کوئی مذہبی بیان سن رہے تھے۔ اس نے انھیں بھی ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں سور بھ دادا ضرور اسے دو ڈھائی ہزار روپیے ادھار دے سکتے تھے لیکن کل ہی ان کے میل پر ایک آن لائن چالان سلپ موصول ہوئی ہے۔

چار و ناچار وہ واپس اپنی ٹیکسی کے قریب لوٹ آیا۔ تبھی اسے ایک جوان لڑکا میک میں لپٹی ایک خوبصورت لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے جاتا دکھائی دیا۔ یک لخت اسے یاد آیا، 'سالہ آج کا ہوٹل کا ٹیبل بھی تو بک ہے اور کمرہ بھی۔! سونل نے ہی آن لائن بک کر لیا تھا۔ کتنا مہنگا ہوٹل ہے!' اس نے ہونٹوں کو خم دے کر سوچا۔ 'ہے تو سالی ایک مال گرل، رمابائی چال کی رہنے والی، بارہ ہجار کماتی ہے، اس پر ایسے ٹھاٹ! کپڑوں کا چوائس برانڈیڈ، اسمارٹ والا آئی فون۔۔۔ پڑھی وڑھی تو کچھ خاص نہیں لیکن انگریجی پانی کے جیسا بولتی۔ اور چالوں ایسی کہ شونا، بیبی، جانو، بول بول کر کبھی اس کے کریڈٹ کارڈ سے پرس آرڈر کر لیا، کبھی ایک سینڈل، تو کبھی کچھ، کبھی کچھ۔۔۔ آخری دفعہ پونم ریسڈینسی کا کمرہ بھی سونل نے اسی طرح بک کیا تھا۔

کبھی کبھی وہ خود سے سوال کرتا کہ وہ کیوں سونل کے اتنے ناز اٹھاتا ہے؟ کیا وہ اس سے شادی کرے گا؟ جب اسے معلوم ہوا کہ اسٹینڈ کے علاوہ اس کے دیگر دوستوں کا بھی خیال ہے کہ وہ سونل سے شادی کرنے والا ہے، تب اس نے خود سے مفاہمت کرتے ہوئے سوچا تھا کہ 'اب اتنی گنجائش تو ہو ہی گئی ہے۔' مگر اس حقیقت سے بھی وہ آشنا تھا کہ اگر مسکان دھندہ چھوڑ کر کوٹھے سے انٹرنیٹ

پر نہ بیٹھ گئی ہوتی تو اب تک وہ اسی کی چوکھٹ پر پڑا رہتا، پھر کہاں اس مال گرل سونل کے نازنخرے!!!

خیر وہ سونل سے شادی کرے نہ کرے لیکن اس کے سر پر آج کی پوری شام سونل کے ساتھ گزارنے کا جنون سوار تھا۔ اس نے ایک بار پھر خود کو خیالوں کی دنیا سے نکالا اور بے دلی سے موبائل فون میں وقت دیکھا۔ اسے سونل کے نخروں کا اچھے سے اندازہ تھا۔ وقت پر نہ پہنچنے کی صورت یقیناً ناراضی ظاہر کرے گی۔ اس نے آگے دیکھا، ایک گھنٹے میں صرف تین یا چار ٹیکسیاں ہی نکلی تھیں۔ اب بھی اس کا نمبر بہت پیچھے تھا۔ اس نے کسی سے روپے ادھار مانگنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کچھ سوچ کر قطار سے ٹیکسی نکالی اور گھر کی طرف چل دیا۔

اس نے ٹیکسی منگلا چال کے بہت پہلے پارک کی اور سلسلہ وار بنی پتلی پتلی گلیوں میں سے کسی ایک گلی میں داخل ہوا۔ دورخی مکانات کی اس بہت تنگ گلی میں اس کی کھولی بیچوں بیچ تھی۔ باہر دروازے پر ماں برتن دھو رہی تھی اور باپ اپنی رات کی چوکیداری پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس کے گھر میں سیل فون ٹاور کی ریز کے علاوہ کسی بھی شئے کا آنا مشکل نظر آتا تھا۔ اگر ہوا اور روشنی آتی بھی تو یوں گویا سسرال کی ستائی ہوئی ابھاگن بیٹیاں شکستہ حال اپنے مایکے آئی ہوں۔

اس نے یونیفارم اتارا اور اپنی خاص نیرو باٹم جنس اور سرخ ٹی شرٹ پہنا۔ بالوں میں جیل لگا کر اسپائک کیا، پھر پرفیوم پھس پھسا کر، جوتے پہن کر گندگی سے بچتا بچاتا گلی کے باہر نکل گیا۔ ٹیکسی کے پاس پہنچتے ہی دو ادھ ننگے بچے ہاتھ پھیلائے اس کے سامنے آئے تو اس نے پانچ پانچ کے دو سکے ان کے میلے کچیلے ہاتھوں میں تھما دیے۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ بڑی سڑک تک پہنچنے سے کچھ ہی پہلے اس نے ایک سائیڈ میں ٹیکسی روکی اور بائیں طرف واقع نیو مون سوپر شاپ سے ایک بڑا والا چاکلیٹ، ماؤتھ فریشنر اور مختلف فلیور کے دو چھوٹے چھوٹے پیکیٹ بھی خریدے۔ ہگا پارلر بھی یہیں تھا، وہاں سے اس نے اپنے ای سگریٹ کے لیے من پسند فلیور لیا۔

اگرچہ اس کے ذہن میں کلائمکس تک پوری منصوبہ بندی مکمل ہو چکی تھی، لیکن ترنگ میں وہ بار بار جزیات کو دہرا رہا تھا۔ تاہم ایک خلش بھی دل میں تھی کہ اس نے ماں سے یہ کہہ کر دو ہزار روپے مانگے تھے کہ اس کے کسی دوست کے پاپا کا بائی اپسی کروانے کے لیے اسے یہ روپے ادھار دے رہا ہے۔ ماں نے معمولی سی پس وبیش کے بعد لوہے کے بڑے صندوق میں سے مڑے تڑے پچاس اور سو روپے کے نوٹ نکالے اور بڑی احتیاط سے گن کر اسے دو ہزار روپے دے دیے۔

اگلے بیس منٹ بعد وہ وکٹری ہوٹل کے ایک صاف ستھرے ٹیبل پر تھا۔ وہ پورا آدھا گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا۔ اسے گمان تھا کہ سونل یہاں بیٹھی اس کا بے صبری سے انتظار کر رہی ہوگی۔ مگر سونل وہاں نہیں تھی۔ اب اسے انتظار کرنا تھا۔ وہ اس خیال سے خوش ہوا کہ شاید آج وہ خود لیٹ ہو گئی۔ وہ مسکرایا اور ویٹر کو ایک کپ لیمن ٹی کا آرڈر لکھوا کر اپنے اطراف کے ٹیبلز کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد بھی سونل نہیں آئی تو وہ بے چین ہو گیا۔ اب تک وہ اسے پچیس سے زائد دفعہ فون کال کر چکا تھا مگر سونل نے فون ریسیو ہی نہیں کیا بلکہ کئی بار فون کاٹا بھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آدھا گھنٹہ اور بیت گیا۔ 'وہ شاید آ کر چلی گئی۔' اس نے شدید غصے میں خود کو ملامت کی اور کچھ دیر اور انتظار کر لینے کے بعد ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

اس نے ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے ہوٹل کے دائیں بائیں دور دور تک نگاہ دوڑا کر آخری بار سونل کو تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر اس کی نگاہ پھر نامراد ہو کر لوٹ آئی۔ شام کا ملگجا اندھیرا آہستہ آہستہ شہر کی روشنائی میں جذب ہو رہا تھا۔ گاڑیوں کی چیختی چلاتی آوازوں کے ساتھ ٹریفک بھی دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ لامحالہ اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ ابھی وہ کوئی دو کلومیٹر ہی چلا ہوگا کہ بائیں طرف ریگل ملٹی پلیکس سینما کے فرسٹ فلور پر واقع، رِٹ آئس کریم کے پیسج میں اسے سونل کا سایہ سا نظر آیا۔ اسے لگا وہ سونل ہی ہے، مگر وہ شاید کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھی ہے! ایک زلزلہ سا اس کے اندر برپا ہوا۔ اس نے اس چھوٹے سے فاصلے کو طے کر کے ایک لمبا موڑ کاٹا اور بڑی سرعت سے رِٹ آئس کریم کے سامنے پہنچ گیا۔ مگر وہاں سونل کو نہ پا کر وہ حیران رہ گیا۔

اس نے سیٹ سے اچک اچک کر اس ٹیبل کے چاروں طرف نظر دوڑائی جس پر اسے سونل کے بیٹھے ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ پیسج کے تمام ٹیبل انگیج تھے، جن پر بیٹھے لوگ ہولے ہولے باتیں کرتے ہوئے آئس کریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ویٹر ہاتھوں میں آرڈر مشین لیے یہاں وہاں گھوم رہے تھے۔ غرض کہ بڑی چہل پہل تھی لیکن وہاں سونل نہیں تھی۔ اس نے ایک نگاہ تاسف پیسج کی دیوار پر لگے ڈیجیٹل اسکرین بورڈ پر ڈالی جس پر آئس کریم کے مختلف فلیور بلنک ہوتے ہوئے اسکرول ہو رہے تھے۔ پھر ٹیکسی اسٹارٹ کی اور بغیر کوئی موڑ کاٹے اپنی ٹیکسی کو ٹریفک میں ڈال دیا، جہاں بے شمار گاڑیاں ریلے کی شکل میں ایک سمت کو بہہ جا رہی تھیں۔

سچ

دولت کے بغیر صرف خوبصورت ہونا بیکار ہے۔

رومانس امیروں کی عیاشی ہے۔

بے روزگار کا پیشہ نہیں۔

غریب کو پریکٹیکل اور سادہ ہونا چاہیے۔

دلکش نظر آنے کے بجائے مستقل آمدنی ضروری ہے۔

یہ جدید دنیا کے بڑے سچ ہیں

آسکر وائلڈ

گُم گُم

ارم نعیم
(الٰہ آباد)

ابھی چند لمحے پہلے لالی کتنی مشکلوں کے بعد سوئی تھی ورنہ شام سے کھانس رہی تھی۔۔۔''بھلا ہو رانو کاکی کے بتائے کاڑھے کا، جو دوائی سے زیادہ اثر دار نکلا'' دھانی نے اتنا سوچا ہی تھا کہ بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا اور بجلی کی ایک کڑک اس بے رونق کمرے کی ساری چیزیں لمحوں کے لئے روشن کر گئی۔۔۔ دو چارپائی، ایک پرانی بوسیدہ میز ایک کُرسی، دو صندوق، ایک کونے میں بھگوان کا چھوٹا سا مندر جہاں کرشن اور رادھا کی مورتی براجمان تھی انکے چرنوں میں کئی طرح کے پھول رکھتے تھے۔ وہیں دوسرے کونے میں چند چیزوں کے ساتھ سلیقے سے سجی ایک ننھی رسوئی آباد تھی، دیواروں سے رنگ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے سے ماس۔

دھانی نے کمرے میں روشن واحد چراغ کو دہلیز پہ رکھا جو تیز ہوا کے جھونکوں سے بجھنے کو بیتاب ہوا تھا، مگر وہ چراغ اسی حالت میں چھوڑ کر باہر ڈوری پر ڈلے کپڑے مستعدی سے اتارنے لگی بجلی کی ایک کوند اسکی سانولی رنگت پر پڑی تو اسکی ناک کی لونگ اس تاریکی میں چمک اٹھی، بارش کی تیزی اسکی رفتار بھی بڑھاتی جا رہی تھی اور کمرے میں آتے آتے کپڑوں کی تعداد نے اسکا چہرہ ہی ڈھانپ دیا، بڑی مشکلوں سے ایک صندوق کھول کر اس میں کپڑے رکھنے لگی، اسے ابھی بھی یاد تھا کہ پچھلی بارش میں کھپریلے سے ٹپکتے سیاہ پانی نے رشمی دیدی کے پتی کا شہر سے لایا کُرتا خراب کر دیا تھا، اور ماں نے اپنے جمع پیسوں سے بھرپائی کی تھی، تبھی ماں نے اپنی گرہستی کا ایک صندوق کپڑوں کے لئے کھالی کر دیا، آخر یہ کپڑے انکی روزی روٹی کا سامان تھیں۔

ماں پہ نظر ڈالی تو وہ دوا کے سبب گہری نیند میں تھی ورنہ تو ایک آہٹ پہ جاگ اٹھتی۔ ماں کو پُرسکون دیکھ کر اسے تھوڑی دیر میں چھت ٹپکنے کا خیال ستانے لگا، ابھی کل ہی وہ مدن کاکا سے بارش سے گھر بچانے کو پنّی لائی تھی مگر اس بے وقت برسات کا اندازہ نہ تھا، پر اب اسٹول کی مدد سے چھت ڈھانکنے لگی بارش تیز ہوتی جا رہی تھی مگر وہ اینٹوں کی مدد سے پنّی دباتی رہی، اس نے کوشش تو پوری کر لی پر نتیجہ دیکھنا باقی تھا۔ اس لئے اندر آ کر غور سے کمرہ دیکھا، کامیابی نے اسکے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھیر دئے مگر وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی، اس نے کپڑے تبدیل کئے ماں اب بھی میٹھی نیند میں تھی، پچھلی دو راتیں تو کھانستے ہوئے بیتی تھی۔

یہ گھر ہی ماں بیٹی کی کُل کائنات تھا جہاں سردی گرمی تو گزر جاتے مگر برسات کسی بلا سے کم نہ تھی، دونوں ساری رات چھت سے ٹپکتا پانی برتنوں میں اکٹھا کرتی اور برتن پورا بھرنے قبل اس کا پانی باہر پھینکنا ہوتا، باہر بارش بند ہو جاتی پر اندر جاری رہتی، لیلا چھت کو خوب کوستی پر اس بیچاری کا کیا قصور۔۔۔ وہ کوئی آج کی تو نہ تھی، سترہ سال پہلے جب گوپال اسے بیاہ کر لایا تھا اس سے بھی پہلے کی تھی، یہ گھر گوپال کا اپنا نہ تھا بلکہ رحمان خاں کی حویلی میں ملازموں کے لئے مخصوص تھا، جب انکے اکلوتے بیٹے کو یورپ میں نوکری مل گئی بیچارے اکیلے کیا کرتے بیوی بھی فوت ہو چکی تھی اس لئے بیٹے کے بلاوے پر پوتے پوتی کی محبت میں برسوں پرانا گھر بیچ کر چلے گئے، مگر گوپال کی خدمات وایمانداری کے سبب یہ جگہ ہمیشہ کے لئے اسے دے گئے، گوپال کے گزر جانے پر لیلا کو یہی ایک سہارا نصیب ہوا۔

کتنی خوش تھی وہ گوپال کے ساتھ، وہ اسکی ہر ضرورت کا خیال رکھتا کم آمدنی میں بھی دونوں ہنسی خوشی زندگی گزار رہیں تھیں، دھانی کی پیدائش نے انکی محبت میں اضافہ کر دیا، وہ ڈھائی سال کی تھی کہ بھگوان نے ایک بیٹا بھی دے دیا، لیلا بولی ''دھانی کے باپو بُرا نہ مانو تو ایکو نام ہمار مرجی سے رکھ دیبو؟'' گوپال بولا ''تو بھی رے لیلا ایسے پوچھے کی کا بات ہے نو مہینوا سب تکلیپھ تو، تو کو ہوئی، اب کا نام رکھے کے ادھیکار کونوں اور کے ہوئی۔۔۔ بول کا نام سوچے ہے''۔ ''سورج۔۔۔ ہمار نانا جی کے نام بھا، اوہی سارا پالن پوشن کرین بہوت لاڈ دین ہمکا، بابو جی تو سہیر میں رہت رہیں، نانا جی آپن کانھدے بیٹھائے میلا میلا پھیرت رہیں، کھوب سُکھ دین پھر ایک دن چلے گئے ہمکا چھوڑ کے، ابہی کھاتر انکے نام رکھے کا دلوا کرت بھا۔۔۔ ہمیسہ روشن کرے ہم لوگن کی جندگی''۔۔۔ نانا کو یاد کر اسکی آنکھیں نم ہو گئی۔۔۔''واہ رے لیلا ای تو اچھا سوچے۔۔۔ اوئے !مُنّا۔۔۔ لے اب سے سورج بھوا تو ای گھر وا کے''۔

سورج اب چھ مہینے کا اور دھانی تین سال کی تھی، ہر دن کی طرح آج بھی لیلا نے گوپال کو ناشتہ دیا، وہ پارسل کے ڈبّے اسکوٹر پر باندھ کر بانٹنے نکل پڑا، گھر لوٹتے وقت سنسان سڑک پر ایک عورت بچّہ گود میں لئے بچاؤ۔ بچاؤ چلاتی ہوئی بے تحاشا بھاگ رہی تھی جسکے پیچھے کئی بائک سوار آدمی تھے، گوپال نے بنا کچھ سوچے جلدی سے اسکوٹر عورت کی طرف روکا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور تیز رفتار میں بھاگنے لگا مگر قسمت کو اسکی یہ نیکی راس نہ آئی، آگے سے آئے بائک سوار غنڈے کی گولی اسکے پیٹ میں پیوست ہو گئی، گولی کی آواز پر بھیڑ جمع ہونے لگی تو غنڈے بھاگ نکلے، گوپال زمین پر گر پڑا خون بہتا جا رہا تھا، پونم نے جلدی سے روتے ہوئے ایک آٹو رکشا روکا، اور رکشے والا شاید اسکے آنسو سے تر بہ تر چہرہ دیکھ کر اسے اسپتال پہنچانے کو راضی ہو گیا، اسی نے گوپال کو ہاتھ لگا کر اٹھوایا ورنہ لوگوں کو تو تماش بینی میں ہی مزا ملتا ہے، پونم نے پانچ برس کے بیٹے کرشنا کو گود میں اٹھایا، گرنے سے بچے کو بھی چوٹ آئی تھی اور وہ زار و قطار رو رہا تھا، اسپتال پہنچتے ہیڈ اکٹروں نے پولیس کیس کہہ کر گوپال کو ہاتھ نہ لگایا، وہ بار بار روتی ہوئی رحم کی بھیک مانگتی رہی ''ڈاکٹر صاحب یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے اس نے ہم ماں بیٹے کی جان

بچائی ہے آپ اسے بچا لیجئے'' مگر اسکی سنتا کون؟ پولیس کے آنے تک گوپال دنیا کو الوداع کہہ چکا تھا۔

اگلی صبح لیلا کے لئے روشنی کے بجائے تاریکی لائی تھی، گوپال کا ٹھنڈا جسم اسکے گھر کے سامنے رکھا تھا۔ آج نہ صرف لالی کی مانگ سے لالی پوچھی گئی تھی بلکہ یہ طوفان اسکی زندگی سے لال کے ساتھ سبھی رنگ اُڑا لے گیا تھا، وہ بے سُدھ بیٹھی تھی، جیسے سب کچھ ایک برا خواب ہو جو آنکھ کھلتے ہی ختم ہو جائے گا، گود میں ننہا سورج دودھ کے لئے رو رہا تھا اور بغل میں بیٹھی دھانی بھی رو رہی تھی۔۔۔ پونم ایک کنارے پر کھڑی مُجرم نگاہوں سے سارا منظر دیکھ رہی تھی، انتم سنسکار میں ننھے سورج کے ساتھ کرشنا نے بھی ہاتھ لگایا تھا۔

پونم جان گئی تھی کہ اسکے بیٹے کو یہ زندگی گوپال نے دی ہے اس نے روتے ہوئے دھانی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دی اور بولی'' میں ایک دن تمہارے فرشتے جیسے باپ کا احسان ضرور ادا کرونگی بیٹا۔۔۔ کرشنا اب سے تم لوگوں کی امانت بن کر میرے پاس رہیگا'' لیلا سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر ایک لفظ نہ بولی، آخر وہ اپنے پتی کی اس نیکی کی کیا توہین کرتی وہ تو اپنی زندگی جلا کر بھی دوسرے کی زندگی روشن کر گیا۔ اسی رات پونم کرشنا کو لے کر کسی اور شہر چلی گئی، یہ غنڈے اسکے پتی کے بھیجے ہوئے تھے جو پچھلے ایک سال سے اسے دھمکی دے رہا تھا کہ اگر اس نے اپنے مانگے کی جائداد اسکے نام نہ کروائی تو اسکا انجام بہت بُرا ہوگا وہ جان گئی تھی کی انکی جان کو اب ہر طرح سے خطرہ لاحق ہے، لیکن وہ اس صورت میں بھی مانگے کا رُخ نہیں کر سکتی تھی وہاں تو یہ رواج تھا کہ لڑکی کی ڈولی نکلنے کے بعد ارتھی سسرال ہی سے نکلتی، لہٰذا وہ سب کچھ چھوڑ کر دلّی آ گئی جہاں اسے گُردوارے کے علاوہ کوئی دوسرا محفوظ ٹھکانہ نظر نہ آیا۔

آج گوپال کو گزرے ہوئے ساتواں دن تھا اور لیلا کی زندگی کے سارے مناظر تبدیل ہو چکے تھے اب بچوں کا پیٹ اسے ہی بھرنا تھا کیونکہ غریب کا کوئی آسرا نہیں ہوتا، اس نے گھروں میں جھاڑو برتن کرنا شروع کیا، مگر پیسے کافی نہ تھے سورج کی کمزوری کے باعث ڈاکٹر نے پاؤڈر اور کچھ دوائیاں تجویز کی تھی لیکن ان پیسوں میں یہ سب ممکن نہ تھا، اب وہ شام کو کمبل رضائی کے کارخانے میں روئی بھی دھننے لگی، کام کرتے ہوئے چار پانچ مہینے ہو چکے تھے زندگی راہ پر آنے لگی لیکن اس سب میں سورج کی دیکھ بھال میں کمی آ گئی، اور اسکی صحت گرتی گئی تین دن تک بُخار کم نہ ہوا وہ کام پر جانے کے بجائے اسے گود میں لئے اس ڈاکٹر سے اس ڈاکٹر اور دواخانوں کے چکّر لگاتی رہی اور انکی ہدایتوں پر عمل کرتی رہی۔ ننھی دھانی بھی اپنے مُنّا کو پیار کرتی کھلونے دکھاتی کہ وہ نہ روئے، رات کو لیلا اپنے لال کو سینے سے لگائے لیٹی تھی دوسری طرف دھانی ماں کا آنچل تھامے سو رہی تھی۔۔۔ مگر اس رات لیلا اور گوپال کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی غروب ہو گیا، ایک اور طوفان اسکی رہی سہی پونجی بھی چھین لے گیا۔

دن گزرتے گئے اس نے دوبارہ کام پر جانا شروع کیا اس لئے نہیں کہ پیسوں کی ضرورت تھی بلکہ اس لئے کہ جسکی دواؤں کے لئے محنت کرتی تھی وہ تو اب اسکی دنیا میں رہا ہی نہیں لیکن اس کمرے کی چار دیواری میں بکھری سورج کی خوشبو، اسکے کپڑے، کھلونے اسے ہر لحہ بچپن رکھتے اس لئے وہ کوشش کرتی کہ کتنا کم وقت کمرے میں گزارے، سال گزرتے گئے دھانی اب اسکول جانے لگی... اس دن لیلا پہلی بار سب کے لئے مٹھالائی۔۔۔ تبھی کارخانے کے مالک آلوک بابو پوچھ بیٹھے ''کون کھوسی میں لیلا''،

''ارے بھیّا جی دھانی میٹرک میں پرتھم آئی ہے، بس اب کشن کنہیا اوکو گھر بسا دے اب تو ہر سپیرے ایہی پراتھنا ہے''

''ارے واہ ای تو بڑی کھوسی کی بات ہے'' انہوں نے جیب سے بیس کا نوٹ نکال کر لالی کی طرف بڑھایا۔۔۔ ''ای لیو بٹیا کو انام دے دیو ہمار''

دھانی اور لگن سے پڑھائی کرنے لگی ماسٹر جی اسے حوصلہ فراہم کرتے رہیں اور وہ کسی نئے چراغ کی مانند پوری تاب و توانائی سے روشنی دیتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی اسے احساس تھا کہ وہ ماں کا آخری سہارا ہے اور اسے انکے لئے بہت کچھ کرنا تھا۔ پر ایک نئی آزمائش سرِ راہ اسکی منتظر تھی، روئی کی دھنائی نے دھانی کی تعلیم میں تو بہت اہم رول ادا کیا لیکن اس سے نکلنے والے دھول مٹی نے لالی کو دمے کا مریض بنا دیا پر وہ اس سب سے بے خبر تھی، ایک دن لیلا کی طبیعت زیادہ خراب ہونے پر دھانی اسے اسپتال لے گئی اور اسی دن اسے ماں کی بیماری کا علم ہوا، اس نے ماں کو کچھ نہ بتایا مگر یہ کہہ دیا کہ ڈاکٹر نے دوا کے ساتھ کچھ دن آرام بتایا ہے اس لئے اب وہ کچھ دن کام پر نہ جائے گی۔۔۔ لالی کام پر جانے کو بضد تھی لیکن طبیعت نے ساتھ نہ دیا تو خاموش ہو گئی، کئی دن گزرے تو ان گھروں سے لالی کا بلاوا آنے لگا اس لئے دھانی نے کام کرنے کا فیصلہ کیا اور کام پر جانے لگی، ماں کی ساری صفات اس میں بدرجہ اتم موجود تھی، اس میں لیلا جیسی سلیقہ شعاری دیکھ کر سب اسے چھوٹی لیلا کہنے لگے اور جستہ جستہ یہی اسکا نام ہو گیا۔

لالی اب بستر پہ تھی اس لئے دھنائی کا کام بند ہو گیا اور وہاں سے آنے والا رزق بھی، پر ضرورتیں تو نہیں رُکتی وہ پیڑ کی مانند بڑھتی ہی جاتی ہیں سورج کے بعد علاج کی ضرورت لالی کو تھی، اور یہ کام اب دھانی کو کرنا تھا۔ اس نے صاف صفائی کے ساتھ کپڑے دھونے شروع کر دئے۔۔۔ اسکول جانا چھوڑ دیا لیکن پڑھائی کرتی رہی اسے امتحان جو دینا تھا۔۔۔ اسکے قصبے میں کئی کو چنگ سینٹر ہونے کی وجہ سے دور دراز گاؤں کے طالب علم رہتے تھے جن میں کچھ سے اسکی دوستی تھی ان سے پڑھائی میں مدد مل جاتی۔۔۔ وہ اکثر ان لوگوں کے لئے کھانا بنا دیتی، پھر ایک دن اسکی دوست آمنہ بولی:

''چھوٹی لالی تم روٹیاں اتنی اچھی بناتی ہو کہ بس کھاتے ہی جاؤ اگر تمہاری روٹیاں کسی ہوٹل میں بکتی تو سارا دن لائن لگی ہوتی''

دھانی ہنس پڑی ''اب اتنا بھی بڑھا کے نہ کہو۔۔۔ تم ہماری سہیلی ہو اسی لئے کہہ دیتی ہو۔۔۔''

''چہارسُو''

''ارے نہیں دھانی ہم سچ کہہ رہیں تم کہو تو ہم تمہیں دکھا دیں کہ سب کتنے مزے لے لے کر کھاتے ہیں، تم کل کچھ روٹیاں بنا کر دے دینا باقی کام ہمارا''۔۔۔چھوٹی لالی نے روٹیاں دے دی اور آمنہ کی بات صحیح ثابت ہوئی پھر کیا تھا اب محلے بھر کے لڑکے لڑکیاں شام کو چھوٹی لالی کے دروازے پر جمع نظر آتے اور وہ انگیٹھی پر نرم، ملائم، خستہ روٹیاں بناتی جاتی سب اپنی باری پر روٹیاں لیتے۔۔۔اسکے ہاتھ کی روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوا میں گھل جاتی۔ ہر چند کہ وہ ماں کو منع کرتی لیکن لالی بھی اسکے کام کروا دیتی آخر اسکے پاس ماں کا دل تھا اور اپنی بیٹی پر ہر کام کا بوجھ ڈال دینا اسکی غیرت کے خلاف تھا اس لئے بعض اوقات وہ اپنی دوائیں جان بوجھ کا نہ کھاتی تا کہ زیادہ دن چل جائے۔۔۔لیکن دھانی ماں کی عادت جانتی تھی اس لئے دوا اپنے سامنے کھلا کر ہی دم لیتی۔

اس دن کام سے فارغ ہو کر گھر آئی ماں کو کھانا کھلایا، اور معمول کے مطابق گھر سے کچھ دور واقع چاپا کل پر کپڑے دھونے چلی گئی.. بالٹی کا پانی ختم ہو گیا پر اسکے ہاتھوں میں لگے صابُن کی وجہ سے چاپا کل کا ہینڈل ہاتھ سے پھسل جاتا عین اسی وقت کسی کے ہاتھوں نے بند چاپے میں جان ڈال دی اور بالٹی بھرنا شروع ہو گئی۔۔۔اس نے مُڑ کر دیکھا تو کوئی نیا چہرہ لگا۔۔۔گوری رنگت، مضبوط بازو، اونچا قد، آنکھوں پر چشمہ۔۔۔دھانی اس وقت گلابی سلوار سوٹ میں ملبوس تھی، سینہ ڈھانپتے ہوئے دوپٹہ خاص وضع سے کمر سے باندھ رکھا تھا، اسکی غزالی آنکھیں کاجل سے اور بھی حسین لگ رہی تھی، سانولی رنگت، بالوں میں دو موٹی موٹی چوٹیاں اور کلائیوں میں دھانی اور پیلی کانچ کی چوڑیاں۔ کپڑے دھونے کے باعث اسکی آدھی شلوار بھیگ چکی تھی..اس نے سامنے والی کی نظریں خود پر جمی دیکھا تو شرم سے ٹھٹھک گئی، جلدی سے اپنے کپڑے درست کئے اور بالٹی ہٹاتے ہوئے بولی ''بہوت دھنیہ باد بابو جی اب رہن دیجئے'' اسکی آواز پہ چونک کر موجودہ شخص نے چاپا چھوڑا، اور کچھ کہے سنے بغیر چلے گئے مانو کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

گھر پہنچ کر دھانی عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھی، اسے گُم سُم دیکھ کر ماں نے پوچھا ''کا ہو بٹیا آج کچھو بات نہ کریو'' ''ماں آج طبیعت ٹھیک نہیں نہ'' ''ارے کاں ہوا بٹیا دبائی کی جرورت ہوئے تو چلی ہم''۔ ''نہیں ماں سو جائنگے تو آرام ملے گا'' مگر آج نیند تو آنکھوں سے میلوں دور تھی اور نیند کی جگہ وہ چہرہ سامنے آجاتا اسی شش و پنج میں نہ جانے کب اسکی آنکھ لگی کہ پھر سورج کی کرنوں نے بیدار کیا۔۔۔کام کر کے آج بھی کپڑے دھونے آئی لیکن جسکے انتظار میں اسکی نظریں بیتاب تھی وہ نظر ہی نہ آیا۔۔۔اس کا دل اداسی سے بھر گیا۔۔۔کون تھا وہ؟ اسے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا؟ کیا نام ہوگا؟ وہ دوبارہ کبھی اس راہ سے جائے گا کہ نہیں؟ اسکے دل نے جب ان سوالوں کا کوئی جواب نہ پایا تو کرشن جی سے بولی ''اے کرشن جی! آپ تو سب جانتے ہیں وہ کون تھا، اس سے پھر سے ملوانے کی کرپا کریئے''۔

ماں کی طبیعت اچانک خراب ہونے کے پر انہیں ہسپتال لے جانا پڑا، پھر کئی دن انکی تیمارداری میں لگی رہی۔۔۔پچھلے تین چار دنوں سے کوئی قصداً دھانی کی تلاش میں اسی راہ سے گزر رہا تھا کہ وہ نظر آجائے لیکن وہ تو ہسپتال میں تھی۔۔۔ماں کی طبیعت بحال ہوئی تو کپڑے دھونے گئی، اور دونوں کی مرادیں بر آئیں۔۔۔وہ چاپا کے قریب آکر کھڑا ہوا تو دھانی نے پوچھا

''کیا ہوا بابو جی کوئی کام ہے آپ کو۔۔۔کچھ نئے مالوم ہوتے ہو؟''

''جی ہفتے بھر پہلے ہی رامانند سوامی اسکول میں ٹیچر ہو کر آیا ہوں''

''رامانند سوامی میں؟''

''ہاں کیوں وہ اچھا اسکول نہیں ہے؟''

''نہیں بابو جی بہت اچھا ہے'' اسکول کا نام سن کر اسکی آنکھیں نمدیدہ ہو گئی

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہم بھی وہی پڑھنا چاہتے تھے''

''تھے کا کیا مطلب؟ اب نہیں پڑھتی''

''نہیں اب ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اس لئے گھر پہ پڑھتے ہیں''

''کیوں گھر میں کوئی اور نہیں؟''

''نہیں بس ماں اور ہم''

''مگر یہ سارے کپڑے''

''ارے یہ تو جہاں کام کرتے ہیں وہی کے ہیں''

''کیا کام کرتی ہو؟''

''صفائی اور کپڑے پھر شام کو روٹیاں بناتے ہے محلے بھر کے ودیارتھیوں کی سارے میں مسہور ہے ہمائی روٹی۔۔۔ویسے آپ کہے تو آپکے کپڑے بھی دھو دینگے روٹی بھی بنا''

''اچھا ایسا ہے تو آج شام کی روٹیاں کھا کر دیکھ ہی لیتے ہے کہ کیوں مشہور ہیں''

''بلکل بابو جی جرور دیکھ لینا''

''ویسے میرا نام بابو نہیں ستیش ہے''

''وہ ہنس پڑی ارے یہ تو آدر کے لانے کہتے ہیں اچھا اب چلتے ہیں''

''ارے اپنا پتہ تو بتاتی جاؤ روٹیاں کہاں لینے آوُنگا'' اس نے بغیر مُڑے ہی جواب دیا

''کوئی سے بھی پوچھ لینا چھوٹی لالی کا گھر بچے بھی بتا دینگے''

''چھوٹی لالی! یہ کیسا نام ہوا بھلا'' اور ستیش اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا''۔

''چہارسُو''

وہ کمرے پر آتے ہی اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا اور شام کو وہی ناول لے کر بیٹھ گیا جو پچھلے کئی دنوں سے پڑھ رہا تھا اسکے نسوانی کردار میں ستیش کو چھوٹی لالی کا چہرہ نظر آنے لگا، تبھی روٹیاں لینا یاد آیا، آٹھ بج چکے تھے۔

باہر نکل کر کسی سے راستہ پوچھا گھر آنے والا تھا کہ بجلی گُل ہو گئی۔ آگے کھپریلے کا گھر نظر آیا، صحن میں موجود پیڑوں سے بندھی ڈوریوں پر کپڑے ڈلے تھیں کچھ دور پر انگیٹھی روشن تھی اور کسی کے دو نازک ہاتھ تیزی سے روٹیاں بیلنے اور سیکنے میں مصروف تھے۔ بیچ میں جب وہ توا اُٹھاتی تو کوئلے کی دہک سے اسکا چہرہ بھی سُرخ مائل ہو جاتا۔۔۔ اسکی چوڑیوں کی کھنک ایک دھُن بن کر ستیش کے کانوں میں مصری سی گھولنے لگی۔

ستیش بھی قطار میں کھڑا ہو گیا دو لوگ باقی تھے اس نے بغیر دیکھے ہی آواز دے دی

''کتنی دے بھیّا''

''پانچ'' آواز سنتے ہی اس نے نظریں اٹھائی

''ارے ماسٹر بابو! آپ ماف کرنا ہم دیکھے نہیں''

''ارے کے آوا بھابٹیا''

''ارے ماں نئے ماسٹر بابو آئے ہیں اسکول میں آج چاپا پہ ملے، نئے ہیں تو ہم روٹی کا کہہ آئے، وہی لینے آئے ہیں''

''ارے بہوت اچھا کیو بٹیا.. آؤں بابو جی بیرا جو''

ستیش کے حال چال پوچھنے تک روٹیاں بن گئی ستیش نے پیسے پوچھے تو ماں بولی

''ارے ببوا آج تو کھالیو جو سواد لگے تو آگے سے دینا'' یہ سنتے ہی ستیش کے دل میں انکی عزت کئی درجہ بڑھ گئی شاید غریبی میں امیری اسے ہی کہتے ہیں۔

اگلے دن ستیش اسکول سے لوٹا تو وہ چاپا پہ مل گئی ''ارے واہ! چھوٹی لالی تمہاری روٹیوں میں تو جادو ہے اب سے پانچ روٹیاں ذیادہ بنانا، تعریف سن کر اسکا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔۔۔ ستیش کی نظر اسکی چوڑیوں پر پڑی جو کپڑے دھونے کے سبب مسلسل دھُن پیدا کر رہی تھی۔۔۔ اسے اُس دھُن کی عادت ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ اب روز شام وہ لیلا کے پاس بیٹھ کر طبیعت پوچھتا۔ اسی دوران اس نے لیلا کی ساری رپورٹ اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس دلّی لایا اور علاج سے متعلق دوائیں لا کر چھوٹی دھانی کو دیں اور یقین دلایا کہ ماں کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی ''تم پریشان نہ ہوا کرو میں ہر لحہ تمہارے ساتھ ہوں''۔ وہ جانتی تھی کی ماں باہر کے مہنگے علاج کو راضی نہ ہو گی مگر اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ علاج کروائے گی۔ اور دل ہی دل میں ماسٹر بابو کو دُعائیں دینے لگی کہ کوئی اسکی ماں کے لئے چنِنت ہے۔۔۔ محبت کے بیج سے اب کلی پھوٹ رہی تھی۔

شام ستیش ماں کا حال لینے آیا، آج لیلا رو پڑی اسے اپنا کوئی بھروسہ نہ تھا پر بٹیا کو کس کے حوالے سونپتی یہی بات اسے مارے ڈال رہی تھی... اسے کسی کا انتظار تھا جسکے لئے وہ روز کشن کنہیّا کے سامنے ہاتھ جوڑتی تھی۔۔۔ لیش کا دل چاہا کہ وہ انکی بیٹی کیلئے اپنے جذبات سامنے رکھ دے پر کچھ کہہ نہ سکا۔ اگلے دن دھانی نے کھیر بنائی اپنے پاس جمع رقم رُمال میں باندھا، دوپہر کا وقت تھا دستک پر دروازہ کھُلا اُسے پہلی دفعہ اپنے در پہ دیکھ کے ستیش حیران ہوا۔

''ارے چھوٹی لالی !تم۔۔۔ اندر آجاؤ'' وہ کچھ سنکوچ سے اندر آئی، تو وہ اسکے لئے پانی لانے کچن میں چلا گیا۔

گھر میں سب کچھ بڑی نفاست سے سجا تھا، دیوار پر ایک عورت کی تصویر، ایک میز پر کچھ کتابیں، لالٹین، پلنگ پر صاف چادر۔۔۔ تبھی وہ پانی اور مٹھائی لے آیا ''ارے تم ابھی تک کھڑی ہو بیٹھی کیوں نہیں'' وہ پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ گئی، کھیر کا ڈبّہ اور رقم اسکے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''ہم جانتے ہیں کہ باہر کا علاج مہنگا ہوگا ہمارے پاس سایدا اتنے پیسے بھی نہ ہو مگر جو کچھ تھا ہم لے آئیں آپ رکھ لیجئے مگر ماں سے کچھ نہ کہنا وہ نہیں چاہتی کہ ان روپیوں سے اسکا علاج ہو وہ تو بس شادی۔۔۔ مگر ہمائے لئے تو وہی سب کچھ ہے ہمارا۔۔۔''

اسکی انکھوں سے ٹپکتے موتی ستیش نے آگے بڑھ کر اپنی مٹھی میں سمیٹ لئے اور بولا:

''کیا میں تمہارا کچھ نہیں ؟ کیا ماں کا علاج کرانا میرا فرض نہیں۔۔۔ میں تمہارے لئے اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔۔۔ مگر''

''مگر کیا ماسٹر بابو''

''میری ماں کا وہ وعدہ تمہاری طرف بڑھتا قدم ہر بار روک لیتا ہے پر اب لگتا ہے کی ماں کا خواب پورا کیا تو خود کے ساتھ ناانصافی ہو گی''

''کیسا وعدہ؟''

''چھوٹی لالی آج تک تمہیں اپنا اتیت نہیں بتا سکا مگر اب بتانا ضروری ہے۔۔۔ میں اسی قصبے کا واسی ہوں پانچ برس کا تھا جب باپ نے دولت کی لالچ میں ہم ماں بیٹے پر حملہ کروایا، اسی قصبے کے ایک فرشتے نے ہم دونوں کی جان بچائی لیکن خود اپنی جان گنوا دی، انکی بیوی، ایک چھوٹی بیٹی اور گود میں بیٹا تھا، ماں نے ان لوگوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ مجھے ایک دن ان لوگوں کو سونپ دینگی۔۔۔ ماں اور میں دلّی میں گُردوارے میں رہتے تھے، وہیں میری پڑھائی ہوئی، ایک سال پہلے نوکری مل گئی، تب سے ماں کی آرزو تھی کہ میں ان لوگوں کے پاس چلا جاؤں اور انکی بیٹی دھانی کو بیاہ لاؤں، چھ مہینے پہلے بڑی کوششوں سے یہاں ٹرانسفر ملا لیکن پھر ماں ہی نہ رہی۔۔۔ آخری وقت میں یہ کنگن سونپ گئی کہ یہ صرف دھانی کو دینا۔۔۔ مگر یہاں آیا تو تم مل گئی اور تم سے محبت ہو گئی.. اب ماں کا وعدہ کیسے پورا کروں؟ اتنے دنوں میں ان لوگوں کو تلاش نہیں کر سکا اور سچ کہوں تو تم سے ملنے کے بعد ڈھونڈنا بھی نہیں چاہا''

ستیش کے اتیت نے دھانی کا بیتا ہوا دردناک کل کھلی کتاب کی طرح اسکے سامنے رکھ دیا تھا یہ تو وہ باتیں ہیں جو ماں اسے اکثر بتایا کرتی، ماں کو کسی کرشنا کا تو کب سے انتجار تھا جسکی ماں لیلا سے کوایک وچن دے گئی تھی..بھگوان کرشن سے وہ اسی کرشنا کو دیکھنے کی پرارتھنا کرتی تھی۔دھانی نے پوچھا۔

''کرشنا ہو تم؟''

''کیا کہا تم نے؟''

''تم کرشنا ہو؟''

''ہاں! مگر یہ نام تو صرف میری ماں جانتی تھی باپ کے ڈر سے انہوں نے مجھے ستیش بنا دیا تھا مگر، تمہیں کیسے پتہ؟''

''کیونکہ ہم ہی دھانی ہیں''

''کیا؟ تم دھانی ہو، میری ماں کی دھانی، ماں کی آخری آرزو۔۔۔ اس چہرے کو دیکھنے کے لئے وہ آخری لمحے تک بے چین تھی۔۔۔تم وہی دھانی ہو۔۔۔اے بھگوان تم نے میری لاج رکھلی ماں کے سامنے، مگر سب تو تمہیں چھوٹی لالی کہتے ہیں''

''ہاں! ماں کی بیماری کے بعد اسکے کام کے سنگ نام بھی میرے حصے آ گیا''

آج کرشنا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اسے ماں کے خواب کی تکمیل اور اپنی محبت دونوں ہی چیزیں چھوٹی لالی اور دھانی کی شکل میں مل گئی تھی اس نے آگے بڑھ کر ماں کے کنگن اسکی کلائی میں پہنائے۔۔۔اس نے دھانی کو اپنے قریب کرتے ہوئے اپنے حصار میں لیا، اسکی پیشانی پر اپنی محبت کا پہلا بوسہ ثبت کیا دونوں زار و قطار رو رہیں تھے مگر یہ آنسو خوشی کے تھے، آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ بتا دیا گیا تھا، بہت کچھ جتا دیا گیا تھا۔

شام وہ دھانی کے گھر آیا تو، ماں کو سب کچھ پتہ چل چکا تھا، آج سارے راز افشاں ہو چکے تھے، ماں تو کب سے اسے گلے لگانے کو بیچین تھی، آخر اتنا لمبا انتظار جو کیا تھا اسے اشیرواد دے کر مندر کی طرف بڑھی، ماں نے کُم کُم کی ڈبیا کھول کر کرشنا کی طرف بڑھا دی۔۔۔دھانی شرم اور خوشی کے امتزاج سے لال ہوئی ایک کونے میں کھڑی تھی، ماں نے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔۔۔ اب وہ دونوں ٹھیک ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔۔۔کرشنا نے ڈبیا کھول کر ایک چٹکی کُم کُم نکال کر دھانی کی مانگ میں بھر دیا۔۔۔جس دروازے پر کبھی لالی کی مانگ سے سرخی پوچھی گئی تھی آج اسی دروازے پر اسکی بٹیا کی زندگی میں رنگ بھرا گیا تھا اسی شخص کے ذریعہ بھرا گیا تھا جسکے لئے یہ قربانی دی گئی تھی، ماضی کی ساری تاریکیاں روشنی میں بدل گئی تھی زندگی نے انصاف کا پرچہ اسکے دامن میں رکھ دیا تھا، دھانی جنم۔جنم کے لئے کرشنا کی ہو گئی تھی انکی محبت رنگ لے آئی تھی۔۔۔دونوں نے آگے بڑھ کر ماں سے آشیرواد لیا اور ماں کو اس لمحہ یوں محسوس ہوا مانو مندر میں رادھا کرشن خود انکے سامنے آ گئے ہوں۔

Attention

After the age of 50 one may experience many types of illnesses. But the one I am most worried about is Alzheimer's. Not only would I not be able to look after myself, but it would cause a lot of inconveinence to family members

One day, my son Sushilcame home and told methat a doctor friend has taught him an exercise using the tongue.

The tongue exercise is effective to reduce the onset of Alzheimer's and is also useful to reduce / improve

1 Body weight
2 Hypertension
3 Blood-Clot in Brain
4 Asthma
5 Far-sightedness
6 Ear buzzing
7 Throat infection
8 Shoulder / Neck infection
9 Insomia

The moves are very simple and easy to learn

Each morning, when you wash your face, in front of a mirror, do the exercise as below :

Stretch out your tongue and move it to the right then to the left for 10 times.

Since I started exercising my tongue daily, there was improvement in my Brain Retention. My mind was clear and fresh and there were other improvements too...

1 Far sightedness
2 No giddiness
3. Improved wellness
4. Better digestion
5. Lesser flu / cold

I am stronger and more agile.

The tongue exercise helps to control and prevent Alzheimer.Medical research has found that the tongue has connection with the BIG Brain. When our body becomes old and weak, the first sign to appear is that our tongue becomes stiff and often we tend to bite ourselves.

Frequently exercising your tongue will stimulate the brain, help to reduce our thoughts from shrinking and thus achieve a healthier body.

"شیشے کا شہر"

نوید سروش

(میرپورخاص)

جب میں ہی اُس کو نہیں سمجھا، وہ بھی مجھ کو جانے کیوں
میرے دل کی باتیں آخر، وہ مانے تو مانے کیوں

اُس نے دل کی بات کہی اور جانے پھر کیا یاد آیا
دھیرے دھیرے رنگت بدلی جھک گئے اُس کے شانے کیوں

یہ تو بس موسم بدلا ہے اور تو کوئی بات نہیں
موسم کی اس تبدیلی ، پر لوگ ہوئے دیوانے کیوں

کوئی تو اس راز کو سمجھے، کوئی تو اس پر غور کرے
شمع کی آغوش میں جلنے آتے ہیں پروانے کیوں

ترکِ تعلق کر کے جس نے مجھ کو تنہا چھوڑ دیا
سوچ رہا ہوں، آیا ہے وہ مجھ کو آج منانے کیوں

میں جس میں رہتا تھا اُس میں کوئی نہ تھا انجان سروش
اس بستی کے لوگ مجھے اب لگتے ہیں انجانے کیوں

○

ڈاکٹر ریاض ساغر

(اورنگ آباد)

ناز تھا جن کو مری حاشیہ برداری پر،
وقت بدلا تو اتر آئے ریاکاری پر

کل جنہیں طمغے ملے ملک سے غداری پر،
طعنہ زن وہ بھی تو ہیں میری وفاداری پر

ہم بھی انسان شناسی کا ہنر جانتے ہیں،
آپ مغرور نہ ہوں اپنی اداکاری پر

جھڑکیاں روز جو سنتا ہے جواں بیٹوں کی،
آسماں روتا ہے اس باپ کی لاچاری پر

بے حسی اتنی بڑھی ظلم کو سہتے سہتے،
"لوگ مجبور ہیں ظالم کی طرف داری پر۔"

آسماں چھونا بھی ممکن ہے اگر ہمت ہو،
فتح پانا ہے فقط راہ کی دشواری پر

تاج اور تخت بھی ٹھوکر پہ رکھے ہم نے مگر،
ایک بھی داغ نہ لگنے دیا خودداری پر

بن گیا آج وہی شہر کا حاکم ساغر،
کل تھا اک جشن یہاں جس کی گرفتاری پر

○

مادھو کوشک

(چندی گڑھ)

ہوا ہے قتل بہت بے زباں پتھر کا
کیا نہ درج کسی نے بیان پتھر کا

میں سنگ تراش بھی ہوتا تو کیا بنا لیتا
شہر میں کوئی نہیں قدر دان پتھر کا

عجیب بات ہے شیشے کا شہر ہے لیکن
یہ کس نے باندھ دیا سائبان پتھر کا

ہماری آنکھ ہی پتھر کی ہوگئی ورنہ
کہاں ہوا ہے ابھی آسمان پتھر کا

اگر کسی نے چھوا تو پگھل اٹھیں گے سبھی
میں کہہ رہا ہوں نہ لے امتحاں پتھر کا

○

احمد سراج فاروقی

(کوٹا، راجستھان)

یہ راہ عشق ہے پڑتا ہے اس میں مرنا بھی
یہاں سے ہو کے مگر چاہئے گزرنا بھی

لہولہان پرندوں میں ایک میں بھی ہوں
پڑا ہے مہنگا بلندی سے یوں اترنا بھی

چراغ لے کے ہواؤں کے بیچ نکلے ہو
تو آندھیوں سے ضروری نہیں ہے ڈرنا بھی

یہ راستوں کی تھکن دھوپ سب درست مگر
کسی درخت تلے پل دو پل ٹھہرنا بھی

یہی نہیں کہ عدالت سے اٹھ چکا انصاف
ہے اب تو جرم ہمارا اپیل کرنا بھی

کئی دنوں سے ہے جاری یہ کھیل یوں ہی سراج
اڑان بھرنے کو کہنا بھی پر کترنا بھی

وہ حادثہ بھی جو گزرا تو یہ کھلا مجھ پر
عذاب ہوتا نہیں ٹوٹ کر بکھرنا بھی

○

شبہ کوثر

(آرہ، بہار)

جب اندھیرا عذاب بنتا ہے
تب چراغ آفتاب بنتا ہے

خون بہتا ہے چند نسلوں کا
تب کہیں انقلاب بنتا ہے

ہر عمل روز محشر کی خاطر
اک مکمّل کتاب بنتا ہے

ہر قدم پر ہزار فتنے ہیں
بنت حوا حجاب بنتا ہے

سر اٹھاتی ہے حسن کی غیرت
جب نشانہ نقاب بنتا ہے

حسن جب اک سوال بن جائے
عشق لازم جواب بنتا ہے

عزت نفس جب ہو مجروح
لازمی اجتنا ب بنتا ہے

تربیت سے ہمارے ذہنوں میں
زندگی کا نصاب بنتا ہے

فکر فردا میں کیوں پریشاں ہو
چھوڑئے اضطراب بنتا ہے

آنکھیں کرتی ہیں آرزو برسوں
تب کوثر حسین ایک خواب بنتا ہے

○

جبیں نازاں

(دہلی)

دیکھنا ہے تیری سفا کی کہاں تک جائے گی
ہاں یہ میری تشنگی تو آسماں تک جائے گی

تو نے محفل میں لیا جو نام میرا سوچ لے
پھر خبر اڑ کر گلی سے ہر زباں تک جائے گی

نفرتوں کے شہر میں نغمہ محبت خوب ہے
اس جیالے کی صدا اب کہکشاں تک جائے گی

اس سے پہلے کہ طلب فریاد بن جائے سنیں
ورنہ بے بس کی فغاں تو لامکاں تک جائے گی

گل کی شادابی تو گلشن میں بہاراں تک ہی ہے
شجرِ جاں کی تازگی دورِ خزاں تک جائے گی

جگ سے الفت کی کہانی یوں چھپائے رکھنا تم
داستانِ ظلم , عبرت کے نشاں تک جائے گی

○

تسنیم بخاری
(لاہور)

حرف بن کر کتاب میں آ جاؤں — کاش تیرے نصاب میں آ جاؤں
رائیگاں سب سوال ہو جائیں — میں جو تیرے جواب میں آ جاؤں
تو جو چاہیے تو تیرے گلشن میں — بن کے خوشبو گلاب میں آ جاؤں
اس سے بہتر نہیں کوئی رستہ — میں ترے انتخاب میں آ جاؤں
شاعری کی کتاب لکھتے ہوئے — میں ترے انتساب میں آ جاؤں
تُو تو پیتا ہے بھول جانے کو — یاد تیری شراب میں آ جاؤں
دور مجھ کو بلاتا ہے تسنیم — گویا پھر سے عذاب میں آ جاؤں

○

انجم جاوید
(کراچی)

وسعت آسماں نہیں معلوم — کھو گیا دل کہاں نہیں معلوم
کیسے کھولوں جہاں کی گتھی کو — مجھ کو رمز جہاں نہیں معلوم
کیسے نکلوں حصار الفت سے — راستہ ہے کہاں نہیں معلوم
مسکراہٹ تو ہے لبوں پہ مگر — ہے ہنسی یا فغاں نہیں معلوم
رکھ دیئے ہونٹ اس نے ہونٹوں پر — پھر ہوا کیا میاں نہیں معلوم
ایسا لگتا ہے تم مرے ہو مگر — ہے یقیں یا گماں نہیں معلوم
اک اداسی سی دل پہ طاری ہے — جائے گی کب خزاں نہیں معلوم
ہوں میں انجم حساب میں کمزور — مجھ کو سود و زیاں نہیں معلوم

○

رئیس صدیقی
(نئی دہلی)

فلسفہ یہ عشق کا سُنتے ہیں اچھا کچھ نہیں — ہر قدم دشواریاں ہیں اور دیکھا کچھ نہیں
میں نے چاہا داستانِ غم غزل میں ہو رقم — آبروئے عشق رکھنی تھی ،تو لکھا کچھ نہیں
ہر قدم ،اس کی محبت میں رہے گا گامزن — زندگی کس موڑ پہ جائے گی، سوچا کچھ نہیں
ہم محبت کے سپاہی تھے، فقط اس واسطے — نفرتوں کے درمیاں بھی ،ہم نے دیکھا کچھ نہیں
یہ حقیقت ہے، حقیقت پر کروں کیا تبصرہ — 'موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں'
یہ زمیں اقبال کی اور شعر کہنا ہے رئیس — اِک بڑے فنکار کے آگے، یہ چھوٹا کچھ نہیں

○

فَطین اشرف صِدّیقی
(علی گڑھ)

کس کو معلوم تھا اقدام یہ کر جائے گا
بے گناہی کے وہ احساس سے مَر جائے گا

زندگی ظلمِ مُسلسل میں گزاری جس نے
کیا ترے طوق وسَلاسِل سے وہ ڈر جائے گا

ٹھوکروں میں جو زمانے کی نظر آتا ہے
ضَربَتِ وقت سے اِک روز اُبھر جائے گا

دے سکا جس کو نہ انجام کوئی فرزانہ
کارِ مشکل کوئی دیوانہ وہ کر جائے گا

ہے تِری یاد کا پہرہ مِرے قلب و جاں پر
پھر کوئی کیسے مِرے دل میں اُتر جائے گا

چاند کی طرح دَمکتا ہوا چہرہ اس کا
چاندنی رات میں کچھ اور نکھر جائے گا

جو بھی کہنا ہے سمجھ بوجھ کے کہیے اشرف
دوٗر تک آپ کی باتوں کا اَثر جائے گا

محبوب اصغر
(حیدرآباد، دکن)

نہ چراغ جل رہے ہیں، نہ دہک رہا شرارا
میرا عہد بے اماں ہے، صفِ غم کا استعارہ

تیرے ساتھ جو بھی گزرے، کئی دلفریب لمحے
انہیں یاد کررہا ہوں، بس انہیں پہ ہے گزارا

یہ حماقتوں کے بادل، جو برس رہے ہیں مجھ پر
کہ شعارِ دوستی نے، میرے کرلیا گوارا

یہ خموش شاہراہیں، یہ مہیب شہر ویراں
کہ خدا کرے یہ منظر، ہو نوید کا اشارہ

ہے فضائے جبر ہرسو، ہے ستم کی بالادستی
میری بے بسی کو یارب، تیرے حفظ کا سہارا

ہے زمیں کا کون خالق، ہوا اس پہ کون قابض
ہمیں سب ہے چھوڑ جانا، یہاں کس کا ہے اجارہ

یہ تغیراتِ ناحق، یہ ہوائے زہر آگیں
بہ شرارِ قہرِ یزداں، ہوا پُرشرر نظارہ

ملی ظلمتوں سے اکثر، مجھے آگہی کی دولت
اسی آگہی نے اصغر، میری زیست کو سنوارا

ذکی طارق بارہ بنکوی
(بھارت)

اسی میں ہی اب صرف ڈھلتے بنے
تری بزم سے کب نکلتے بنے

ترے پاس آکے ہوا ہے یہ کیا
ٹھہرتے بنے اور نہ چلتے بنے

زباں سے ہو کیسے مسخر فلک
کھلیں بازو تب تو اچھلتے بنے

اکیلے ہی سیرِ چمن کیا کروں
ترا ساتھ ہو تو ٹہلتے بنے

اگر تو نہ آ اپنی یادیں ہی بھیج
کسی طور تو دل بہلتے بنے

ہوا ہے بدن سارا یخ بستہ سا
ملے آنچ تب تو پگھلتے بنے

یہ بھر پور حسن و شباب الاماں
ترے سامنے سے نہ ٹلتے بنے

کبھی تو بھی مجھ کو منانے کو آ
کبھی مجھ کو بھی تو مچلتے بنے

بدن کی تپش ہے غضبناک کیا
اسی میں مگر روز جلتے بنے

نوید ظفر

(اسلام آباد)

عکس کو بھی زعم کیا کیا آئینہ ہونے کا تھا
بخت دنیا کی کثافت میں مگر کھونے کا تھا

کچھ تو طشتِ زخم سر پر دھر کے آئی تھی بہار
کچھ مری آنکھوں کو بھی لپکا لہو رونے کا تھا

وقت کی تابش میں سارا ہی ملمع بہہ گیا
وہ کہاں تھا اُس پہ تو پانی فقط سونے کا تھا

یہ معمہ ظرف کا کوئی سمجھ پایا نہیں
دیو کے افسانے میں کردار کیوں بونے کا تھا

رنگ وخوشبو کی طرح جب مل گئے تو مل گئے
میں کہاں کا اور تو دنیا کے کس کونے کا تھا

ہاتھ چھوٹا، ساتھ چھوٹا زندگی کا اور بس
تیرا میرا مسئلہ پھر عمر ہی ڈھونے کا تھا

کام ذمے لے لیا بے مائیگی کے باوجود
شبکدے میں نور کے منظر نئے بونے کا تھا

نارسائی نے تو ہم میں بھر دیا تھا اک جنوں
اپنی آنکھوں سے تمہارے خواب ہی دھونے کا تھا

وقت نے تنکا کے دامانِ تہی الٹا دیا
ایک مدت سے سبھی کو خوف کچھ ہونے کا تھا

کس کا استحصال کھاتے میں لکھا ہے آپ کے
پورا ساغر لے گئے ہیں، حوصلہ پونے کا تھا

کجکلاہوں نے زمیں میں آگ ہی بھر دی ظفر
خاک زادوں کا ارادہ آسماں بونے کا تھا

○

فیض الامین فیض

(کُلٹی، ویسٹ بنگال)

کسی سے پیار کیا اور کسی سے شادی کی
زبان اُس نے نبھائی تھی اپنی دادی کی

وہ اپنی جان کا دشمن بنا ہے جانے کیوں!
فقیہہِ شہر کو حسرت ہے شاہزادی کی

کبھی ہنسایا کسی کو، کسی کے پونچھے اشک
زرا سا نیکی یہی ہم نے انفرادی کی

میں گرتے پڑتے کی راستوں سے گزرا ہوں
ملی ہے تب کہیں منزل خوداعتمادی کی

وہ زیر کر نہیں پایا مجھے کسی صورت
تو ختم دشمنی کرنے کی پھر منادی کی

یہ دل کمینہ بہت ہے مری نہیں سُنتا
مگر میں سنتا ہوں ہر بات اس فسادی کی

قلم تھما کے مرے ہاتھ میں خدا نے فیضؔ
نواز دی ہے طبیعت کسی جہادی کی

○

کامران غنی صبا

(مظفر پور، بہار)

سنے گا کون یہاں میری ایک ذات کا شور
ہے میرے چاروں طرف بس توقعات کا شور

یہ اور بات کہ باہر بہت خموشی ہے
مرے وجود میں پنہاں ہے کائنات کا شور

میں دن کے شور سے محفوظ تو نکل آیا
مگر میں جاؤں کہاں سامنے ہے رات کا شور

صدائے فکر کو خدشہ ہے، ایک ہی خدشہ
اسے دبا کے نہ رکھ دے یہ ''فاعلات'' کا شور

پتہ چلا کہ یہی آخری حقیقت ہے
بس ایک ہچکی میں ضم ہو گیا حیات کا شور

مجھے بچاؤ! کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے صبا
مرے وجود کے ملبے پہ سانحات کا شور

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار
(میاں)

قسط.....۸

آج کا دن میوات کی تاریخ کا ایک یادگار دن ہے۔ سالوں پر محیط، بدامنی، لاقانونیت، چوری، ڈاکے، پکڑ دھکڑ اور غدر کی ہولناکیوں کے بعد بھرت پور اور الور کے قرب وجوار میں واقع گاؤں پھیپڑ، مٹورا، کسوڑی، دھادڑ، ماکڑا، پھلیکی اور بدوکی میں جشن کا سماں ہے۔ کڑھاؤ چڑھ گئے ہیں، پکوان پک رہے ہیں، ایک طرح سے عید اور دیوالی کا سماں ہے۔

میواتی رواج کے مطابق صاحب حیثیت لوگ مہمانوں کی تواضع دیسی گھی کے گوند ملے لڈو اور مٹی کے کسورے میں کیسر والا دودھ ملائی ڈال کر پیش کرتے ہیں۔ دودھ گاڑھا بلکہ اس قدر اونٹا ہونا چاہیے کہ اُس کا رنگ سفید کے بجائے بسکٹی ہو جائے اور ملائی کی موٹائی کا کلیہ یہ ہے کہ دودھ پینے کے بعد مونچھوں پر تاؤ دینے کے باوجود مونچھوں میں سفیدی نظر آنا لازمی ہے۔ اگر کسی وجہ سے دودھ پینے والے کے تاؤ دینے کے باوجود مونچھوں میں سفیدی نظر نہ آئے تو یہ ایک طرح سے اپ شگن مانا جاتا ہے جسے دودھ پلانے والے کی نیت کے کھوٹ سے تعبیر دی جاتی ہے۔

مدینے والے شاہ صاحب کی آمد کا شور اور تیاریاں ہفتوں بلکہ مہینوں سے جاری ساری ہیں۔ خدا خدا کر کے آج وہ مبارک دن آن پہنچا جب مدینے والے شاہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ شاہ صاحب کی آمد کے بابرکت موقع پر محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مشاعرے کے بعد مہمانوں کی ضیافت میں مدعوین بلخصوص مدینے والے شاہ صاحب کی خواہش پر شاہ صاحب کے میزبانوں زوار شاہ، جبار شاہ اور دلدار شاہ نے اپنی نگرانی میں آلو باجرے کی روٹی، بیسن مسالہ روٹی، ہرا چھولیا کی کڑھائی، کڑھی اور دم کے چاول، سنگری کی بھاجی، بھتوے کا رائتہ اور پراٹھا، کچری کی بھاجی، لسّی، چُورما، مال پُوا اور ربڑی کا اہتمام خاص کیا ہے۔

یوں تو اہلِ علاقہ شاہ صاحبان کی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی پر پہلے ہی حیرت زدہ تھے مگر اُن کی دعوت پر مدینے والے شاہ صاحب کی آمد کی اطلاع نے حیرت کے غبّارے میں خوشی کی ہوا بھی بھر دی ہے۔ یقیناً مدینے والے شاہ صاحب سے ملنے کی خوشی اپنی جگہ مگر اُڑتی اُڑتی اس خبر نے کہ مدینے والے شاہ صاحب کی آمد پر اہلِ علاقہ کو قطار در قطار کھڑا کر کے نہ صرف شاہ صاحب کا دیدار کرایا جائے گا بلکہ شاہ صاحب کے دستِ مبارک سے اہلِ علاقہ کو سوغات کے طور پر انعام واکرام کے ساتھ چورما اور مال پُوا بھی تقسیم کیا جائے گا۔

اہلِ علاقہ کو انعام واکرام کی نسبت مال پُوا اور چورما میں زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ صاحب ثروت لوگوں کے دسترخوان پر پائے جانے والے لذیذ اور قیمتی کھانے ہر کس و ناکس کے نصیب میں کہاں ہوتے ہیں۔ مال پُوا گندم کا آٹا، سوجی، گوند، زعفران، کیوڑا، بادام ملا کر دیسی گھی میں تلنے کے بعد چاشنی میں ڈبوئے جاتے ہیں۔ چُورما کا آٹا دیسی گھی میں بھون کر بنا پانی ملائے تمام قسم کے خشک میوہ جات اور مصری ملا کر چاندی کے ورق میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔

ہر عمر، مزاج اور مذاق کے لوگ اپنے اپنے فہم کے مطابق شاہ صاحب کی آمد کا سبب، شاہ صاحب کی شخصیت، رعب داب، تمکنت، تُورا اور اُن کے لباس کی بابت قیاس آرائی کر رہے ہیں۔ ایک سوال گفتگو کا مرکزی حوالہ بن کر ہر کسی کو سوچنے پر مجبور رہا ہے۔ شاہ صاحب کے آنے کا سبب کیا ہے۔ شاہ صاحب نے دہلی، آگرہ، متھرا، فرید آباد اور الور کو چھوڑ کر اُن کے پس ماندہ علاقے میں آنے کا ارادہ کیوں کیا۔۔۔؟ یہ علاقہ تو اس قدر بنجر اور ناہموار ہے کہ مئی جون کے دنوں میں انسان تو انسان چیل بھی انڈہ چھوڑ دیتی ہے۔ جہاں بنیادی انسانی سہولتوں کا اس قدر فقدان ہے کہ لوگ باگ بلکہ گھریلو خواتین بھی میلوں پیدل چل کر پینے کا پانی لانے پر مجبور ہیں۔ بعض علاقے ڈھینگر، بٹول، پتنگہ، ساول اور بجرانگ کے کئی علاقے تو ایسے بھی ہیں جہاں کے لوگ جوہڑ کا گندا پانی پینے پر مجبور ہیں۔ اُسی جوہڑ میں اُن کے ڈھور ڈنگر پانی پیتے اور اُسی جوہڑ سے صبح سویرے جنگل پانی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ بہت سے کم عمر چرواہے اور مسافر بھی جوہڑ میں نہانے کے ساتھ، آب دست کا کام بھی انجام دینے سے نہیں چوکتے۔

اہلِ علاقہ کی چہل پہل، کانا پھوسی اور اشتیاق اپنی جگہ ماحول کو میلے میں تبدیل کرنے کی سکت رکھتا ہے مگر جیسے ہی دھادڑ اور ماکڑا کی جانب بانسری اور سارنگی کی دھنوں میں راگ جے جے ونتی کی مدھرتانوں میں رس گھولنے لگی اہلِ علاقہ دیوانہ وار اُس اُور بھاگنے لگے۔ نیلے، پیلے، لال اور ہرے کُرتوں، سفید دھوتی یا تہبند، بناتی چپل اور ہاتھ میں کڑا پہنے ان گنت نوجوان، رتوائی ناچ پر دیوانہ وار رقص کر رہے ہیں۔

سورج بادلوں کی اُوٹ میں چھپنے کی تیاری کرنے لگا ہے۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ ملگجی رنگت اختیار کرنے لگی ہے۔ گرمی کا احساس، فرحت بخش ہواؤں میں تبدیل ہو کر رات اور دن کے ملاپ کا احساس دلا رہی ہے۔ بچھڑے ہوؤں کو، ملاپ کی لذت سے کیف آگیں احساس رگ و پے میں اترتا محسوس ہو رہا ہے۔ طرح طرح کی پتّیوں اور گوٹا گناری سے سجا رتھ، آہستہ آہستہ منزلِ مقصود ''کسوڑی'' کی جانب گامزن ہے۔ درجن بھر جیالوں اور متوالوں کے درمیان رتھ پر سوار مدینے والے شاہ صاحب، سر پر سرخ پگڑی، ہاتھ میں سفید کڑا، آنکھوں پر جڑاؤ فریم کی کالی دبیز عینک اور چہرے پر گھنی سفید ریش مبارک، شاہ صاحب کی شخصیت دیکھنے والوں کی مرعوبیت کے تمام لوازم سے لیس ہے۔

کسوڑی گاؤں کی سرحد جو اکثر گاؤں کے منچلوں اور چنداز کارِ رفتہ

بزرگوں کی چہل پہل کے باعث نیند سے چور بوجھل آنکھوں والی حسینہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی کیفیت بازار میں بیٹھی شوخ وشنگ، چار آنکھوں اور چار کانوں والی حسینہ کی مانند آمدہ بہ گفتگو ہوگئی۔

جُوں جُوں مدینے والے شاہ صاحب کا جلوس کسوڑی کی سرحد کے قریب ہورہا تھا، وؤں وؤں علاقے کے رؤسا، زمیندار، جاگیردار، وڈیرے اور ساہوکار فصلی بٹیروں کی مانند جمع ہو رہے تھے۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر جیمز اینڈ ریو، دومنہ زور گھوڑوں والی بگھی میں تشریف لائے تو بگھی بان کے ساتھ والی گدّی پر بیٹھا اردلی چیتے کی مانند بگھی سے اُتر کر بگھی کے پچھلے حصے کا دروازہ کھول کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر منہ میں سگار، بغل میں چھڑی اور سر پر فیلٹ ہیٹ لگائے، دائیں بائیں نظر دوڑاتے ہوئے خراماں، خراماں بگھی کے پائیدان سے نیچے اُترنے لگے۔

ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر کی آمد سے قبل علاقے کے کوتوال تیج بہادر میؤ نے چاک وچوبند دستے کے ساتھ کویک مارچ کرتے ہوئے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ لبوں پر فخریہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں کامیابی کے خمار کے ساتھ ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر نے ہاتھ کے اشارے سے گارڈ آف آنر کی سلامی لینے کے بعد کوتوال صاحب کو مخاطب کیا:

Everything is ok...?

''یس سر۔۔۔! ہر سَو قدم کے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں مستعد ''گولی'' ایستادہ ہیں۔۔۔ انسان تو انسان۔۔۔ پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا۔۔۔''

''That's Good'' کہتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر صاحب لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے استقبالی قطار کی جانب بڑھنے لگے۔

استقبالی قطار میں کھڑے تمام معزز مہمانانِ گرامی جھک جھک کر ڈپٹی کلکٹر صاحب کے آگے کورنش بجاتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر صاحب کو سب سے نمایاں مقام پر پہنچا کر اُن سے پیچھے قطار بنا کر کھڑے ہوگئے۔ امرا اور رؤسا کی قطار کے پیچھے اُن کے ملازم ہاتھوں میں ہار، پھول اور گلدستے لیے کھڑے تھے جو مدینے والے شاہ صاحب کی آمد پر اُن لوگوں نے اپنے اپنے مالکان کو پیش کرنے تھے۔

جو لوگ کسوڑی پہنچنے سے قبل ڈھولک، چمٹا بانسری اور سارنگی کی دھنوں پر دیوانہ وار رقص کر رہے تھے اُن میں چند نمایاں لوگ صف بند ہو کر بلند آواز میں مہاکوی سعد اللہ خان کا پنڈون کا کڑ (میواتی) مہا بھارت سے دعائیہ کلام جوش، جذبے اور والہانہ پن کے ساتھ پڑھنا شروع ہوگئے۔

وہی سرسوتی دے وہی گھٹ ہر دے کھولے
وہی بتاوے گیان وہی من بھیتر بولے
تولا وہی اُتل پاپ اور پُن کو تولے
نرک بھی اُوئی دے سورگ بھی اوئی کھولے
سچے ہر دے دھیان سو سدا جَپو بھگوان
سعد اللہ پے دیا ہوئی وائی نے دیئو گیان

دعائیہ کلام کے ختم ہوتے ہی استقبالی کلام شروع کر دیا گیا:

ست سُو سمپت ہوئے ست سو بپا پت کٹے
ست سُو سمپت ہوئے سوت سو سمے پلٹے
ست سو، سمپت ہوئے کرے نِر دھن کو راجا
ست سو، سمپت ہوئے سَراں جب مَن کے کاجا
ست راکھونا پنڈوا ست سو سمپت لیں
سعد اللہ وے ہی سمے پھیر گسیاں دیں

ایک روایت کے مطابق مہاکوی سعد اللہ خان ۱۷۶۱ بکرمی میں آکڑہ ضلع میوات بہمناوت گوت کے ہاں پیدا ہوئے۔ وفات کی بابت مختلف روایات درج ہیں (۱۸۶۸۔۱۸۴۹) اور ۱۸۵۳ وغیرہ۔ آکڑہ ضلع میوات کی گوت برادری خود کو مہا بھارت کے دور کی برادری بتلاتے ہیں جنہوں نے اورنگ زیب عالمگیر کے ابتدائی زمانۂ اقتدار میں اسلام قبول کیا تھا چونکہ اُن کی سرشت میں مہا بھارت رچی بسی تھی اور بطور مسلمان مہا بھارت اُن کے عقیدے سے متصادم تھی لہٰذا مہاکوی سعد اللہ خان نے اردو، ہندی اور میواتی کے میلان سے میواتی مہا بھارت کتھا رچی:

بیتے چار ہزار پے چھ سو اور چھتیس
بھرت کھنڈ جا دن رچوری تن سُو پُرسیس

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آکڑہ گاؤں میں سانولا میو نے (یگیہ) رچی کے موقع پر کنواں کھُدوایا۔ کھدائی کے دوران تابنے کے پتھروں پر مہا بھارت لکھی ہوئی ملی جس کے سبب سعد اللہ خان کو اپنے ماضی سے لگاؤ پیدا ہوا:

جگ رچی سانولا میو کے آئی سب سنسار
واسمت سعدا اللہ کتھے پنڈون کے اُپکار

جیسے جیسے مدینے والے شاہ صاحب کی بگھی قریب آرہی تھی ویسے ویسے مہمانی قطار میں کھڑے رؤسا، زمیندار، جاگیردار اور نوابوں کے چہرے کی رنگت مارے خوشی کے سرخ ہو رہی تھی۔ ہر کسی کی کوشش اور خواہش مدینے والے شاہ صاحب کے گلے میں سب سے پہلے ہار ڈال کر بازی مارنے کی تھی مگر ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر جیمز اینڈ ریو کی موجودگی میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانا، شیر کو للکارنے کے مترادف تھا:

''ویلکم شا ساب۔۔۔'' کہتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر جیمز اینڈ ریو نے شاہ صاحب کے گلے میں ہار ڈال کر پاس کھڑے مستعد اردلی کو اشارہ کیا تو اردلی نے قریب دوزانو ہو کر شاہ صاحب کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا۔

شاہ صاحب کے گلے میں ہار ڈالنے کے بعد ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر اور اُن کا اردلی اس طرح غائب ہوگئے جس طرح چراغ کا جن۔ انگریز ڈپٹی کلکٹر کے جاتے ہی نوابوں، زمینداروں اور جاگیرداروں میں پہلے میں، پہلے میں کی وہ دھینگا مشتی ہوئی کہ کئی کمیوں کو بھی ہنسی ضبط کرنا دشوار ہوگیا۔

صاحبِ ثروت لوگوں سے استقبالی کلمات اور ہار پھول لینے کے بعد جونہی مدینے والے شاہ صاحب نے مہمانی پنڈال کی جانب قدم بڑھایا تو زوار شاہ نے مدینے والے شاہ صاحب کے کان کے قریب منہ کر کے کوئی بات کی جس کے جواب میں مدینے والے شاہ صاحب نے سر کی جنبش میں ہاں کہہ کر بڑھتے قدم روک لئے۔ جونہی ملازم گوند کے لڈو اور چُورما سے بھرا ٹوکرا سر پہ اُٹھائے وارد ہوا تو پنڈال سے ذرا فاصلے پر کھڑے غریب غُربا میں ہل چل مچ گئی۔ بزرگ تو دونوں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے دوزانو ہو کر مدینے والے شاہ صاحب سے معانقے کی خواہش میں آگے بڑھے مگر شاہ صاحب نے لڈو اور چُورما کے ٹوکرے کو ہاتھ لگا کر تمام لوگوں کے سلام کا جواب دیا اور ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر کی طرح شاہ صاحب بھی مہمانی پنڈال میں گم ہو گئے۔ اس کے بعد گوند کے لڈو اور چورما کے لیے جو دھکم پیل مچی اُس کی بات اس کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے:

لڑتے لڑتے ہو گئی گم ایک کی چونچ ایک کی دُم

شام نے سپر ڈال کر رات کی بانہوں میں پناہ لے لی تھی۔ غریب غربا کی بات ہی کیا، بڑے بڑے رئیس، نواب، جاگیردار، سیٹھ ساہوکار بھی کسوڑی اور اُس کے گردونواح کو بقعۂ نور دیکھ کر انگشتِ بدنداں تھے۔ زیتون کے تیل، مچھلی کے تیل، دیسی گھی کے دیئے، بڑے بوڑھوں کو یاد ہیں۔ سرسوں کے تیل کے دیئے اب بھی گھروں میں روشنی فراہم کر رہے ہیں مگر کسوڑی گاؤں میں پہلی بار قدِ آدم دیئے جنہیں صاحب علم کول لیمپ سے موسوم کر رہے تھے پہلی بار میوات کے ایک دور دراز گاؤں میں روشن کیے گئے تھے۔ مدینے والے شاہ صاحب کی نسبت اشتیاق برحق مگر اہلِ علاقہ، کیا غریب، کیا امیر، کیا بچہ، کیا جوان اور کیا بزرگ ہر کوئی بحث وتمحیث میں مصروف تھا۔ کوئی اس کا نام جاننے کا شائق، کوئی اس کے خالق اور اُس کی جدّت طرازی کا معترف اور کوئی اس کی مالیت، طریقہ استعمال اور دستیابی کی بابت اشتیاق کا اظہار کر رہا تھا۔

یہ کول لیمپ ۱۸۱۵ میں برطانیہ میں پہلی بار استعمال ہوا۔ اس کے بعد بمبئی میں مقیم جہازراں کمپنی کے مالک اُردشیر کاؤس جی نے ۱۸۳۳ میں کول گیس لیمپ کو اپنے گھر میں نصب کرایا۔ کسوڑی تک آتے آتے ہندوستان بھر میں سو کے قریب کول گیس لیمپ آ چکے تھے۔

پہلی بات تو یہ کہ مہاکوی سعد اللہ خان کے (پنڈون کا کڑا) یعنی میواتی مہابھارت سے پہلے یہاں کے لوگ بھگوت گیتا اور رامائن کے علاوہ کسی طرح کے منظوم کلام سے آشنا نہ تھے۔ جب اہلِ علاقہ نے مشاعرے کی بابت سنا تو ہر کوئی دوسرے سے پوچھتا:

یہ مشاعرہ کیا ہوتا ہے۔۔۔؟

''رب جانے، میں بھی پہلی بار مشاعرے کا نام سُن رہا ہوں۔۔۔!''

''اللہ کے بندوں ایک سے زائد لوگ، مہاکوی سعد اللہ خان کا (پنڈون کا کڑا) الگ الگ پڑھیں تو اُسے مشاعرہ کہتے ہیں۔۔۔!'' (تیسرے شخص نے پہلے دو اشخاص کی تشفی کرنے کی کوشش کی)

''مشاعرے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔۔۔؟''

''آندھن کے سامیئے روڑو، اپنا دیدا کھوڑو'' (تیسرا آدمی جو پہلے دو کی نسبت ان پڑھ تھا بات ختم کرتے ہوئے میواتی کہاوت بول کر آگے بڑھ گیا جس کا مطلب ہے ''جاہل کے سامنے تقریر کرنا اچھی بات بتانا وقت کا ضیاع ہے)

منتظمین کی جانب سے مشاعرہ کا وقت ۹ بجے رات یعنی بعد از عشائیہ مقرر کیا گیا تھا۔ مہمانِ خصوصی ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر، سرکاری مصروفیات کے باعث رات گئے رُکنے سے قاصر تھے۔ ایک سب کلکٹر صاحب نے کھانے میں شرکت نہ کرنے کا یہ بھی پیش کیا۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر اور اُن کی فیملی ڈنر ایک ساتھ کرنے کے عادی ہیں۔ دوسرا عذر یہ کہ کلکٹر صاحب مقامی کھانے بھی نہیں کھا سکتے۔ بظاہر کلکٹر صاحب ہشاش بشاش اور صحت مند دکھائی دیتے تھے مگر صحت کی خرابی کا عذر بھی ٹھوس جواز کے طور پر پیش کیا گیا۔

ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر کی تجویز پر مشاعرہ رات ۹ کے بجائے ۸ بجے شروع کرنے کا پروگرام بنا۔ ایک عذر اس تجویز میں آڑے یہ آ رہا تھا کہ کئی سینئر شعراء کرام مثلاً سخی لکھنوی، منشی بال مکند سکندر آبادی اور مولانا الطاف حسین حالی تشریف نہ لائے تھے۔ اس مشکل کا حل سید شجاع الدین المعروف انور دہلوی اور مشاعرے کے ناظم نے یہ پیش کیا چونکہ حضرت سخی لکھنوی اور جناب منشی بال مکند اور مولانا حالی صاحب بلند مرتبت اور قادر الکلام شعراء ہیں لہٰذا اُن کے پڑھنے کا وقت آنے سے پہلے وہ لوگ ضرور تشریف لے آئیں گے۔

مشاعرے کے اعلان کے ساتھ ہی پنڈال کے گردونواح میں جو لوگ خوش گپیوں اور مہمان خانے میں مصروفِ گفتگو تھے سب اپنی اپنی جگہ سنبھالنے کو پنڈال کی جانب لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف پنڈال ہری، نیلی، پیلی اور لال میواتی پگڑیوں سے بھر گیا بلکہ مہمانانِ خصوصی اور مشاعرہ کے لیے بچھائے گئے تخت جن پر غالیچے، قالین، گاؤ تکیے، اُگال دان، پیگ دان، خاص دان اور شمع محفل بھی ایستادہ ہو چکی تھی۔

جیسے ہی سید شجاع الدین المعروف انور دہلوی نے نظامت کی غرض سے شمع محفل کو اپنی جانب سرکایا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے لفظ حضرات گرامی ادا کیا تو پنڈال کے باہر آوزوں کی بھنبھناہٹ اور چہ مہ گوئیاں سنائی دینے لگی۔ منتظم مشاعرہ ہبڑ دبڑ کی صورتِ حال جاننے کے لیے باہر کی جانب لپکے تو مارے خوشی کے اُن کی باچھیں کھِل گئیں۔ مولانا الطاف حسین حالی تشریف لا چکے تھے اور پالکی سے اُترا ہی چاہتے تھے کہ زوار شاہ نے آگے بڑھ کر مولانا کی قدم بوسی کرتے ہوئے بروقت تشریف لانے پر دل کی گہرائیوں سے حالی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ منشی بال مکند اور سخی لکھنوی صاحب یکّے میں بیٹھے ہوئے ہاتھ ہلاتے اپنی آمد کا اعلان کر رہے ہیں۔ زوار شاہ مولانا الطاف حسین حالی کو مشاعرہ گاہ کی جانب لے کر بڑھنے لگے تو جبار شاہ نمودار ہو

گئے۔زوارشاہ نے بھائی کی توجہ منشی بال مُکند اور سخی لکھنوی کے یکّے کی جانب دلائی تو آگے بڑھ کر جبارشاہ نے نہ صرف دونوں مہمانانِ گرامی کی قدم بوسی کی بلکہ بڑے بھائی زوارشاہ کی پیروی میں یکّے والے کو ادائیگی کرنے کے بعد فاضل شعراء کو مشاعرہ گاہ کی جانب لے کر چل پڑے۔

مشاعرے کے ناظم سید شجاع الدین کے علم میں ڈپٹی کلکٹر صاحب کی جلد روانگی لائی جا چکی تھی لہٰذا کسی تاخیر کے بغیر انہوں نے مختصر کلمات میں مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے مشاعرے کے مہمانِ خاص ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر جمیز اینڈریو کو دعوت کلام کے لیے پکارا تو تمام سامعین چابی کے گڈوں کی مانند کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر نے ایک سے زائد بار دائیں بائیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے شکریہ اور تھینکیو کے الفاظ ادا کیے۔

''ویل اَم پوئٹری کرنا نئیں مانگٹا۔۔۔ بٹ۔۔۔ پوئٹری کو لائیک کرٹا۔۔۔ام اِدر آ کر کوش ہوا۔۔۔شاساب، برا آدمی ہے۔۔۔آپ لوگ کوش کسمت اے۔۔۔ کہ اٹنا بَرا آدمی۔۔۔کو دچل کر۔۔۔ اِدر آنے کو مانگٹا۔۔۔ ٹائم شارٹ نہ اوٹا۔۔۔ٹو۔۔۔ام۔۔۔آپ سب کا۔۔۔ پوئٹری انجوائے کرٹا (شعرائے کرام کی جانب رُخ کرتے ہوئے) او۔کے۔۔۔ ویلڈن۔۔۔ انجوائے یور سیلف۔۔۔اینڈ۔۔۔گڈ بائے۔۔۔

ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر کو تمام شعراء مدینے والے شاہ صاحب کے علاوہ علاقے کے رؤسا، نواب، زمیندار، جاگیردار، سیٹھ، ساہوکار اور شاہ برادران بگھی تک چھوڑنے آئے۔اور جب تک ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر بلکہ کوتوال صاحب کی ٹم ٹم نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی تب تک علاقے کے تمام شرفا مؤدب انداز میں ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔

مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے ناظم مشاعرہ سید شجاع الدین المعروف انور دہلوی نے صدر مشاعرہ مولانا الطاف حسین حالی کی اجازت سے شمع محفل اپنے رُوبرو کرتے ہوئے خیر مقدمی کلمات کے بعد اپنا کلام پیش کیا:

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پوچھیے اپنی جبیں سے

''واہ، واہ، سبحان اللہ، کیا کہنے'' سامعین نے مصرعہ اُٹھایا۔

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پوچھیے اپنی جبیں سے
چلی آتی ہے ہونٹوں پر شکایت
ندامت ٹپکی پڑتی ہے جبیں سے

تمام شعراء اور سامعین نے داد کے ڈونگرے برساتے ہوئے دوسرا مصرعہ بھی اُٹھایا:

اگر سچ ہے حسینوں میں تلون
تو ہے امید وصل ان کی نہیں سے

کہاں کی دل لگی کیسی محبت
مجھے اک لاگ ہے جانِ حزیں سے
اِدھر لاؤ ذرا دستِ حنائی
پکڑ دیں چور دل کا ہم یہیں سے

''واللہ پھر پڑھیے۔۔۔بار۔۔۔بار۔۔۔پڑھیے'' (دوسری آواز)
''مضبوطی سے پکڑیئے۔۔۔بھاگنے نہ پائے۔۔۔!''

جنوں میں اس غضب کی خاک اڑائی
بنایا آسماں ہم نے زمیں سے
وہاں عاشق کشی ہے عین ایماں
انہیں کیا بحث انور کفر و دیں سے

واہ، واہ سبحان اللہ۔۔۔کیا کہنے۔۔۔واللہ شعر کہتے ہیں۔۔۔یا۔۔۔ کمال کرتے ہیں۔۔۔!

اپنے حصے کی داد و تحسین سمیٹنے کے بعد جناب انور دہلوی نے یو۔پی۔ بنارس سے آئے جناب بھارتندو ہریش چندر سا کو دعوت کلام کے لیے پکارا:

اٹھا کے ناز سے دامن بھلا کدھر کو چلے

''سامعین نے مصرعہ اٹھایا۔۔۔!''

ادھر تو دیکھیے بہر خدا کدھر کو چلے
مری نگاہوں میں دونوں جہاں ہوئے تاریک
یہ آپ کھول کے زلف دو تا کدھر کو چلے

''ہائے ہائے ہائے۔۔۔زلف کھولی اُنہوں نے کلیجہ آپ نے چیر کے رکھ دیا۔۔۔!'' (انوکھی نرالی داد پر پورا پنڈال کشتِ زعفران بن گیا)

ابھی تو آئے ہو جلدی کہاں ہے جانے کی
اٹھو نہ پہلو سے ٹھہرو ذرا کدھر کو چلے
چڑھی ہیں تیوریاں کچھ ہے مژہ بھی جنبش میں
خدا ہی جانے یہ تیغ ادا کدھر کو چلے
گیا جو میں کہیں بھولے سے ان کے کوچے میں
تو ہنس کے کہنے لگے رسا کدھر کو چلے

جناب ہریش چندر سا اپنے حصے کی داد و تعریف سمیٹنے کے بعد واپس جانے کے لیے مڑے تو سامعین نے تنگ کرنے کی غرض سے ایک اور، ایک اور کی صدائیں لگائیں مگر رسا صاحب اُن پر کان دھرے بغیر دھیمے قدموں سے سر جھکائے اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔رسا صاحب کے بعد شمع محفل سید فرزند احمد المعروف سفیر بلگرامی کے رُوبرو کی گئی:

شگفتہ ہو کے بیٹھے تھے وہ اپنے بے قراروں میں
تڑپ بجلی کی پیدا ہوگئی پھولوں کے ہاروں میں

''ہائے، ہائے، ہائے۔۔۔چہرے پر دوہتڑ مارتے ہوئے جناب ظہیر

دہلوی کی داد کے بعد سامعین مشاعرہ کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔۔۔الطاف حسین حالی بھی سر کی جنبش کے ساتھ مسکرا مسکرا کر داد دینے پر مجبور تھے۔

کیا اندھیرا اپنے رنج نے ان کی کدورت نے
بجھی شمع محبت ہائے دو دل کے غباروں میں
شب فرقت کو زاہد سے سوا مر مر کے کاٹا ہے
کرے مشہور ہم کو بھی خدا شب کے زندہ داروں میں
یہ کس نے کشتۂ تیغ تبسم کر دیا مجھ کو
مبارک باد کا غل ہو رہا ہے سوگواروں میں

سفیر بلگرامی نے مشاعرے کو جس قدر گرما اور برما دیا تھا آنے والے شاعر کے لیے اُسے برقرار رکھنا آسان نہ تھا:

وہ کسی سے تم کو جو ربط تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ کسی پہ تھا کوئی مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سید محمد ظہیر الدین خان المعروف ظہیر دہلوی کے پہلے مصرعہ پر مکرر، مکرر کی اتنی صدائیں بلند ہوئیں کہ اُنہیں پہلا شعر بار بار دہرانا اور ٹھہرانا پڑا:

وہ کسی سے تم کو جو ربط تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ کسی پہ تھا کوئی مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم بھی تم بھی تھے ایک جا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بنانا چہرہ عتاب کا وہ نہ دینا منہ سے جواب کا

اماں! کیا جان لینے کے ارادے سے آئے ہیں۔(ادھیڑ عمر باریش شخص کی داد پر شعراء کے علاوہ سامعین بھی خوب خوب محظوظ ہوئے)

وہ کسی کی منت و التجا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
تمہیں جس کی چاہ پہ ناز تھا جو تمہارا محرم راز تھا
میں وہی ہوں عاشق باوفا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی ساز تھے کبھی ہم بھی وقف نیاز تھے
ہمیں یاد تھا سو جتا دیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بولنا وہ خفا خفا کبھی بیٹھنا وہ جدا جدا
وہ زمانہ ناز و نیاز کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ابھی تھوڑے دن کا ہے تذکرہ کہ رقیب کہتے تھے برملا

''اماں۔۔۔ ! رقیب نہیں۔۔۔ رقیبِ روسیاہ کہیے۔۔۔ رقیب روسیاہ۔۔۔!''(پورا پنڈال داد و تحسین سے گونج اٹھا۔۔۔مگر۔۔۔کسی کو پتہ نہ تھا کہ داد، شاعر کو دی جا رہی ہے یا سامع کو)

مرے آگے تم کو برا بھلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہنس کے منہ کو چھپا لیا کبھی مسکرا کے دکھا دیا
کبھی شوخیاں تھیں کبھی حیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جو بنا ہے عارف با خدا یہ وہی ظہیرؔ ہے بے حیا
وہ جو رند خانہ بدوش تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ظہیر دہلوی صاحب کی غزل:

وہ کسی سے تم کو جو ربط تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ کسی پہ تھا کوئی مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نے ایک طرح سے مشاعرے میں آگ لگا دی تھی۔اسی شور و غل اور ہاؤ ہُو میں ناظم مشاعرہ جناب انور دہلوی نے مشاعرے کے اگلے شاعر جناب مرزا حاتم علی بیگ میرؔ کو دعوت کلام دی:

رنگ صحبت بدلتے جاتے ہیں
ساتھ کے یار چلتے جاتے ہیں

کیا کہنے۔۔۔لفظ صحبت نے شعر کو دو آتشہ کر دیا ہے، پھر پڑھیے۔۔۔

جن کی کرتے ہو تم مسیحائی

''آپ کی منشا کیا ہے جناب۔۔۔؟''(ایک آواز)

وہ مریض اب سنبھلتے جاتے ہیں
دل میں ہونے لگا حضور کا گھر
آپ سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں
زلف الجھتی ہے ان کے بالوں سے
سانپ کا سر کچلتے جاتے ہیں

''کون سے والے سانپ کا۔۔۔؟''(دیگر شعرا اور الطاف حسین حالی کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات)

شائق قتل کوئے قاتل میں
کودتے اور اچھلتے جاتے ہیں
دیکھتے ہیں وہ اپنا جوبن آپ
اب تو کچھ کچھ سنبھلتے جاتے ہیں

ہر چند بزرگ اور سنجیدہ قارئین نے مرزا حاتم علی بیگ کو خوب خوب سراہا مگر جو داد و تحسین جناب ظہیر دہلوی کے حصے میں آئی تھی یہ اُس کا عشرِ عشیر بھی نہ تھی:

جس نے تری بے باک ادا کو نہیں دیکھا
واللہ کہ آنکھوں سے فضا کو نہیں دیکھا
کیوں مجھ کو سنائے نہ بھلا قصۂ جنت
واعظ نے ترے مہر و وفا کو نہیں دیکھا
افسوس کہ سن ہی کے ابھی ہنستے ہو افسوس
تم نے جو اگر آہ و بکا کو نہیں دیکھا

''اماں یہ شعر ہے یا آپ بیتی۔۔۔؟''

گھبرائے ہوئے پھرتی ہے کیوں میری طرح
تاثیر نے کیا میری دعا کو نہیں دیکھا

بیباکیاں دیکھیں ہیں تیری بزم عدو میں
آنکھوں میں تری شرم و حیا کو نہیں دیکھا
کہتے ہیں غلط ہووے گا دشمن کا گزر خاک
کوچے میں ترے باد صبا کو نہیں دیکھا
معلوم نہیں تم کو وفا کہتے ہیں کس کو
ذرا ہم کو بھی دکھلایئے ،ہم بھی تو دیکھیں اربابِ وفا کے نین نقش کس طرح کے ہوتے ہیں۔

تم نے ابھی ارباب وفا کو نہیں دیکھا
کیا خاک ہو امید مجھے اس سے وفا کی
میں نے تو کبھی اس کی جفا کو نہیں دیکھا
نازاں نہ ہوں کیوں خضر بھلا عمر پہ اپنی
حضرت نے ترا زلف رسا کو نہیں دیکھا
پردے سے نکلتے نہیں اور کہتے ہیں مجھ سے
پہچانو گے کیا ہم کو خدا کو نہیں دیکھا
آگے تری آنکھوں کے جھکائے ہوئے آنکھیں
کب آ ہوئے باور بہ خطا کو نہیں دیکھا
کیوں حضرت موسیٰ کی طرح نعش میں نساخ
گر تم نے بتِ ہوش ربا کو نہیں دیکھا

خان بہادر عبدالغفور خان نساخ کے کلام سے یہ بات پوری طرح ظاہر و باہر ہوگئی تھی کہ کلام کے ساتھ یعنی قارئین کی توجہ حاصل کرنا اور قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینا آسان کا نہیں ہے۔ اس کے لیے کئی طرح کے ہُنر اور پینترے آزمانے پڑتے ہیں۔

پہلو میں بیٹھ کر وہ پاتے کیا
دل تو تھا ہی نہیں چراتے کیا

سید مقصود علی المعروف سخی لکھنوی کا مطلع مشاعرے کو تیلی دکھانے کے مترادف تھا۔ ہر طرف سے پھر پڑہیے، پھر پڑہیے کی صدا بلند ہونے لگی:

پہلو میں بیٹھ کر وہ پاتے کیا
دل تو تھا ہی نہیں چراتے کیا

تیسری، چوتھی شاید پانچویں بار مطلع دہرایا گیا تو سامعین میں سے کسی نے آواز لگائی:

اماں۔۔۔!دل نہیں تو نہ سہی، دماغ سے کام لے کر آگے بڑہیے۔۔۔ آگے۔۔۔!

ہجر میں غم بھی ایک نعمت ہے
یہ نہ ہوتا تو آج کھاتے کیا
''جوتا۔۔۔!''

جملہ پھینکنے والا باوجود کوشش کے شناخت نہ ہو سکا البتہ سخی لکھنوی صاحب نے بقیہ غزل یوں پڑھی جیسے مجبوری میں رسم نبھا رہے ہوں۔

جشن تھا عیش و طرب کی انتہا تھی میں نہ تھا
یار کے پہلو میں خالی میری جا تھی میں نہ تھا
اس نے کب برخاست اے دل محفل معراج کی
کس سے پوچھوں رات کم تھی یا سوا تھی میں نہ تھا
میں تڑپ کر مر گیا دیکھا نہ اس نے جھانک کر
اس ستم گر کو عزیز اپنی حیا تھی میں نہ تھا
وعدہ لے لیتا کہ کھلوانہ نہ مجھکو ٹھوکریں
عالم ارواح میں جس جا قضا تھی میں نہ تھا
صرف کرتا کس خوشی سے جا کے اس میں اپنی خاک
کیا کہوں جس دن بنائی کربلا تھی میں نہ تھا
منہ نہ کھل سکتا نہ ہوتے ہم کلام ان سے کلیم
عمر بھر حسرت ہی رہتی بات کیا تھی میں نہ تھا
لے گئی تھی مجھکو حسرت جناب خود رفتگی
جس طرف کو منزل بیم و رجا تھی میں نہ تھا
دل الٹ جاتا مرا یا دم نکل جاتا مرا
شکر ہے جب لن ترانی کی صدا تھی میں نہ تھا
لالہ وگل کو بچا لیتا خزاں سے اے سخی
باغ میں جس وقت نازل یہ بلا تھی میں نہ تھا

جناب سخی لکھنوی کی غزل کے دوران ہونے والی بدتہذیبی کا ابھی تک مشاعرے پر اثر تھا۔ سید جلال الدین حیدر خان المعروف آغا حجو شرف کی غزل بھی عمدہ تھی اور پڑھنے کا طریقہ بھی اُستادانہ مگر مشاعرے کا مزاج دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی ہو۔ آغا حجو شرف صاحب ہر ہر شعر پڑھنے کے بعد اشتیاق سے سامعین کی جانب دیکھتے مگر بات رسمی واہ واہ، سبحان اللہ سے آگے نہ بڑھ رہی تھی:

کعبۂ دل میں رونما ہیں آپ
بخدا بت نہیں خدا ہیں آپ
نہ خفا مجھ سے ہو تو ہے یہ عرض
کہ بھلا مجھ سے کیوں خفا ہیں آپ
مانگتے ہیں خدا سے آپ کو سب
میری دانست میں دعا ہیں آپ
کس مسیحا کے درد الفت میں
میاں بے صبر مبتلا ہیں آپ

منشی بال مکند سکندر آبادی کا شمار اُستاد شعرا میں ہوتا تھا۔ پہلا شعر

پڑھنے کے بعد سامعین کی جانب سے روایتی واہ واہ، سبحان اللہ سن کر منشی صاحب نے دبیز عینک کو درست کرتے ہوئے مشاعرے کے ناظم جناب انور دہلوی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''انور میاں لگتا ہے، آپ اور ہم مشاعرے کے بجائے مغالطے سے وعظ میں آ گئے ہیں۔۔۔!''

''حضرت۔۔۔۔!ایسی بھی بات نہیں۔۔۔میوات کے لوگ تہذیب و تمدن سے خوب آشنا۔۔۔اور مشاعرے کی روایات کے امین و پاسدار ہیں۔۔۔ آپ دلجمعی سے پڑھیے۔۔۔حالی کا خطہ بہت مردم خیز ہے۔۔۔آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔۔۔ان شاءاللہ۔۔۔!''

نہ گیا مر کے بھی نظروں میں سمانا اپنا
گور نے مردم دیدہ مجھے جانا اپنا
ایسے سوئیں گے شب ہجر کے جاگے اک روز
ہو گا محشر میں بھی دشوار جگانا اپنا
مل کے دل اس سے ملا ہم سے نہ پھروائے نصیب
نکلا بیگانہ وہ ہم نے جسے جانا اپنا
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں
ہو تو بتلائیں کہیں ٹھور ٹھکانہ اپنا
تیرا احسان نہ بھولوں گا کبھو شوق جفا
کام تھا تیرا ہی یاد اس کو دلانا اپنا

انور دہلوی صاحب کا قیاس سچ نکلا، اس کے بعد جو مشاعرے نے اُڑان بھری وہ نہ صرف دیکھنے بلکہ یادرکھنے کے لائق ہے۔ منتظمین اس بات پر نہ صرف خوش بلکہ مطمئن تھے کہ حضرت مولانا الطاف حسین حالی کی آمد پر مشاعرہ جوبن پر پہنچ گیا تھا:

''غزل پیش کرتا ہوں۔۔۔!''(ایک جیب سے کاغذ کا پرزہ دوسری سے عینک نکالتے ہوئے)

''مسدس۔۔۔مسدس۔۔۔مسدس۔۔۔!''(سامعین کی جانب سے پُرزوراصرار)

''حضرات۔۔۔! آپ کا ارشاد بجا۔۔۔مشکل یہ درپیش ہے۔۔۔ کہ۔۔۔مسدس سننے۔۔۔سنانے کی چیز نہیں۔۔۔پڑھنے۔۔۔اور۔۔۔غوروفکر کی چیز ہے۔۔۔۔!''

''مسدس۔۔۔مسدس۔۔۔مسدس۔۔۔''(سامعین کا اصرار جاری)

''پہلے غزل سن لیجیے۔۔۔! آج کے مشاعرے کے لیے خاص طور پر کہی ہے۔''

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی راز داں سے ہم
اب شوق سے بگڑ کے ہی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم
جنت میں تو نہیں اگر یہ زخم تیغ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگیٔ جاوداں سے ہم

واہ واہ سبحان اللہ کے شور میں سامعین مشاعرہ کے اصرار پر مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس حالی سے ایک رباعی نذرِ قارئین کی:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

مسدسِ حالی کے مصرعے سن کر پورا مجمع پڑھے گئے مصرعوں کو اس طرح دہرا رہا تھا جیسے مسجد، مدرسہ یا سکول کے بچے لہک لہک کر سبق یاد کرتے ہیں۔ مسدسِ حالی کی نسبت مشاعرے کے شرکاء کا جوش وخروش اور یکتائی دیکھ کر حالی صاحب آبدیدہ ہوگئے۔واسکٹ کی داہنی جیب سے رومال نکالتے ہوئے:

''آپ نے تو مجھے بھی جذباتی کر دیا، اگر اندازہ ہوتا تو میں غزل کہنے کے بجائے مسدس کے چیدہ چیدہ اشعار لکھ کر لاتا:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

شرکائے مشاعرہ کا جوش وخروش انتہاؤں پر تھا۔اس بار حاضرینِ مشاعرہ نے حالی صاحب کے مصرعوں کو جوش وجذبے کے ساتھ دہراتے ہوئے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ایک مرتبہ پھر حالی صاحب نے واسکٹ کی جیب سے رومال نکال کر ڈبڈبائی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے فرمایا:

''آپ حضرات کی والہانہ محبت، جوش اور ولولے نے ماضی کے سہانے دریچے وا کر دیئے ہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا، کس جذبے اور احساس کے زیر اثر مسدسِ حالی ضابطۂ تحریر میں آئی۔۔۔کس کس کا نام لوں۔۔۔اس پسماندہ قوم نے عالمِ درماندگی میں بھی ایک سے ایک۔۔۔بیداردل۔۔۔اور۔۔۔بیدارمغز۔۔۔ کسادبازاری کے عالم میں بھی عطا کیا ہے۔۔۔کس نے میری ہمت بندھائی۔۔۔

''چہارسُو''

کس نے مجھے حوصلہ بخشا اور کس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر۔۔۔ گھور اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھلائی۔۔۔ یہ داستان، بجائے خود تفصیل طلب ہے!

سو جناب۔۔۔! جیسے تیسے مسدس حالی وجود میں تو آ گئی۔۔۔ مگر۔۔۔ اُس کے بعد طرح طرح کے خوف، اندیشے اور وسوسے دل میں گھر کرنے لگے۔۔۔ دل و دماغ میں ایک تلاطم برپا تھا۔۔۔ خدا معلوم اہلِ دانش۔۔۔ میری ادنیٰ کاوش کی نسبت۔۔۔ کس طرح کی رائے قائم کریں۔۔۔ کس طرح کے القابات اور خطاب سے نوازیں۔۔۔!

کئی راتوں کی بے کلی اور ان گنت ایّام کی بے چینی اور بے آرامی کے بعد، روشنی کی کرن پھوٹی۔۔۔ اور۔۔۔ اُسی روشنی کی پتلی سی لکیر نے، نہ صرف ہماری مشکل آسان کر دی بلکہ ہمیں ہماری منزل تک پہنچا دیا۔

کئی روز کی مغز پچی کے بعد جونہی دل و دماغ یکسو ہوئے۔۔۔ ہم نے مسدسِ حالی کا مسودہ اُٹھایا۔۔۔ کاغذ کے مختصر ٹکڑے پر چند الفاظ تحریر کیے اور مسدس کے پہلے صفحہ پر، عبارت کے اُس ٹکڑے کو چسپاں کر دیا۔ ازاں بعد پورے مسودے کو دبیز کاغذ میں لپیٹ کر الِ خانہ سے ایک خالی جذان طلب کیا اور مسدس کے مسودے کو جس دبیز کاغذ میں مقید کیا تھا اُس سمیت جزدان میں مقید کر کے اُس کا بُھند نا کس کر باندھا اور ملازم خاص کو مسدس کی منزلِ مقصود کی بابت تمام تفصیل طلب اُمور سمجھا کر رختِ سفر باندھنے کی ہدایت کر دی۔

بس جناب۔۔۔! ملازم کو روانہ کرنے کے بعد۔۔۔ دن تو جُوں، توُں گزر گیا۔۔۔ البتہ۔۔۔ رات کسی طور گزرنے کا نام نہ لیتی تھی۔۔۔ سلسلۂ مذکور۔۔۔ ایک دو نہیں۔۔۔ اضطراب کے کئی دن اور کئی راتوں پر مشتمل رہا۔۔۔ مگر۔۔۔ ہمارے لیے۔۔۔ ہر دن یومِ حساب۔۔۔ اور۔۔۔ ہر رات قیامت کی رات کے مصداق کٹی۔

ایک زمانے سے ہمارا معمول ہے کہ ہم فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد اُس وقت تک تسبیح پڑھا کرتے ہیں جب تک بادلوں کی اُوٹ سے سورج سر اُبھارنا شروع نہ کر دے۔ جیسے ہی سورج کی کرنوں کی تمازت ہماری پشت پر محسوس ہوتی ہے، ہم تسبیح لپیٹ کر جیب میں رکھتے اور اشراق پڑھ کر گھر کی راہ لیتے ہیں جہاں ہماری نصف بہتر، ناشتہ سجائے ہماری منتظر ہوا کرتی ہیں۔

قریب ایک ہفتہ۔۔۔ شاید۔۔۔ چھ دن بعد۔۔۔ ہم تسبیح پڑھنے میں مصروف تھے کہ ملازم نے ہمارا مونڈھا ہلا کر، مہمان کے آنے کی نوید سنائی۔۔۔ اشارے سے ہم نے مہمان کی بابت دریافت کیا تو اُس بدبخت نے ہماری نقل میں ہو بہو اشاروں، اشاروں میں، لاعلمی کا اظہار کیا۔۔۔ نمازِ فرض کے وقت۔۔۔ بادشاہِ وقت بھی ہمارے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہ رکھتا۔۔۔ چونکہ۔۔۔ نمازِ اشراق نفلی عبادت کے زمرے میں آتی ہے۔۔۔ لہٰذا۔۔۔ ملازم کے اشارے پر۔۔۔ ہم۔۔۔ سدائے ہوئے بچے کی مانند اُسکے پیچھے، پیچھے بلا چُوں چراں چل پڑے۔

جُوں جُوں گھر قریب آ رہا تھا، احباب کے نام اور خاکے ذہن کے پردے پر نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔۔۔ جھٹپٹے میں ایک درمیانہ قد۔۔۔ قوی جثہ۔۔۔ گھنی داڑھی۔۔۔ اور۔۔۔ سر پر دوپلّی ٹوپی میں ملبوس ہیولا نمایاں ہونا شروع ہوا۔۔۔ قبل اس کے۔۔۔ ہم۔۔۔ یادداشت کو کام لاتے۔۔۔ قوی الجثہ مہمان۔۔۔ اس گرمجوشی سے بغل گیر ہوا کہ ہمیں بغلیں جھانکنے کی مہلت تک نہ ملی۔۔۔ پیشتر اس کے۔۔۔ ہم اس اچانک حملے سے خود کو بچانے کی کوئی تدبیر کرتے۔۔۔ موصوف نے دیوانہ وار ہمارا منہ اس طور چومنا شروع کر دیا جیسے ہم کوئی نومولود۔۔۔ یا۔۔۔ شیر خوار ہوں۔۔۔!

مدِ مقابل کے جوش و جذبے میں کسی قدر وقفہ آیا تو ہم بھی آخا۔۔۔ خاہ کہتے ہوئے اُسی گرمجوشی سے بغل گیر ہو گئے جس گرم جوشی سے کچھ دیر قبل موصوف ہو رہے تھے۔۔۔!

''حضرت۔۔۔! سب خیریت ہے نا۔۔۔ دشمنوں کے مزاج۔۔۔!''

''اماں۔۔۔ سب ٹھیک ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ ہمارے دشمن بھی۔

واللہ۔۔۔ آپ نے کیا خوب کارنامہ انجام دیا ہے۔۔۔ کارنامہ تو بہت معمولی لفظ ہے۔۔۔ معجزہ کہا جائے تو۔۔۔ حق ادا ہو سکتا ہے۔۔۔ (ایک مرتبہ پھر اُسی گرمجوشی سے بغل گیر ہوتے ہوئے) بخدا۔۔۔ اب مجھے موت کا کوئی غم نہیں۔۔۔ موت کے فرشتے سے کہیے۔۔۔ کہ۔۔۔ سرسید تیری راہ دیکھ رہا ہے۔۔۔ بیتابی سے تیرے آنے کا منتظر ہے۔۔۔! پتہ ہے کیوں۔۔۔؟''

(تیسری بار بغل گیر ہوتے ہوئے)

''یوں اچانک۔۔۔ بیٹھے بٹھائے۔۔۔ موت کے فرشتے کو یاد کرنے۔۔۔ یا۔۔۔ بلانے کی اُفتاد کیوں آن پڑی۔۔۔؟''

''قصہ کچھ یوں ہے۔۔۔ کہ جس تیزی سے عمر زوال پذیر ہے۔۔۔ اُسی تیزی سے۔۔۔ موت کا خوف ستانے لگا ہے۔۔۔!''

''موت سے ڈر لگتا ہے آپ کو۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ موت تو برحق ہے۔۔۔ پھر ڈر کیسا۔۔۔! ڈر اس بات کا ہے کہ اپنے رب کے روبرو کیا منہ لے کر جاؤں گا۔۔۔ اگر میرے پروردگار نے۔۔۔ دریافت کر لیا۔۔۔ کہ میں نے تجھے زندگی، صحت، تندرستی، توانائی اور دنیا کی تمام نعمتوں کے علاوہ بے پناہ مہلت سے سرفراز کیا۔۔۔ تُو بتا۔۔۔ میرے لیے۔۔۔ دنیا سے کیا لے کر آیا ہے۔۔۔؟''

''آپ جیسے نیک، صالح، متقی، پاک باطن اور مصلح تو ہمارے لیے روشنی کا مینار ہیں۔۔۔ اگر آپ کے دل میں آخرت کے حوالے سے اس قدر خوف و ہراس ہے تو ہم جیسے گنہگار کہاں جائیں گے۔۔۔؟''

غیب کا علم اللہ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔۔۔ ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔۔۔ کہ۔۔۔ جو کارنامہ آپ نے سرانجام دیا ہے۔۔۔ یہ اللہ جل شانہٗ کی مدد اور رضا کے بغیر سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔۔۔ جب سے آپ کی

تحریر کردہ مسدس میرے مطالعے میں آئی ہے۔۔۔تب سے میرے دل میں یقین واطمینان کی ایک شمع روشن ہوگئی ہے۔۔۔ میں بے تاب ہوں۔۔۔اُس وقت کے لیے۔۔۔ جب میرا رب مجھ سے سوال کرے۔۔۔ کہ۔۔۔ بتا تو میرے لیے۔۔۔ دنیا سے کیا لایا ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے۔۔۔ کہ۔۔۔اپنے معبود ومسجود کے سوال کے جواب میں۔۔۔ مجھے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔۔۔ میں نہایت فخر وانبساط سے۔۔۔عرض کروں گا۔۔۔یاباری تعالیٰ۔۔۔میں۔۔۔ تیرے لیے۔۔۔مسدس حالی کا تحفہ۔۔۔لے کر آیا ہوں۔۔۔!!!

☆

سبحان اللہ۔۔۔ الحمد للہ۔۔۔نعرۂ تکبیر۔۔۔ اللہ اکبر (حالی صاحب کے بیان کے بعد مجمع لشکر کی کیفیت اختیار کر گیا۔۔۔ایک ایسا لشکر۔۔۔جو بڑے سے بڑے طوفان۔۔۔اور۔۔۔ بڑے سے بڑے خطرات کا منہ موڑنے کی سکت رکھتا تھا۔)

''سنیئے ۔۔۔غور سے سنیئے ۔۔۔مقصود آپ کو جذبات میں بہانا یا کسی وقتی کیفیت سے دوچار کرنا نہیں۔۔۔ یہ ہمت ۔۔۔ یہ حوصلہ۔۔۔اور طوفانوں کو موڑنے کا جذبہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔۔۔چند اشعار۔۔۔اور۔۔۔ آپ کی نذر کرتا ہوں۔۔۔توجہ فرمایئے:''

گھٹا سر پہ ادباء کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس وپیش منڈلا رہی ہے
چپ وراست سے یہ صدا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم
پر اُس قومِ غافل کی غفلت وہی ہے
تنزّل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں پر رعُونت وہی ہے
ہوئی صبح اور خوابِ راحت وہی ہے
نہ افسوس انہیں اپنی ذلّت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

(شرکاء کی جانب سے داد وتحسین کا آبِ رواں)

''میں آپ سب کی جانب سے عزت افزائی پر بہت شاداں اور فرحاں ہوں۔۔۔جذبات سے مغلوب ہونے کے باعث، بہت کچھ کہنے کی خواہش کے باوجود کچھ بھی نہ کہہ پاؤں گا۔۔۔ بجز طوطیِ ہند، فصیح البیان، بلیغ الزماں، اُستادِ سخن، میرِ کارواں مرزا اسداللہ خاں غالب کے بقول:

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا

Important life lessons

I asked a friend who has crossed 70 & is heading towards 80 what sort of changes he is feeling in himself? He sent me the following:

1. After loving my parents, my siblings, my spouse, my children and my friends, I have now started loving myself.
2. I have realized that I am not "Atlas". The world does not rest on my shoulders.
3. I have stopped bargaining with vegetable & fruit vendors. A few pennies more is not going to break me, but it might help the poor fellow save for his daughter's school fees.
4. I leave my waitress a big tip. The extra money might bring a smile to her face. She is toiling much harder for a living than I am.
5. I stopped telling the elderly that they've already told that story many times. The story makes them walk down memory lane & relive their past.
6. I have learned not to correct people even when I know they are wrong. The onus of making everyone perfect is not on me. Peace is more precious than perfection.
7. I give compliments freely & generously. Compliments are a mood enhancer not only for the recipient but also for me. And a small tip for the recipient of a compliment, never, NEVER turn it down, just say "Thank You."
8. I have learned not to bother about a crease or a spot on my shirt. Personality speaks louder than appearances.
9. I walk away from people who don't value me. They might not know my worth, but I do.
10. I remain cool when someone plays dirty to outrun me in the rat race. I am not a rat & neither am I in any race.
11. I am learning not to be embarrassed by my emotions. It's my emotions that make me human.
12. I have learned that it's better to drop the ego than to break a relationship. My ego will keep me aloof, whereas with relationships, I will never be alone.
13. I have learned to live each day as if it's the last. After all, it might be the last.
14. I am doing what makes me happy. I am responsible for my happiness, and I owe it to myself. Happiness is a choice. You can be happy at any time, just choose to be!

''ہجرتوں کا عذاب''

جمیل عثمان
(امریکہ)

1928 کے جون کے مہینے میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر چھپرہ کے ایک متمول تاجر احسان خلیفہ کے جوان بیٹے عبدالرحمٰن کا انتقال ہوگیا۔ تدفین میں ان کے سارے عزیز واقارب، دوست، احباب، اور تاجر برادری کے افراد شریک تھے۔ قبر پر مٹی ڈال دی گئی، کیوڑہ ملے پانی کا چھڑکاؤ کر دیا گیا اور گلاب کی پتیاں بکھیر دی گئیں تب خلیفہ جی قبر کے سرہانے کھڑے ہوئے اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا، ''بھائیو، میں آج، اس وقت، اس جگہ اعلان کر رہا ہوں کہ عبد الرحمٰن کی بیوی یعنی میری بہو زیب النساء دو مہینے کی امید سے ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بچے کی پیدائش کے وقت انگلیاں اٹھائی جائیں کیونکہ سات مہینے کا عرصہ لمبا ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگ بھول بھی سکتے ہیں''۔ لوگ ان کی وضعداری کی مثال دیا کرتے تھے۔

جنوری 1929 کی 29 تاریخ کو احسان خلیفہ دادا بن گئے۔ انہوں نے بچے کا نام محمد عثمان رکھا۔ پوتے کی پیدائش پر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر ایک غم انہیں ستاتا تھا۔ سوچتے تھے، "اگر میری بہو اپنے بیٹے کو لے کر چلی گئی تو کیا ہوگا؟ اگر اس نے دوسری شادی کر لی تو؟ اس کی عمر تو ابھی صرف پندرہ سال ہے۔ اس کے سامنے ساری زندگی پڑی ہے۔ اگر وہ میرے پوتے کو لے کر چلی گئی تو میری قبر پر چراغ جلانے والا اور فاتحہ پڑھنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ میرے پاس تو اس کو روکنے کا کوئی قانونی حق بھی نہیں ہے۔"۔ زیب النساء کو جب ان کے ان خدشات کا علم ہوا تو اس نے فیصلہ سنایا کہ وہ اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی کیوں کہ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ایک مر جائے تو دوسرا کبھی شادی نہیں کرے گا۔ اور اس نے اپنا وعدہ نبھایا اور ایک طویل عمر بیوگی میں کاٹ کر سنہ 2000 میں اپنے حقیقی اور مجازی خدا سے جا ملی۔

احسان خلیفہ نے اپنی بہو کے پورے خاندان کو اپنے گھر میں رکھا۔ اس کے بھائیوں اور بہنوں کی شادیاں اس دھوم دھام سے کیں جیسے کوئی اپنے بچوں کی کرتا ہے۔ اپنے پوتے کو بہت لاڈ پیار سے پالا، اتنا کہ وہ تھوڑے بگڑ بھی گئے۔

میرے والد محمد عثمان، جنہیں ہم ابا جی کہتے تھے، اس بات پر فخر کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ان کے والد بھی ان کی پیدائش سے پہلے انتقال کر گئے تھے اور ان کی پرورش بھی ان کے دادا نے کی۔ ان کے دادا کو بہت شوق تھا کہ ابا جی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ اس زمانے میں بی اے پاس کرنا بہت بڑی بات ہوتی تھی۔ ابا جی نے بی اے آنرز کیا۔ خلیفہ جی چاہتے تھے کہ وہ اور پڑھیں اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ماسٹرز کریں مگر ابا جی نے انکار کر دیا۔ وہ دوستوں کی محفلوں کی جان تھے اور ان محفلوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں جا کر مسلم لیگ کے لئے چندہ اکٹھا کیا۔ کہتے تھے کہ مسلمان عورتوں نے پردوں کے پیچھے سے مٹھی مٹھی کر کے منوں چاول دیے، جنہیں بیچ کر وہ لوگ فنڈ زاکٹھا کرتے تھے۔ اور پھر 1946 کے فسادات برپا ہوگئے۔ گھر جل گیا، پشتوں کی کمائی لٹ گئی۔ فسادات کی اور گھر کی آگ جب سرد ہوگئی تو ابا جی چھپتے چھپاتے اپنے گھر کے اندر گئے اور تجوری کھولی، جس میں اس زمانے میں ایک لاکھ روپے رکھے ہوئے تھے۔ جلے ہوئے نوٹوں میں سے جو باقی بچے تھے ان کو اکٹھا کیا تو تقریباً ڈھائی ہزار روپے ملے۔

اس کے بعد سے کاروبار پھر نہیں جم سکا۔ پاکستان بنا تو ہمارے پردادا اور والد نے ہجرت نہیں کی۔ ہندوستان میں ہی رہے اور کاروبار کو دوبارہ جمانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن خسارے پر خسارہ ہوتا رہا۔ جب سب کچھ ختم ہوگیا تو 1958 میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آ گئے۔ یہاں نوکری کی لیکن ابا جی کا مزاج نوکری کا نہیں تھا۔ اس لئے کہیں ٹک کر کام نہیں کر سکے۔ میرے جد امجد اب کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس عمر میں بھی وہ واپس ہندوستان گئے اور اپنا آبائی مکان بیچ کر کراچی چلے گئے۔۔ سننے میں آیا کہ وہ کہتے تھے کہ کراچی میں گھر خرید کر اپنے بچوں کو بلا لیں گے۔ لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ نوے سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اپنے بیٹے کے مرنے کے بعد وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اللہ انہیں پوتا دے تا کہ ان کی قبر پر دیا جلانے والا کوئی ہو۔ مگر جب دنیا سے گئے ہیں تو وہ پوتا اور دو پڑپوتے ہزاروں میل دور تھے۔ جس رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے تھے اس نے تجہیز وتکفین کر دی۔ لیکن کبھی حساب ہی نہیں دیا کہ کتنی رقم لے کر آئے تھے اور کتنی چھوڑ کر مرے۔

مشرقی پاکستان میں ابا جی نے کھلنا اور چالنا کی بندرگاہوں پر ہینڈلنگ ایجنٹ اور لیبر کنٹریکٹر کا کام شروع کیا جس میں کافی فائدہ ہوا اور ہمارے حالات بہتر ہو گئے۔ ایک بار سائیکلوں کا کنسائنمنٹ آیا شپنگ کے کاغذات میں سائیکلوں کی تعداد 12 تھی مگر آئے تھے 13۔ اب سائیکل کوئی چھوٹی سی چیز بھی نہیں کہ کہا جائے کہ گننے میں غلطی ہو رہی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ ایک زیادہ ہے۔ مزدوروں کے سردار نے ابا جی سے کہا کہ ایک آپ اپنے بیٹوں کے لئے لے جایئے۔ مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ خوددار اتنے کہ بہ قول غالب "الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا۔" جب ملازمت کرتے تھے تو ایک مرتبہ ان کے باس نے غصے میں ان کو حقیر اور کمتر اور خود کو ان سے برتر ظاہر کیا۔ ابا جی نے ایک کاغذ پر یہ اشعار لکھ کر باس کو بھجوا دیے:

تم بھی اک شخصیت کے مالک ہو
میں بھی اپنا مقام رکھتا ہوں

خس وخاشاک وگردراہ نہ میں
گوہر ولعل و مہر و ماہ نہ تم
کاسہ لیسی مرا شعار نہیں
سارے عالم کے بادشاہ نہ تم

اور پھر وہ نوکری چھوڑ دی۔

ابا جی کو اردو سے بہت محبت تھی ۔ اردو ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ ہمارے گھر نقوش، نگار، ادب لطیف، ساقی، بیسویں صدی اور نہ جانے کون کون سے رسالے آتے تھے۔ خود نثر بھی لکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ نوجوانی کے زمانے میں ان کے افسانے بیسویں صدی اور دوسرے ادبی رسالوں میں چھپتے تھے۔ مگر افسوس کہ جو کچھ لکھا اسے کبھی سنبھال کر نہیں رکھا۔ میں نے کچھ کلام اکٹھا کیا، دو قطعے پیش خدمت ہیں:

عہد فغفور سے عصر جمہور تک
ایک فرمان تازہ نکلتا رہا
آدمیت سسکتی رہی رات دن
آدمی کا جنازہ نکلتا رہا

نام ونمود و جاہ و زر و مال کے لئے
کس طرح آدمی ہے پریشاں نہ پوچھیے
پندار ملکیت تو کہیں زعم مرتبت
کتنا بلند آج ہے انساں نہ پوچھیے

ابا جی نماز پابندی سے نہیں پڑھتے تھے لیکن اسلامی علوم کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر بستر پر نیم دراز ہو کر اپنے سامنے ایک تکیہ رکھتے اور اس پر قران رکھ کر مطالعہ کرتے۔ ہمارے ماموں وغیرہ ان کا مذاق اڑاتے ۔ کہتے، "انہیں دیکھو، لیٹ کر قرآن پڑھتے ہیں۔ یہ قرآن کی بے حرمتی نہیں تو اور کیا ہے؟" ابا جی جواب دیتے، "وضو کر کے، ٹوپی پہن کے، آلتی پالتی مار کے، رحل پر قرآن رکھ کر بے سمجھے قرآن پڑھنے سے تو اچھا ہے کہ میں لیٹ کر لیکن سمجھ کر پڑھتا ہوں۔" وہ ہمیشہ قران ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھا کرتے ۔ چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز سے سخت نالاں تھے۔ ہمیشہ قرآن کی اس آیت کی مثال دیتے تھے: "لوگ آپ سے پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے ضرورت سے جو زیادہ ہو۔" ابا جی کا خیال تھا کہ کروڑوں روپے بنکوں میں جمع رکھنے والے صرف ڈھائی فی صد دے کر گلو خلاصی حاصل نہیں کر سکتے – جبکہ لاکھوں لوگ زکات ملنے کے بعد بھی غربت میں رلتے رہتے ہیں۔

جب مشرقی پاکستان میں علحیدگی کی تحریک شروع ہوئی اور غیر بنگالیوں کا قتل عام ہونے لگا تو ابا جی نے لکھا:

زندگی کتنی گراں ہے، کس قدر ارزاں ہے موت
حادثوں میں ہے نہاں آفات میں پنہاں ہے موت
کتنی وحشتناک ہے کتنی بھیانک ہے فضا
شکل میں ابلیس کے چاروں طرف رقصاں ہے موت

پھر وطن کی خاک سے آنے لگی ہے بوئے خوں
پھر چلا انجان سی منزل کی جانب کارواں
موت کے بازار میں پھر بک رہی ہے زندگی
مرقد انسانیت سے اٹھ رہا ہے پھر دھواں

بنگلہ دیش بننے کے بعد ہم دو بھائی اور ایک بہن 1974 میں پاکستان آ گئے تھے – امی، ابا جی، ایک بھائی اور ایک بہن 1977 میں آئے۔ اس دوران خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ 1975 میں میں نے اپنی ایک رنگین تصویر کھنچوا کر امی ابا کو بھیجی۔ ابا جی نے اس کے پیچھے یہ شعر لکھ کر واپسی ڈاک سے بھیج دیا:

نام شہزاد ہے مرا لیکن
لوگ مجھ کو جمیل کہتے ہیں

(یہاں یہ بتا دوں کہ میرا پیدائشی نام ابا جی نے شہزاد جمیل رکھا تھا)۔

1977 میں کراچی آئے تو ابا جی کام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ 1983 میں ملازمت کے سلسلے میں جدہ، سعودی عرب چلا گیا۔ فیملی کو بھی بلا لیا۔ سال میں ایک بار چھٹی پر بیوی بچوں کے ساتھ آتا۔ ایک مرتبہ آیا تو ہندوستان سے ہمارے نانا بھی آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ نانا جی سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں میرے چھوٹے بھائی کے سسر بھی آ گئے۔ تھوڑی دیر میں میں اٹھ کر اندر چلا گیا۔ ابا جی نانا جی کے پاس بیٹھے رہے اور چھوٹا بھائی اپنے سسر کے پاس۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد دونوں چلے گئے تو ابا جی نے کہا: ایک شعر ابھی ابھی ہوا ہے، سن لو – "وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔ بولے:

لگے تھے مدارات میں باپ بیٹے
وہ اپنے سسر کی، وہ اپنے سسر کی

ابا جی موقع محل کے لحاظ سے اکثر برجستہ شعر کہتے ۔ میں ان دنوں کراچی ہی میں تھا۔ ہفتے کا دن تھا۔ دوپہر کو دفتر سے گھر آیا۔ بڑی زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ تینوں چھوٹے بہن بھائی بھی اسکول سے آ گئے تھے اور بھوک بھوک کا شور مچائے ہوئے تھے۔ امی ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں اور دادی اماں نماز پڑھنے کے بعد جائے نماز پر ہی بیٹھی کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ ابا جی وہیں تھے۔ مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے:

بھوک سے خشک ہوا جاتا ہے بچو کا لہو
ساس بیٹھی ہے وظیفے پہ مصلے پہ بہو

باقی صفحہ آخیر پر ملاحظہ کیجیے

برف

سُکھ جیت (لدھیانہ)
۔ گُرمکھی سے ترجمہ ۔
رینو بہل (چندی گڑھ)

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ جیپ کا انجن جھٹکے دینے لگا تھا جیسے اس کی ایک یا دونوں ذل بند ہوگئیں ہوں۔ چڑھائی چڑھتے اور انجن کے جھٹکوں کی وجہ سے جیپ ہلکورے کھاتی رُک رُک کر چل رہی تھی۔ مجبوراً اس نے گاڑی کنارے لگا کر انجن بند کردیا اور اسٹیرنگ پر جھنجھلا کر مُکا مارتے ہوئے بڑبڑایا ''وٹ نونسینس''۔ اس کے برابر بیٹھی ایک سال بڑی بہن برکھا نے اس کی طرف جھنجھلا کر دیکھتے ہوئے کہا ''ہوٹل والوں نے کہا بھی تھا کہ موسم خراب ہے۔۔۔!''

''مگر کپیل کی رسپشن پر پہنچنا بھی تو ضروری تھا۔'' منیش نے صفائی دیتے کہا۔

''آخر ہوا کیا ہے اب؟'' برکھا نے سوالیاں نظروں سے اس کی طرف دیکھتے پوچھا۔

''ٹھنڈ کی وجہ سے ڈیزل جم رہا ہے۔'' جواب دیتے ہوئے منیش نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے آنکھیں سکوڑ کر کچھ سوچتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ ہوا بند ہوگئی تھی۔ فضا میں دُھند پسر گئی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ برف گرنی شروع ہوگئی ہے۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا جیسے جیپ کی لائٹ چیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ منیش نے ڈیش بورڈ سے ٹارچ نکالی پھر ٹول باکس سے پیچ کس اور چابیاں نکال کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ بونٹ کھول کر فلٹر سے ہوا نکالتے نکالتے اس کا بدن سُن ہوگیا جب وہ واپس آ کر گاڑی میں بیٹھا تو اس کے دانت بج رہے تھے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گاڑی کا ہیٹر آن کر کے اس نے انجن گرم کیا مگر اتنی جدوجہد کے بعد اسٹارٹ ہو کر انجن اسی وقت بند ہوگیا جب اس نے گیر ڈال کر گاڑی چلانے کی کوشش کی اس وقت تو اس کی جان ہی نکل گئی جب ذرا سی ہلتی گاڑی بریک لگائے ہوئے بھی پیچھے سرکنی شروع ہوگئی۔ برکھا نے چیختے ہوئے لپک کر اسٹیرنگ تھام لیا جو اس کی جانب گھوم گیا تھا اور گاڑی اس کی طرف پیچھے پہاڑی سے جا ٹکرائی۔ پہاڑوں پر گرتی برف کی وجہ سے ہونے والی پھسلن سے منیش ناواقف تھا۔

''منیش۔۔۔'' پکارتے برکھا نے گاڑی کے اندر کی لائٹ جلائی تو دیکھا اس حادثے نے منیش کا رنگ زرد کردیا ہے۔ پسینے میں شرابور بے جان ہو کر نڈھال بیٹھا ہے۔ یہ ہی کیفیت اس کی خود کی بھی تھی۔ منیش سے بڑی ہونے یا میڈیکل کی طالب علم ہونے کی وجہ سے اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے منیش کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا ''منیش۔۔۔او منیش''۔

منیش نے خود کو سنبھالتے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے، سر کو جھٹکا دیا اور راحت کا لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

''بچ گئے دیدی۔''

''شکر کرو اس طرف پہاڑ ہے اگر کھائی ہوتی۔۔۔'' یہ سوچتے ہی وہ لرز اُٹھی۔

''کپیل کی شادی دیکھنا تو رہ ہی گئی۔'' منیش نے شکست خردہ لہجے میں کہا۔

''انھوں نے بھی تو شادی کے لیے خطرناک جگہ چنی ہے۔'' برکھا نے انہیں ہی مجرم ٹھہرایا۔

''اسی کو تو ایڈونچر کہتے ہیں دیدی''۔ چہکتے ہوئے منیش نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنا چاہا۔

''ایڈونچر؟ مائی فٹ۔'' برکھا نے ناک منہ سکوڑتے ہوئے کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے دیکھا نہیں کیا ہوا؟ میں نے تو سنا ہے کہ برف گرنے کے بعد کئی کئی دن سڑکیں بند ہو جاتیں ہیں۔''

''اوہ۔ ڈونٹ وری دیدی۔ صبح دیکھا جائے گا۔'' منیش اندر سے خوفزدہ ضرور تھا مگر دلیری کا مظاہرہ کر رہا تھا شاید اس لیے بھی کہ وہ مرد ہے۔

''اگر کوئی انیس بیس ہوگئی تو سارا ایڈونچر دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔''

برکھا کے جسم میں ٹھنڈ سے کپکپی پیدا ہوئی تو وہ پچھلی سیٹ سے کمبل اٹھا کر اس کی تہہ کھولنے لگی۔ مگر منیش سوچ رہا تھا کہ کمبل سے سردی تو دور ہو جائے شاید مگر خوف؟ اس نے سیٹی بجاتے بیگ میں سے رَم کی بوتل نکال لی تھی۔

''منیش یہ کیا؟'' برکھا نے ٹوکا تو منیش حیران ہوگیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ منیش ڈیڈی کے ساتھ بیٹھ کر اکثر ایک دو پیگ لے لیا کرتا ہے۔ ویسے بھی وہ بحری فوج کے لیے منتخب ہو چکا ہے۔ برکھا خود بھی تو ایک ماڈرن لڑکی ہے ڈاکٹری کا آخری سال ہے اس کا۔ ان کے دادا دادی ضرور پرانے خیالات کے تھے مگر گھر اُن کا پورا جدید طرز کا تھا۔ برکھا کے ٹوکنے پر منیش نے حیرت سے پوچھا۔

''وٹ دیدی۔۔۔ کیوں؟''

''دیکھ منیش'' برکھا نے سمجھاتے ہوئے کہا ''گھر کی بات اور ہے۔ یہاں ہم بُری طرح پھنس گئے ہیں۔ پی کر اگر تم سو گئے تو میں کیا کروں گی؟''

''پھر تم بھی لگا لو ایک پیگ دیدی'' منیش نے شرارت سے کہا۔

برکھا نے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شرم تو نہیں آتی تمھیں۔''

''شرم تو بہت آتی ہے دیدی''۔ منیش نے منہ لٹکاتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا ''مگر ٹھنڈ کو دیکھ کر بھاگ جاتی ہے۔''

برکھا کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ منیش کی نظر جیپ کے باہر گئی ''دیدی۔۔۔'' خوشی سے چلاّتے ہوئے بولا ''باہر دیکھو دیدی'' باہر دیکھا تو خود بخود برکھا کی زبان سے واہ واہ نکل گیا۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں جو کچھ لمحہ پہلے پانی کی بوندیں نظر آ رہی تھیں اب وہ روئی کے گالے بن کر زمین پر بچھ گئے تھے۔ سفید

نرم برف کے ریشمی گالے روشنی میں چمکتے اور سڑک کو سفید اور سفید کر رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے برف باری کا لُطف لیتے ہوئے وہ سب کچھ بھول گئے تھے۔

یہ ان دونوں کا پہلا موقعہ تھا برف باری دیکھنے کا۔ منیش کے دوست کپل نے اپنی شادی کی دعوت کفری اسی لیے رکھی تھی اور زور دے کر کہا تھا ''منیش آنا ضرور اور برف باری کا مزا بھی لینا۔''

مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ برف باری ان کا استقبال کُفری سے پہلے ہی کرے گی اور وہ بھی اس طرح جسے وہ عمر بھر فراموش نہ کر سکے گیں۔

منیش بوتل کو نہیں بھولا تھا۔ اس نے کمبل اچھے سے لپیٹ لیا تھا۔ برکھا کو سامنے گرتی برف کے بارے میں بتاتے ہوئے اسے باتوں میں الجھاتے، کمبل کے اندر سے ہی بوتل کا ڈھکن کھول دیا تھا۔ برکھا گرتی برف کے نظاروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ منیش نے یہ کہتے ہوئے جیپ کی اندر والی لائٹ بجھادی کہ اس طرح ہم اندر بیٹھے باہر سے نظر نہیں آئیں گے۔ برکھا نے باہر دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا ''نیٹ مت پینا۔''

منیش کی زبان سے حیرت میں صرف۔ ''دیدی'' ہی نکلا جس کا جواب دیتے ہوئے برکھا نے کہا۔

''ہم ڈاکٹر ہوتے ہیں بھائی جان۔''

''پھر ڈاکٹر صاحب یہ بھی بتادیں کہ پانی کدھر ہے؟'' وہ ہنس کر بولا۔

''واہ رے گھونچو''۔ برکھا نے اس کا مزاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

''قدرت نے جو اتنی برف دی ہے وہ دکھائی نہیں دیتی؟''

منیش نے کمبل سے ہاتھ نکال کر اپنے سر پر مارا اور گاڑی کی لائٹ جلادی وہ خالی ڈبہ پکڑ کر گاڑی سے باہر آ گیا۔ جب وہ ڈبے میں برف ڈال کر دوبارہ گاڑی کے اندر آیا تو وہ کانپ رہا تھا مگر تازہ گری برف کے لمس سے اس کا چہرا خوشی سے کِھل اُٹھا۔ برکھا نے ڈبہ پکڑا برف کو چھوا تو وہ بھی سرشار ہوا اُٹھی اور جب ڈبے سے برف نکال کر رم میں انڈیل رہا تھا تو برکھا نے بڑے شوخی بھرے انداز میں کہا ''آن دا روکس''

منیش نے ایک پل ہاتھ روک کر برکھا کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تجربہ کمال ہے آپ کا۔''

''کیا کہا؟'' برکھا نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

منیش نے زبان باہر نکالتے کاندھے اچکاتے ہوئے ''ساری'' کہہ دیا۔ یکلخت منیش کو احساس ہوا کہ گاڑی کی ہیڈ لائیٹز ابھی بھی جلی ہوئی ہیں۔ انھیں جھٹ سے بجھاتے گویا ہوا:

''خیال ہی نہیں رہا۔ اس طرح تو گاڑی صبح بھی اسٹارٹ نہیں ہوگی۔''

''ویسے بھی یہ کونسی اسٹارٹ ہونے والی ہے۔'' برکھا کی آواز میں مایوسی کا رنگ صاف نظر آ رہا تھا۔

''اب اتنی بھی نا اُمیدی کی ضرورت نہیں دیدی۔''

منیش کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ ہلکے ہلکے سرور کی زد میں آ گیا ہے۔ وہ دوبارہ گاڑی سے نکل کر ڈبہ میں برف بھر لایا۔ اب اسے اتنی سردی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے باہر گھومتے اور کوٹ پر گری برف کو جھاڑتے دیکھ برکھا کا دل بھی باہر کھُلی فضا میں نکلنے کو مچل اُٹھا مگر وہ ہمت نہ کر سکی۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ہیڈ لائٹ بند ہوتے ہی اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ سامنے والے شیشے میں انھیں صرف اپنے ہی بڑے بڑے عکس نظر آ رہے تھے۔ برکھا کو ایسے ماحول میں خوف آنے لگا۔ اس نے گھبرا کر منیش کو لائٹ جلانے کو کہا۔ منیش نے دو پل سوچا اور پھر لائٹ جلاتے ہی پوچھا۔

''کیا بات ہے دیدی؟''

''اس نے جواب دینے کے بجائے اُلٹے سوال پوچھ لیا۔

''یہاں جنگلی جانور بھی ہوتے ہوں گے؟''

''شاید'' منیش نے کہا تو وہ سہم کر بولی۔

''اگر کوئی شیر آ گیا تو ہم کیا کریں گے؟''

''ہم نے کیا کرنا ہے جو کچھ بھی کرنا ہے شیر خود ہی کرے گا۔''

یہ کہتے ہوئے منیش ٹہا کا لگا کر ہنسا۔ اس کی ہنسی میں نشہ حاوی تھا۔ برکھا کو اس لطیفے پر بالکل ہنسی نہ آئی۔

''اس طرح تو رات نہیں کٹے گی دیدی۔''

''پھر۔۔۔؟''

''پہلے تم سو جاؤ دیدی میں جاگتا ہوں۔''

''نہیں۔ مجھے نیند نہیں آئے گی۔''

''پھر تو میں سو جاتا ہوں؟''

''نہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''پھر دونوں سو جاتے ہیں'' نشے میں ہونے کے سبب منیش باتوں کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دے رہا تھا۔

''نا بابا۔ تم اسی طرح بیٹھے رہو۔ اندر کی لائٹ بجھا دو۔ ڈر لگ رہا ہے کہ اتنی ٹھنڈ میں سو گئے تو اٹھیں گے کیسے؟''

''واہ۔ یہاں کے لوگ تو پھر مر ہی جائیں۔ نیند آ گئی تو رات جلدی گزر جائے گی دیدی۔''

برکھا کچھ پل خاموش رہی جیسے کچھ حساب لگا رہی ہو پھر گویا ہوئی۔

''میرے پاس ایک آئیڈیا ہے''۔ اس نے جیپ کے پچھلے حصے کی جانب دیکھتے کہا۔ ''ہم سیٹ اتار کر جیپ کے فرش پر رکھ دیتے ہیں۔ ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ جائیں گے۔ دونوں کمبل جوڑ کر اوپر لے لیتے ہیں۔''

''دیکھ لو'' منیش نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''دیکھنا کیا ہے؟ ویسے تو ٹھنڈ سے مر جائیں گے۔''

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ برکھا منیش کی طرف دیکھتے ہی بولی
''ٹھیک ہے نا؟''
''ٹھیک ہی ہے۔ جیسا تم کہو دیدی'' اس نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں نے اٹھ کر پچھلی سیٹ سمیٹ کر رکھی۔ لائٹ بجھا کر جیپ کے فرش پر لیٹتے دونوں نے کمبل جوڑ کر اوپر اوڑھ لئے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ گئے۔
جگہ تنگ تھی اور دونوں سکڑ کر اِک دوسرے سے فاصلہ بنائے ہوئے تھے تا کہ ایک دوسرے کو چھو نہ سکے۔ ''مگر کیوں؟'' برکھا نے دل میں سوچا ''ہم دونوں اک دوسرے کی طرف پشت کر کے کیوں لیٹے ہیں، بچپن میں ہم دونوں ساتھ سوتے تھے اِک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر۔ اور اب؟ اب شاید ہم بڑے ہو گئے ہیں۔''
''کتنی سردی ہے۔'' برکھا نے کپکپی محسوس کی۔
''ہاں''۔ منیش نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے کہا اور سوچنے لگا کہ اتنی سردی میں کوئی بھی سُن ہو کر مر سکتا ہے۔
''ہمیں ٹھنڈ کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔'' منیش نے برکھا کو سناتے ہوئے خود سے کہا۔
''ہاں صرف نیند کے بارے میں ہی سوچنا چاہیے۔'' برکھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
منیش کو جیسے جیسے نشہ چڑھ رہا تھا اس کا جسم ویسے ویسے گرم ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ اس وقت یونیورسٹی والی نینا کے بارے میں کیوں سوچنے لگا تھا۔
جمناسٹک کے مخصوص لباس میں اس کا چست جسم منیش کے تصور میں گھومنے لگا جسے دیکھ کر وہ سرشار ہو جاتا تھا۔
''مجھے پینی نہیں چاہیے تھی۔'' اس نے پریشان ہو کر سوچا۔
''پہلے تو مجھے شملہ سے چلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''
اسے اپنی غلطیوں کا پے در پے احساس ہو رہا تھا۔
''پھر مجھے پی کر برکھا کے ساتھ اس طرح لیٹنا نہیں چاہیے تھا۔''
''مگر کیوں؟'' اس نے اپنے خیالات کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔
''برکھا میری دیدی ہے۔ میں ایسے کیوں سوچ رہا ہوں۔ مجھے نیند کے بارے میں سوچنا چاہیے''۔ اس نے سب خیالات کو پیچھے دھکیل کر صرف نیند کے خیال سے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔
جیسے ہی منیش کا جسم برکھا کے جسم سے چھوا وہ اور سکڑ گئی۔ جس شیر کی ہم بات کر رہے تھے وہ ہمارے دلوں میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے شاید۔ وہ سوچنے لگی:-
''میں نے منیش کو پینے سے روکا کیوں نہیں؟''
''مگر اس طرح اسے سردی کم لگے گی۔''
''تو پھر مجھے بھی۔۔۔''
''نہیں۔۔۔ شاید ہاں۔۔۔''
''مگر میں ایسا غلط سوچ ہی کیوں رہی ہوں؟''
''نہیں میں تو نارمل ہوں۔''
''پھر سکڑ کیوں رہی ہوں میں؟''
اس نے بھی اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ دونوں کے جسم اِک دوسرے کو چھو گئے تھے۔ دونوں اس طرح ظاہر کر رہے تھے کہ جیسے وہ بے خبر گہری نیند میں سو رہے ہوں۔
اِک دوسرے سے جُڑی دونوں کی پُشت سے اب جسم میں گرماہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دونوں جاگ رہے ہیں، دونوں ہی سونے کا دکھاوا کر رہے تھے۔ جگہ بہت کم تھی اور سردی شدید۔ دونوں اِک دوسرے کے جتنا قریب تھے نیند اُن سے اتنی ہی دور تھی۔ اب وہ شاید بے خبر تھے شملہ اور کُفری کے راستے کے بیچ و بیچ بند ہوئی جیپ سے دیودار کے اونچے اونچے درختوں سے برف سے سفید سڑک سے اور یخ کر دینے والی سردی سے۔
منیش نے نینا کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کا بُرا حال کر لیا تھا۔ اسے اپنی کن پٹیاں دہکتی محسوس ہوئیں اور اس کا منہ لعاب سے بھر گیا جب اسے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی تو وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ برکھا کا رَوم رَوم کانپ رہا تھا۔ منیش نے پچھلا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔
باہر برف گرنی بند ہو گئی تھی اور اب تیز ہوائیں چلنے لگیں تھیں۔ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ جب برف گرنی بند ہو جائے اور ہوائیں چلنی شروع ہو جائیں تو سردی کتنی بڑھ جاتی ہے۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے پل بھر میں اس کے جسم کو سُن کر دیا۔ پیشاب کرتے اس کا جسم ٹھنڈا یخ ہو گیا اور دانت زور زور سے بجنے لگے۔
جیپ کا دروازہ بند کر کے وہ کمبل میں گھسنے لگا مگر پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل میں چھپے چور کا خوف ابھی بھی موجود تھا شاید اس نے برکھا کو پُکارا ''برکھا او برکھا۔''
اپنی ہی آواز پر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے تو ہمیشہ اسے دیدی کہہ کر مخاطب کیا تھا کبھی نام نہیں لیا تھا اس کا۔ برکھا نے سن کر بھی ان سنا کر دیا۔ مکری بنی پڑی رہی۔ منیش نے اب زور دے کر کہا ''برکھا برکھا دیدی۔'' برکھا نے بے حد السائی انداز میں ''ہوں'' جیسے گہری نیند میں ہو ''کیا ہے؟''
''میں کہہ رہا ہوں اگر تمھیں پریشانی ہو رہی ہے تو میں اگلی سیٹ پر چلا جاتا ہوں۔''
''ارے نہیں۔۔۔ تُو سو جا'' یہ کہتے ہوئے برکھا نے اس کی جانب رُخ کر لیا تھا۔ منیش کی کپکپی کچھ حد تک کم ہو چکی تھی۔ اس نے برکھا کی طرف منہ کر کے لیٹتے ہوئے کمبل کو چاروں طرف سے اچھے سے لپیٹ لیا تھا۔
برکھا کو منیش کا اس طرح بلانا اچھا لگا تھا شاید۔ اس کا دل چاہا کہ وہ منیش کے ماتھے اس کی آنکھوں کے اردگرد دھیرے دھیرے سہلائے جیسے چھوٹے ہوتے وہ کیا کرتی تھی۔ تب تو منیش کانوں کے آس پاس خارش کرائے بنا سوتا ہی نہیں تھا۔ یہ عادت منیش کو دادی نے ڈالی تھی۔ اس وقت یہ دونوں ایک ساتھ سوتے تھے۔

ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر۔ پھر ایک روز دادی نے ہی اعتراض کیا تھا ۔اس وقت برکھا کو سمجھ نہیں آئی تھی کہ دادی ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔اس وقت وہ وہاں موجود تھی جب دادی نے ماں سے کہا تھا''دیکھ بہو، بزرگ کہہ گئے ہیں کہ جوان بہن اور بھائی اگر ایک شہتیر کے نیچے لیٹ جائیں تو شہتیر ٹوٹ جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے بے بے''۔ ماں نے لبوں پر ہلکی سی مسکان بکھیرتے ہوئے کہا تھا۔اس کے بعد وہ کبھی ایک ساتھ نہیں سوئے تھے۔ برکھا نے دادی سے پوچھا بھی تھا کہ شہتیر کیا ہوتی ہے اور ٹوٹ کیسے جاتی ہے؟ اس کو ڈانٹ کر خاموش کرا دیا گیا تھا۔

مگر آج اسے سمجھ آ گئی تھی کہ شہتیر کیا ہوتی ہے۔۔۔اور۔۔۔؟ آج ایک عرصے بعد وہ اس طرح لیٹے تھے۔ برکھا کا جی چاہ رہا تھا کہ منیش اس کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔

''سردی بہت بڑھ گئی ہے۔۔۔'' وہ بڑبڑائی۔

اب منیش گہری نیند سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔

برکھا سے خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''منیش۔۔۔'' پہلے آہستہ پھر اونچی آواز میں اسے پکارا۔نہ جانے منیش کے دل میں کیا تھا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا ویسے ہی ساکت پڑا رہا۔ برکھا کی بے چینی بڑھنے لگی اور غصہ بھی آنے لگا۔

''خود پی لی اور سو گیا۔۔۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے جھٹکے سے پچھلا دروازہ کھولا۔منیش جھٹ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور باہر نکل رہی برکھا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چھوڑ مجھے۔میں نے باہر جانا ہے''۔ برکھا کی آواز میں غصہ تھا اور آواز روہانسی بھی تھی۔

مگر دوسرا ہاتھ برکھا کی پیٹھ پر رکھتے منیش نے کہا''کیا بات ہے برکھا۔تم اس طرح کانپ کیوں رہی ہو؟''

اس کی خود کی آواز سوال کرتے لرز رہی تھی۔

برکھا کے لب ہلے مگر آواز نہیں نکلی۔اس کی آنکھیں جیسے کہہ رہی ہوں''تجھے کیا؟''

''برکھا تمھیں تو بخار لگ رہا ہے شاید۔''منیش نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''شاید''برکھا نے جواب دیا اور ہاتھ چھڑا کر باہر نکل گئی۔

باہر شدت کی سردی تھی مگر برکھا کو ٹھنڈ بالکل نہیں لگ رہی تھی۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جسم سے سارے کپڑے اتار کر برف پر لیٹ جائے برف کو اپنی بانہوں میں بھر لے۔۔۔مُٹھیاں بھر بھر کر برف کو اپنے اندر جذب کر لے۔

جب وہ برف کے اوپر بیٹھ گئی تو اس کے لمس سے اس کا جسم سلگنے لگا۔برف میں کوئی ایسی آگ تھی جو اس کے وجود میں بھرتی جا رہی تھی۔

اور وہ برف میں سمانے کے لیے جھٹپٹا رہی تھی۔

نیند

پوری نیند بہت ضروری ہے۔خاص کر گہری نیند۔یہ ہمارے جسم کو دوبارہ تیاری کرنے کی طاقت دیتی ہے۔مکمل نیند سے نہ صرف موٹاپا، امراض دل جیسی بیماریوں سے بچاؤ ہوتا ہے بلکہ بیمار ہونے پر جلدی ٹھیک ہونے میں بھی مدد ملتی ہے۔نیند کے چار درجات ہوتے ہیں۔سب سے اہم درجہ ریپڈ آنکھوں کی رفتار حرکت یعنی (REM) ہوتی ہے۔یہ وہ درجہ ہوتا ہے جب ہمیں خواب دکھائی دیتے ہیں۔یہی وہ نیند ہوتی ہے جو جسم کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچاتی ہے۔اگر آپ آٹھ گھنٹے سو رہے ہیں تو اس میں بیس فیصد یعنی چھیانوے منٹ کی سب سے گہری نیند یعنی (REM) سب سے ضروری ہے۔

نیند کا پہلا درجہ:

نان ریپڈ مومنٹ یعنی (NREM) جیسے ہی آپ سوتے ہیں یہ حالت شروع ہو جاتی ہے۔یہ درجہ تقریباً بیس منٹ کا ہوتا ہے۔

دوسرا درجہ:

نیند کی یہ حالت رات بھر کی پوری نیند کی تقریباً پچاس فیصد ہوتی ہے۔اس حالت میں دماغ کی سست لہریں اور ڈیلٹا ترنگوں کو چھوڑنا شروع کر دیتا ہے۔

تیسرا درجہ:

ریپڈ آئی مومنٹ یعنی (REM) نیند کی اس حالت میں تقریباً سبھی اعصاب (پٹھے) آرام پا جاتے ہیں، سانسیں بے ترتیب ہوتی ہیں، خواب آنا شروع ہو جاتے ہیں۔یہی ہماری نیند کا سب سے آخری اور سب سے اہم درجہ ہوتا ہے۔اسکرین ٹائم کنٹرول، سلیپ فاؤنڈیشن کے مطابق موبائل فون، کمپیوٹر جیسی الیکٹرانک ڈیوائسز مختصر طول موج (Short Wavelength) والی روشنی خارج کرتی ہیں۔یہ بلیو لائٹ شام کے وقت نیند لانے والے ہارمون میلاٹونن (Hormone Melatonin) کو کم کرتا ہے۔یہ دماغ کی سست لہروں اور ریپڈ آئی مومنٹ (REM) نیند کے وقت کو بھی کم کرتی ہے۔

☆

'' مثلِ زنداں ''

تیسری عالمی جنگ

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

(۱)

آدمی، آدمی، آدمی
آدمی، آدمی، آدمی
دوڑتا، بھاگتا، کودتا، ناچتا۔۔۔آدمی

قتل کرتا ہوا، قتل ہوتا ہوا۔۔۔آدمی
دین اور دھرم کی
پُستکوں کو بڑے پیار سے چوم کر
جھوٹی تعظیم کی، ریت اور رسم کی ہر روایت
کی تکمیل کرتے ہوئے
اندھے کنویں کے اندر ڈبوتا ہوا۔۔۔آدمی
ناخلف آدمی
ناسمجھ آدمی
دوڑتا، بھاگتا، کودتا، ناچتا۔۔۔آدمی
بجتی مٹی سے ڈھالا ہوا آدمی
جب کرونا کے مدِّ مقابل ہوا، رک گیا
رک گیا۔۔۔
ملک در ملک سب
شہر اور بستیاں
حکم حاکم سے سنسان کر دی گئیں
کوٹھیاں، محل، چھوٹے بڑے سب مکاں
جھونپڑے
مثلِ زنداں ہوئے۔۔۔!

لوگ قیدی بنے!
حکم حاکم سے اور جان کے خوف سے
اپنے اپنے ٹھکانوں میں روپوش ہو
(دن ہو یا رات)
چپ چاپ رہنے لگے۔۔۔!
دائمی گردشیں
سست کر دی گئیں یا معطل ہوئیں
شاہراہوں میں، رستوں میں پہرے لگے
کوچے کوچے سپہ گشت کرنے لگی
آدمی نے یہ اعلان کرتے ہوئے
''اس سے ڈرنا نہیں۔۔۔اس سے لڑنا ہے
لڑ کر ہرانا بھی ہے''
ڈر گیا۔۔۔!
اپنے اندر بہت ڈر گیا
دوڑتا، بھاگتا، کودتا، ناچتا۔۔۔آدمی
ڈر گیا۔۔۔!

(۲)

پشت پر اسپِ عالم کی بیٹھا ہوا
ارضِ آدم کا ایک معنوی بادشاہ
تیسری عالمی جنگ کے
رجز پڑھتا ہوا
سامنے آ گیا
صاف لفظوں میں اعلان کرنے لگا
''جنگ آغاز ہو۔۔۔!

کرونا، وائرس کرونا:

اک مرض، اک وبا ہی نہیں
ایک دشمن ہے جو اپنا لشکر لیے
عالم عالم ہے حملہ کناں
بے اماں، بے اماں، بے اماں۔۔۔
یہ کڑا وقت ہے، یہ نیا وقت ہے، یہ نئی جنگ ہے
آزمائش نئی۔۔۔
آدمی کو ہے درپیش اک امتحاں
یہ نئی جنگ اور یہ نیا امتحاں
تیسری عالمی جنگ کہلائے گا۔۔۔
ایسٹر پر مری، آنکھیں مرکوز ہیں
یہ ہے وعدہ مرا:
کرونا
موت کا اور وحشت کا زندہ نشاں
میری حکمت سے معمور یلغار سے
ملک در ملک
بڑھتے قدم روک کر
ارضِ آدم کے باہر نکل جائے۔۔۔!

ایسٹر کے لیے
چرچ کھل جائیں گے
ملک در ملک، لوگوں سے بھر جائیں گے۔۔۔!!

○

(نوٹ)

افسوس ارضِ آدم کا مذکورہ معنوی بادشاہ کرونا کے خلاف تیسری عالمی جنگ نہ جیت سکا۔ دوسری مدتِ حکمرانی کے لیے انتخابات بھی ہار گیا اور نئے بادشاہ نے ۲۰۔جنوری ۲۰۲۱ء کے دن اپنی تخت نشینی کا حلف اٹھالیا۔

ع۔ج

بے چہرگی کا کلچر

یہاں کوئی چہرہ، کسی دوسرے کو
نہیں دیکھتا ہے۔
یہاں اصل چہروں سے بیزار لوگوں نے
چہرے اتارے ہوئے ہیں، کہ بے چہرگی میں
سہولت بڑی ہے۔۔۔!

کسی فرد کا کوئی چہرہ نہیں ہے
کسی چیز کی، کوئی صورت نہیں ہے۔۔۔!
یہ مانا کہ چہرے
زبانوں کے مالک ہیں
اور بولتے ہیں
زبانوں میں اپنی۔۔۔
مگر یہ بھی سچ ہے کہ سچ سے گریزاں
زمانے کا کلچر
ہے بے چہرگی کا
کہ بے چہرگی میں سہولت بڑی ہے۔۔۔!
اگر اصل چہرے
زباں کھولتے تو
جو محسوس کرتے، وہ سب بول دیتے
وہ
''سچ'' بول دیتے۔۔۔!!

○

گمشدہ آدمی کا انتظار

چندربھان خیال
(دہلی)

لہو نوش لمحوں کے بیدار سائے
اسے گھیر لیں گے سنانیں اٹھائے
تمازت زدہ شب زنِ باکرہ سی
سمٹ جائیگی اور بھی اپنیتن میں

وہ سورج کا ساتھی اندھیروں کیبن میں
اثاثہ لئے فکر کا اپنے فن میں
شعاؤں کی سولی پہ زندہ ٹنگا ہے
نہ اب شہر میں کوئی اتنا حزیں ہے

غضب ناک تنہائیوں کو یقیں ہے
کہ اس کے مقدر میں وہ خود نہیں ہے
وہ اک انفرادی حقیقت کا حامی
فصیلوں پہ وہم و گماں کی کھڑا ہے

سحر زاد شبنم سے یہ پوچھتا ہے
کہ سورج کے سینے میں کیا کیا چھپا ہے
مگر شام کی سرخ آنکھوں نے اس پر
ہمیشہ سلگتی ہوئی راکھ ڈالی

تہِ آتشِ سرخ رو وہ سوالی
کہ جس نے ہتھیلی پہ سرسوں جما لی
کسی دیوتا کی نگاہِ غضب سے
بنا اجنبی اپنے آباد گھر میں

کبھی اِس نگر میں کبھی اُس نگر میں
کبھی بس گیا صرف دیوار و در میں
وہ اک شخص تنہا کہ جس کا ابھی تک
سفر ہے مسلسل، نہ گھر مستقل ہے

فقط پاس میں اس کے معصوم دل ہے
مگر کس قدر مضطرب ، مضمحل ہے
جو شہرِ انا میں کھڑا سوچتا ہے
کہاں رات کاٹے ،کہاں دن بتائے

ہتھیلی پہ دنیا کا نقشہ بنائے
بھٹکتا ہے وہ آج بھی چوٹ کھائے
ارے گمشدہ آدمی آ کے مل جا
ارے گمشدہ آدمی آ کے مل جا

کمال بے کمال بے

ڈاکٹر ساگر ترپاٹھی
(ممبئی)

تو حسنِ لازوال ہے کہ حسنِ بے مثال بے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

نظر نظر ٹھہر گ ء ہر ایک دل مچل گیا
نکل پڑا جو راہ میں غضب ہوا غضب ہوا
کسی کے ہوش اڑ گئے کوء زمیں پہ گر پڑا
اٹھا یہ شور ہر طرف وہ کون تھا کدھر گیا
کرے گا کون حل اسے بڑا حسیں سوال ہے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

فضا بھی اک امید کا دیا جلا کے گ ء
ہوا بھی تیرے لمس سے مہک اڑا کے لے گ ء
سحر ترے وجود سے چمک چرا کے لے گ ء
ترے لبوں کی اوس کو بھی دھوپ اٹھا کے لے گ ء
تجھے خبر بھی ہے ترا کسے کسے خیال ہے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

تو روک دے تو راستے بھی آنا جانا چھوڑ دیں
یہ چاند تارے روشنی کے گیت گانا چھوڑ دیں
سمندروں کی مچھلیاں بھی گنگنا نا چھوڑ دیں
شجر کی شاخ پر پرندے چہچہانا چھوڑ دیں
ترے خلاف جائے جو کسی کی کیا مجال ہے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

فلک فلک بکھر گ ء عقیدتوں کی داستاں
ترے وجود کا ہی ذکر ہو رہا زباں زباں
چھڑی جنگ جھوٹ اور صداقتوں کے درمیاں
ترے لئے مٹی ہیں جانے کیسی کیسی ہستیاں
صدائے حق کہوں تجھے یا خواہشِ بلال ہے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

ترا وجود ہی بنا ہے عظمتوں کا سائباں
تری کھنک سے گونجتی ہے مسجدوں کی ہر اذاں
ترے ہی ذکر سے بنی ہے رام کی بھی داستاں
تو بولتا ہے تو بولتی ہیں مندروں کی گھنٹیاں
اذاں ہے شنکھ ناد ہے کہ ستشری اکال ہے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

غزل ہے تو کہ مسنوی قصیدہ یا رواء ہے
سخن سخن ضیا تری .تری ہی روشناء ہے
غزل کے لفظ لفظ میں تری ہی لب کشاء ہے
کہ یہ کہوں رخِ حسیں کی تیرے رونماء ہے
ادب کے آئینے میں تو ہی پیکرِ جمال ہے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

ترے حسین رخ پہ چاند کس قدر فدا ہوا
افق پہ کہکشاں سے تیرا نام ہے سجا ہوا
ہے تیرا عکس تتلیوں کے رنگ میں گھلا ہوا
بہار کے قلم سے تیرا قصہ ہے لکھا ہوا
یہ کائناتِ حسن آج تجھسے مالامال ہے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

ٹھہر سکے جو رخ پہ تیرے ہے کوء نظر کہاں
ترے سوا کسی کو بھی ہے طور کی خبر کہاں
بشر کے بس میں ہے زمیں سے عرش کا سفر کہاں
کہے تیرے جیسا ہوگا کوء اتنا معتبر کہاں
جو تجھسے دور ہو گیا اسی کا تو زوال ہے
تجھے کہوں تو کیا کہوں کمال بے کمال بے

ڈاکو

زہرا نگاہ
(کراچی)

کل رات مرا بیٹا مرے گھر
چہرے پہ منڈھے خاکی کپڑا
بندوق اٹھائے آ پہنچا
نوعمری کی سرخی سے رچی اس کی آنکھیں
میں جان گئی
اور بچپن کے صندل سے منڈھا اس کا چہرہ
پہچان گئی
وہ آیا تھا خود اپنے گھر
گھر کی چیزیں لے جانے کو
ان کہی کہی منوانے کو
باتوں میں دودھ کی خوشبو تھی
جو کچھ بھی سینت کے رکھا تھا
میں ساری چیزیں لے آئی
اک لعل بدخشاں کی چڑیا
سونے کا ہاتھ چھوٹا سا
چاندی کی اک ننھی تختی
ریشم کی پھول بھری ٹوپی
اطلس کا نام لکھا جزدان
جزدان میں لپٹا اک قرآن
پر وہ کیسا دیوانہ تھا
کچھ چھوڑ گیا کچھ توڑ گیا
اور لے بھی گیا ہے وہ تو کیا
لوہے کی بدصورت گاڑی
پٹرول کی بو بھی آئے گی
جس کے پہیے بھی ربر کے ہیں
جو بات نہیں کر پائے گی
بچہ پھر آخر بچہ ہے

''بڑھاپا''

فیض منصور فیض
(لاہور)

(اچھا لگتا ہے)
اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے
جسے خود ہی بنایا ہو اسی کی چھاؤں میں گزرے
جہاں اجداد سوئے ہیں انہی کے پاؤں میں گزرے
جنہوں کے ساتھ گزری ہے انہی کے چاؤں میں گزرے
بڑھاپا اچھا لگتا ہے اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے
جہاں کا آب زم زم آپ کو کامل شفا دے دے
جہاں کا پیر کامل آپ کو حاصل دعا دے دے
جہاں کی خاک پاک آپ کو اپنی پناہ دے دے
بڑھاپا اچھا لگتا ہے اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے
جہاں ساتھی پرانے ہوں ماضی کے فسانے ہوں
یادوں کے خزانے ہوں سبھی اپنے زمانے ہوں
موسم بھی سہانے ہوں محبت کے ترانے ہوں
بڑھاپا اچھا لگتا ہے اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے
جہاں بیمار ہوں گر تو ہوں تیماردار کافی
اگر پہلو بدلنا ہو تو ہوں عیالدار کافی
اگر آواز دوں اک کو تو ہوں پاسدار کافی
بڑھاپا اچھا لگتا ہے اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے

○

انسانیت کی شاعرہ

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی
(قاہرہ)

فہمیدہ ریاض کا شمار پاکستان کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے، وہ ۲۸ جولائی ۱۹۴۶ء کو میرٹھ کے ایک ادبی خانوادے میں پیدا ہوئیں۔ ادبی ماحول میں ہونے والی پرورش نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا اور یہی پرورش ان کے شاعرانہ تجربے کی پختگی دینے میں بنیاد کا پتھر بنی۔ مشرقی اور مغربی ادب سے ان کی واقفیت گہری تھی، خاص طور پر ان دونوں کے درمیان امتزاج سے واقف تھیں، وہ اردو اور فارسی روانی سے بولتی تھیں۔

فہمیدہ ریاض ایک شاعرہ، ناول نگار اور صحافی تھیں۔ ان کی تحریروں سے بھری زندگی چالیس سال سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ ان کی تخلیقات ادبی حلقوں میں ایک غیر معمولی گہرائی اور دلکشی رکھتی ہیں، خواہ وہ شاعری ہو یا نثر، وہ ایک جامع مصنفہ مانی جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فہمیدہ کو جدید شاعروں میں ایک منفرد مقام حاصل ہے اور ان کے شعری مجموعوں میں مماثلت نہ ہونے کی وجہ سے ہر شعری مجموعہ بالکل الگ اور منفرد نظر آتا ہے۔ ان مجموعوں سے: 'پتھر کی زبان'، 'بدن دریدہ'، 'دھوپ'، 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'، ہمرکاب'، 'اپنا جرم ثابت ہے'، آدمی کی زندگی'۔

فہمیدہ ریاض نے نثری تحریر کو بھی اظہار کی ایک اور شکل کے طور پر استعمال کیا اور اردو ادب کو متعدد نثری تحریروں سے سجایا۔ ان میں ادھورا آدمی'، زندہ بہار'، حلقہ مری زنجیر کا'، اور کھول دریچہ سے' وغیرہ شامل ہیں۔ ۲۱۔ نومبر ۲۰۱۸ء کو فہمیدہ ریاض اس دنیا سے چل بسیں۔

فہمیدہ ریاض نے جو کچھ لکھا اس کا مقصد معاشرے کو بدلنا اور سب کے لیے انصاف کا حصول تھا۔ وہ مانتی تھیں کہ تمام انسان برابر ہیں، صنف یا رنگ کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں کیا جانا چاہیے۔ ان کی نظمیں زندگی کے تجربات سے جنم لیتی ہیں۔ فرقہ وارانہ تصادم کی جنگیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور قتل و غارت گری، مساجد اور مندروں پر ہونے والے حملے سے وہ متاثر ہوئیں۔ شاعرہ نے اس فرقہ وارانہ جھگڑے کی مذمت کی ہے جو مسلمانوں اور ہندو کے درمیان وقتاً فوقتاً رونما ہوتے ہیں، خاص طور پر اس علاقے میں جہاں 'کبیر داس' مدفون ہیں، جو کہ 'اتر پردیش' ہے، جس میں 'بابری مسجد' ہے۔ ان مسجدوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان فرقہ وارانہ جھگڑے کا مشاہدہ کیا؛ ''کبیر'' کے ذریعے شاعرہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ مسلمان، ہندو اور دیگر اقوام ایک ہی ملک میں، جو کہ ہندوستان ہے، سینکڑوں سالوں سے رہ رہے ہیں، اور ان کے درمیان کوئی دراڑ نہیں تھی، اس لیے ہندوستان کے لوگوں کو دوستی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ان کی نظم 'پوروانچل' کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اوس سے گیلا ہے سبزہ
کہ گیلے ہیں میرے دو نین
پڑے ماٹی پتھر کے ڈھیر
وہی مسجد مندر کے پھیر
تنے لوگوں کے تیور دیکھ
اسی دھرتی پر سویا سپوت
جاگ کر تمہیں مناتا ہے
کبیر کچھ سمجھاتا ہے

فہمیدہ ریاض فلسطینیوں کے مسائل سے بھی متاثر ہوئیں۔ 'ارض فلسطین' نظم میں شاعرہ نے سرزمین فلسطین کو مخاطب کرتے ہوئے ہمیں یاد دلایا کہ فلسطین تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے، انہوں نے اس کا موازنہ ایک چھوٹے پرندے سے کیا ہے جو اڑنا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں سرایت ناانصافی اور ظلم کے خنجر سے روکا جاتا ہے، اور خون بھی ٹپکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ارض فلسطین، ارض فلسطین اے گہوارہ علم و تمدن
تہذیبوں کے ساحل پر بسنے والے اے ننھے طائر
استبداد کا پنجہ خونیں کب سے تیرے دل میں گڑا ہے
کب سے پھڑک رہے ہیں بازو
کب سے لہو رستا جاتا ہے

سماجی مسائل پر بات کرتے ہوئے، فہمیدہ ریاض نے معاشرے کی نبض کو ٹٹولا۔ وہ صحیح معنوں میں اس معاشرے کی شاعرہ ہیں، جس میں وہ رہتی ہیں، اس کی خوشیوں اور غموں کی تصویر کشی کرتی ہیں اور اس کے معاملات اور دکھوں کی خاکہ نگاری کرتی ہیں۔ انہوں نے ٹوٹے پھوٹے لوگوں کے بارے میں لکھا، ان کی نبض کا مشاہدہ کیا، اور غریبوں اور مظلوموں کا ساتھ دیا۔ وہ اپنی شاعری میں ان کے درد اور خواہشات، ان کی روزمرہ کی زندگی اور اپنے اردگرد کے ماحول کو بیان کرتی ہیں۔ انہوں نے سماجی حقیقت کو اس کے تمام عوامل اور جذبات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نظم 'ساحل کی ایک شام' کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں، جس میں فہمیدہ غربت کا تصور کرتی ہے کہ ایک آوارہ، غریب اور پسماندہ بچہ سمندر کے کنارے کھڑا ہے:

زائیدہ بحر ایک بچہ
ساحل پر سرنگوں کھڑا ہے
وہ تم سے میری ہمکناری
حیران آنکھوں سے دیکھتا ہے

اتنا گمنام، اتنا تنہا
بے خانماں سا، یہ ایک بچہ
جس کا کوئی گھر کہیں نہیں ہے
جس کی وارث زمیں نہیں ہے
جیسے جھوٹی غذا کا دونا
ساحل پہ کہیں پڑا ہوا ہے
جیسے گیلی ہوا کی زد میں
میلے کاغذ کا ایک ٹکڑا

فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری کے ذریعے حقوق نسواں کے حوالے سے زندگی میں اپنا کردار دکھانے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر ان کے شعری مجموعہ 'بدن دریدہ' میں خواتین کے جذبات اور ضروریات کے اظہار کے حق کا دفاع کرنے والی نظمیں پیش کیں۔ خواتین کے مسائل سے متعلق اپنی شاعری میں فہمیدہ دیکھتی ہیں کہ عورت ایک سماجی وجود کے طور پر ایک ایسی ہستی ہے جو معاشرے کی ترقی یا اس کی ترقی کے فقدان میں فعال اور اہم کردار رکھتی ہے، اسے معاشرے کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے بنایا گیا تھا، اور وہ ایک مرد کی طرح اپنی ذمہ داریاں نبھاتی ہے۔ وہ مرد کی ساتھی ہے، چلتی پھرتی، لڑتی اور جدوجہد کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی انسان ہے جس کا زندگی کے اسٹیج پر بنیادی اور اہم کردار ہوتا ہے، معاشرہ ابھر نہیں سکتا اور اس کی نصف توانائی ختم ہو جاتی ہے، خواتین کو اپنے عہد میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے، زندگی کی جنگ میں مردوں کے شانہ بشانہ اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ان کی نظم 'چادر اور چار دیوار' کے کچھ اشعار کو دیکھیے:

اس زمین پر وجود میرا نہیں فقط اک نشان شہوت
حیات کی شاہراہ پر جگمگا رہی ہے مری ذہانت
زمین کے رخ پر جو ہے پسینہ تو جھلملاتی ہے میری محنت

فہمیدہ ریاض عورتوں کی نسوانیت پر بھی زور دیتی ہیں، وہ مانتی ہیں کہ عورت ایک آزاد آواز رکھتی ہے، اور زندگی میں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہو سکتی ہے۔ عورت ایک ذہین اور حساس ہستی ہے، نہ کہ ہوس اور لذت کی چیز، وہ محنت بھی کرتی ہے اور اس کا پسینہ زمین کی پیشانی کو روشن بھی کرتا ہے۔ وہ آزادی چاہتی ہے۔ فہمیدہ بھی مردوں اور عورتوں کے درمیان برابری کا مطالبہ کرتی ہیں۔ انہوں نے اس بات کا اظہار ایک بحری جہاز کے استعارے سے کیا ہے، جو ہوا کے رخ پر حرکت کرتے ہوئے اپنے بادبان کھولتا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

کھل فضاؤں میں بادباں کھول کر بڑھے گا مرا سفینہ
میں آدم نو کی ہم سفر ہوں
یہ جس نے جیتی مری بھروسہ بھری رفاقت!

آخر میں کہہ سکتی ہوں کہ فہمیدہ کو بیان کرنے کے لیے اگر کوئی لفظ ہے تو وہ ایک نڈر عورت ہے، جو ہمیشہ سچی، نڈر اور بے باک نظر آتی ہے، ان کی شاعری ہی ان کی شہرت کا اصل سبب ہے، اور ان کی ادبی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم ان کی شاعری پر غور کریں تو ہم ان کے تمام اشعار میں نرمی، شستگی اور شدید جذبات کا مشاہدہ کریں گے۔ انہوں نے اپنے تمام جذبات و احساسات کو انسانیت کی خدمت کے لیے استعمال کیا، اور اپنی جنس کی حقیقت کو پیش کیا۔

ادب ۲۰۲۲ء

یوم آزادی کے موقع پر ادب کے شعبے میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو نشان امتیاز، امجد اسلام امجد کو ہلال امتیاز، ساغر صدیقی، نصیر ترابی، حسن منظر، معین الدین عقیل، شمع خالد اور شاکر شجاع آبادی کو ستارہ امتیاز، فرحت عباس شاہ، عبیداللہ درویش درانی، غلام حسن حسنی، رانا فضل حسین، جمشید خان دکھی، ڈاکٹر اشرف شاہین قیصرانی اور جہاں زیب نیاز خان کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی اور نیلم احمد بشیر، ڈاکٹر وحید احمد، سورج نرائن، جمیل احمد پال، ذوالفقار سیال، محترمہ خضناء ماریہ اور شیخ محمد اقبال کو تمغۂ امتیاز دیئے جانے کا اعلان۔

جینا اسی کا نام ہے

دنیا کے مشہور فٹ بال کھلاڑی "سڈیو مانے آف سینیگال" (مغربی افریقہ)، جن کی پاکستان روپیہ میں ہر ہفتے پی کے آر 3 کروڑ 16 لاکھ آمدنی ہوتی ہے، کئی جگہوں پر ٹوٹے ہوئے موبائل فون کے ساتھ دیکھا گیا۔ ایک انٹرویو میں جب اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نیا کیوں نہیں خرید رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ میں ایک ہزار سمارٹ فون، 10 فیراری گاڑیاں، 2 جیٹ طیارے، ڈائمنڈ گھڑیاں تک خرید سکتا ہوں، لیکن مجھے ان سب کی ضرورت کیوں ہو۔ میں نے غربت دیکھی، تو میں سیکھ نہیں پایا، میں نے اسکول ایسے بنائے کہ لوگ سیکھیں، میرے پاس جوتے نہیں تھے، میں جوتے کے بغیر کھیلتا ہوں، میرے پاس اچھے clothes کپڑے نہیں تھے، میرے پاس کھانا نہیں تھا۔ آج میرے پاس بہت کچھ ہے کہ میں اسے دکھاوے کے بجائے اپنے لوگوں کے ساتھ بانٹنا چاہتا ہوں۔

کائنات میں جنس کا کردار

فیروز عالم
(لاس اینجلس)

ایک روایت ہے کہ اللہ تعالی نے جب حضرت آدم کی تخلیق کی تو باوجود اس کے کہ وہ جنت میں تھے جہاں دلفریب نظارے تھے، رنگا رنگ پھول اور قسم قسم کے پھل اور میوہ جات تھے۔ وہ پھر بھی ناخوش تھے کیونکہ وہ ایک لامتناہی اور روح فرسا تنہائی کا شکار تھے۔ ان کے دل میں ویرانی اور اکیلے پن کے جھکڑ چلتے تھے۔ ایسے میں اللہ تعالی نے اپنی اس پیاری تخلیق یعنی آدم کی ناخوشی اور اداسی کو محسوس کیا اور جب وہ محوخواب تھے تو انکی پسلی کو کاٹ کر اس سے بی بی حوا کی تخلیق کی۔ جب آدم خواب سے بیدار ہوئے تو انہوں نے اپنے نزدیک ایک بیحد پر کشش، نہایت حسین اور انکے دل کو اپنی جانب کھینچتی اس مخلوق کو دیکھا، اسی لمحے ان کو ایک ایسا احساس ہوا جو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، انہیں لگا کہ جیسے انہیں اسی کا انتظار تھا اور اب اس جنت میں جہاں سب کچھ تھا مگر پھر بھی کسی شے کی کمی تھی، وہ ہمیشہ کے لئے دور ہوگئی ہے۔ اب یہاں کی ویرانی میں کسی کے وجود سے جیسے بہاریں آگئی ہوں ۔ اس ڈرامائک تبدیلی کی وجہ یہی مخلوق ہے، کون تھی یہ مخلوق۔۔ یہ تھی عورت۔ شاید اسی کو علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

وجود زن سے ہے تصویر کائینات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ آدم کی تنہائی دور کرنے کے لئے اللہ تعالی نے ان کے لئے ایک بیوی، ایک عورت ہی کیوں تخلیق کی۔ یہ تنہائی تو ایک دوست سے، یا پھر ایک ماں، باپ یا بھائی کی تخلیق سے بھی دور ہوسکتی تھی مقصد یہ تھا کہ جو تعلق مرد اور عورت کے درمیان ہوسکتا ہے وہ کسی اور سے نہیں ہوسکتا۔ ایک مرد کو (اور اسی طرح ایک عورت کو) جو کیف، جو راحت اور جو لذت ایک دوسرے سے مل سکتی ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اس کا کوئی بدل نہیں اور اس لذت کی تکمیل کی چاہت اللہ تعالی ہی نے انسان کی فطرت میں رکھی ہے اللہ تعالی سورۃ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں فرماتا ہے ''تم ایک دوسرے کا لباس ہو''۔۔ یہ انسان کی بنیادی جبلت ہے، بالکل اسی طرح جس طرح انسان کی بھوک اور پیاس ایک بنیادی جبلت ہیں جس کو بجھانے کے لئے وہ ہر قسم کی جدوجہد کرتا ہے اسی طرح جنسی طلب کی تسکین کے لئے بھی وہ قدرتی طور پر مجبور ہے، نہ صرف انسان بلکہ حیوانات (اور میرے کچھ قارئین کے لئے شائد یہ بات باعث حیرت ہو کہ نباتات میں بھی جنس کا وجود ہے اور پودوں میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں اور وہ بھی اسی جبلت سے مجبور ہو کر کسی نہ کسی طرح اختلاط کے لئے بیقرار ہوتے ہیں)

لیکن خالق کائینات کو اس جذبے کی قوت کا احساس تھا، اسے معلوم تھا کہ انسان کے بہت سے جذبوں میں یہ اس قدر پرزور اور شدید ہے کہ اس کے زیر اثر یا اس کے حصول کے لئے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے، یہ طے شدہ بات ہے کہ جنسی جذبات کے موجزن ہونے پر انسان پر اس کی عقل اور سوچ کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اس کو بے مہار چھوڑنے پر معاشرے میں شدید بے راہ روی اور نقصانات پیدا ہو سکتے ہیں اس لئے خدائے ذوالجلال نے اس پر پابندیاں لگائیں۔ ازمنہ قدیم سے تقریبا ہر معاشرے اور مذہب نے اس کے حصول کے لئے جائز اور قانونی طریقے رائج کئے۔ ان حدود میں رہتے ہوئے اس کی تسکین کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا بلکہ دین اسلام نے تو اس کی تسکین کو بڑی حد تک لازمی قرار دیا کہ رسول خدا نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا اور فرمایا کہ جو بھی نکاح کی استطاعت رکھتا ہو وہ ضرور نکاح کرے۔

اب کچھ مبلغین اور مذہبی رہنما جنس کو صرف افزائش نسل کے لئے ہی ضروری قرار دیتے ہیں اور انکا مسلک یہ ہے کہ جنس کا وجود صرف اولاد کی پیدائش کے لئے ہے اور اگر یہ مقصد پورا ہو جائے تو جنس کا استعمال صرف لذت بدنی کے لئے ہوگا جو مستحسن نہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں اور مجھے ہر قسم کے دلچسپ معاملات سے واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ سال پہلے میری ایک مریضہ میرے پاس آئیں۔ انکے شوہر بھی چالیس کی دہائی میں صحت مند اور خوش وخرم ہیں انکے دو بچے بڑے ہو چکے ہیں اور دونوں کالج میں ہیں۔ اب انکے درمیان تنازعہ یہ تھا، جس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کیا گیا تھا کہ خاتون اس بات پر مصر تھیں کہ شوہر و بیوی کا جسمانی تعلق صرف اولاد کے لئے تھا اور اب جب یہ مقصد پورا ہو چکا ہے تو مزید اس قسم کے ملاپ کی نہ ضرورت ہے نہ ہی اجازت۔

میں عالم دین نہیں اس لئے میں افزائیش نسل کے بعد صرف جنسی تسکین کی ''اجازت'' پر تو اظہار خیال نہیں کرسکتا مگر میں طبی یا سائنسی طور پر اسکی توجیہ کرنے کی کوشش کرونگا کہ عمر کے ہر حصے میں جنسی تسکین کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت قدرت ہی نے انسان میں رکھی ہے۔

اس مرحلے پر طبی طور پر جنسیات کا کچھ پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسکے جذبات ہیں، احساسات ہیں اور قدرتی جبلات کے علاوہ اس میں حس جمالیات بھی ہے جنس کی فزیالوجی انسان اور حیوان میں مختلف ہے۔ حیوانات کے لئے یقیناً جنس صرف افزائش نسل کا ذریعہ ہے اس لئے ان میں جنسی تسکین کا ایک مقررہ دور آتا ہے، ایک موسم آتا ہے جب وہ اپنا جوڑا تلاش کرتے ہیں اور اس مقصد کی تکمیل کے بعد وہ جنسی طلب سے دور ہوجاتے ہیں۔ مگر انسان میں جنس کی طلب اور خواہش بڑی حد تک دائمی ہے اور آخیر تک قائم رہتی ہے۔۔۔ شاید اسی لئے غالب نے کہا ہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

جنسی اعضا کی نشو ونما دو کیمیائی مادوں یعنی ہارمونز کے زیر اثر ہوتی

ہے۔ان میں نسوانی ہارمون ایسٹروجن اور مردانہ ہارمون ٹیسٹرون سرفہرست ہیں انہی کے اثر سے انسانی جسم میں بلوغت کے وقت وہ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن سے ظاہری طور پر عورت عورت اور مرد مرد نظر آتا ہے۔نہ صرف ان کے زیر اثر مادی تبدیلیاں ہوتی ہیں بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ذہنی انقلاب بھی بپا ہوتا ہے جب ایک مرد کے دل میں عورت کے لئے کشش پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف عورت کے بھی دل میں مرد کی قربت کی چاہت بیدار ہوتی ہے۔اپنے محبوب سے ملنے کے لئے سوہنی کا کچے گھڑے پر دریا کو عبور کرنے کی کوشش اس کا ثبوت ہے۔

سائنسی تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جیسے فزیالوجی کے تحت انسانی جسم کی ہر طلب کی تکمیل ضروری ہے اسی طرح جنسی تسکین کا حصول بھی ضروری ہے اس کو قدرت کے اصولوں کے خلاف ذبردستی دبانے سے نقصانات ہوتے ہیں۔اگر اس اشتہا کو مطمئن نہ کیا جائے تو جنسی اعضا کے اندر خون کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور زیریں حصہ میں ایک وزن اور بوجھ کا احساس ہوتا ہے، ذہنی طور پر پر جھنجلاہٹ ہوتی ہے اور طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔جب تک یہ طلب پوری نہ ہو ایک بے چینی سی رہتی ہے۔قدرت نے اس کے نکاس کا ذریعہ بنایا ہے اور جوانی میں جب ہارمون اپنے عروج پر ہوتے ہیں تو نیند کے دوران احتلام ہوتا ہے جو اسی اخراج کی ایک شکل ہے۔یاد رہے ہر وہ ردعمل جو مرد میں ہوتا ہے وہی عورت میں بھی ہوتا ہے اور شاید یہ بات کچھ قارئین کے لئے حیران کن ہو مگر عورتوں کو بھی خواب (نیند) میں احتلام ہوتا ہے، اگرچہ اس کی صورت یا شدت مرد سے مختلف ہوتی ہے مگر انہیں اس کے ذریعہ جنسی تسکین ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ خود لذتی بھی ایک قدرتی عمل ہے جو ہارمونز کے زیر اثر جنسی تسکین کی طلب کی وجہ سے عمل میں آتا ہے یہ طلب اس قدر پرزور ہوتی ہے کہ کوشش کے باوجود اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ایک بار پھر سائینس اور طبی تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ (ہمارے عطائیوں اور حکیموں کے اشتہارات کے برعکس) یہ دونوں عمل بالکل قدرتی ہیں اور ہماری فزیالوجی کے عین مطابق ہیں۔انکا عام صحت یا مردانہ قوت پر کسی قسم کا مضر اثر نہیں پڑتا۔

میں اب پھر اپنی اس دلیل پر واپس آتا ہوں کہ اگر قدرت نے جنسی عمل صرف پیدائش اولاد کے لئے تخلیق کیا ہوتا جیسا کچھ علماء اس کا پرچار کرتے ہیں اور انسان کے لئے ایک کیف ولذت کے لئے نہیں ہوتا تو پھر حیوانات ہی کی طرح اس کا صرف ایک دور، ایک مخصوص وقفہ ہی کیوں نہ ہوا۔جنسی تسکین نہ صرف مرد اور عورت دونوں کے لئے ایک ایسی راحت کا باعث ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انسان کی تمام تر حرکات، ہر کوشش وکاوش، اور ہر جدوجہد کی بنیادی وجہ دو ہی جبلات ہیں ایک بھوک اور اس کی تکمیل اور دوسری جنسی تسکین۔ہر چیز کے ڈانڈے بہر حال انہی دو چیزوں سے جا ملتے ہیں۔تاریخ اس کی گواہ ہے کہ یہ جذبہ اور اس کی طلب اس قدر شدید ہے کہ اس کی وجہ سے عظیم واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔علاوالدین خلجی کی رانی پدمنی کے حصول کے لئے چتوڑ پر چڑھائی، نعومی کی فرمائش پر ہیروڈیٹس کا یحیٰ علیہ یا السلام کا سر قلم کرنا اور انگلینڈ کے بادشاہ ہنری ہشتم کا این بولین پر دیوانہ وار فدا ہو جانا اور شادی کی اجازت نہ ملنے پر انگلینڈ کا ہمیشہ کے لئے رومن کیتھولیک مذہب چھوڑ کر نیا مسلک ''انگلیکن چرچ'' قائم کرنا، جس کی وجہ سے انگلینڈ اور سپین کی خوں ریز جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، یہ سب زیر آب جنسی تکمیل کے حصول کے مختلف مظاہر ہیں۔

میں نے پہلے تحریر کیا ہے کہ مرد کی جنسی ضرورت عمر کے آخیر تک رہتی ہے مگر یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ معاشرے کی عائد پابندیوں کے اثرات اگر زائل ہو جائیں اور اس کی حوصلہ افزائی کی جائے تو عورت کو بھی ہر عمر میں جنسی اختلاط سے راحت اور سکون ملتا ہے۔اگرچہ کبرسنی کے بعد وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی اور کبرسنی کی وجہ سے ہارمونز کی کمی ہو جاتی ہے۔ہارمون کی کمی کی وجہ سے اسکے اندرونی اعضاء میں رطوبت کی کمی ہوتی ہے اور جھلیاں خشک ہو جاتی ہیں۔اس کی وجہ سے کچھ عورتوں کو جنسی عمل کے دوران بے آرامی کا احساس ہوتا ہے مگر باہمی محبت، جنسی ملاپ کی حوصلہ افزائی اور ہارمون تھیراپی کے ذریعہ اس کا تدارک بہت آسان ہے۔امریکا میں ایک سروے کے مطابق تو ان عورتوں نے جو کبرسنی کی عمر میں تھیں کہا کہ اگر انہیں موقع ملے تو عمر کے اس دور میں تو وہ جنسی تجربہ سے زیادہ لطف اندوز ہوتی ہیں کیوں کہ اس عمر میں انہیں حاملہ ہو جانے کا خوف نہیں ہوتا اور وہ جنس کو صرف جنس اور ایک قدرتی ضرورت سمجھ کر اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتی ہیں۔

۔ تصور ۔

خلیل جبران کی اپنی محبوبہ میزیادہ سے محبت بغیر کسی ملاقات اور دیدار کے بیس سال تک چلتی رہی۔جبران نیویارک میں تھا اور میزیادہ قاہرہ میں۔

دنیا کے دو کونوں سے دونوں باہم خطوط کا تبادلہ کیا کرتے تھے۔ایک خط میں جبران نے میزیادہ کی تصویر مانگی تو میزیادہ نے اس کو لکھا:

"سوچو! تصور کرو!

میں کیسی دکھتی ہوں گی؟

"جبران: "مجھے لگتا ہے تمھارے بال چھوٹے ہوں گے جو تمھارا چہرہ ڈھانپ لیتے ہوں گے۔

"میزیادہ نے یہ پڑھ کر اپنے لمبے بال کاٹ ڈالے اور ایک خط کے ساتھ اپنے چھوٹے بالوں والی تصویر بھیجی۔

جبران: "تم نے دیکھا؟ میرا تصور بالکل سچا تھا۔۔۔!!

"میزیادہ: "محبت سچی تھی۔۔۔!!

ایک صدی کا قصّہ

شیاما

دیپک کنول (ممبئی)

پانچ سال کی ایک بچی اپنے ماں باپ کے ساتھ لاہور سے بمبئی چلی آئی۔ یہاں اُس نے انجمن ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔اس بچی کا نام خورشید اختر تھا۔ ایک دن کئی لڑکیوں نے شوٹنگ دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ پتا چلا کہ نور جہاں پاس کے ہی ایک اسٹوڈیو میں شوٹنگ کر رہی ہے۔خورشید نے سنا تو وہ بلیوں اُچھل پڑی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ نور جہاں کی زبردست مداح تھی۔اُس نے اُن سے کہا کہ وہ بھی شوٹنگ دیکھنا چاہتی ہے۔یہ لوگ ایک فلمی اسٹوڈیو میں پہنچ گئے جہاں نور جہاں ایک گانے کی ریہرسل کر رہی تھی۔ڈائرکٹر صاحب نے اتنی ساری لڑکیاں سیٹ پر دیکھیں تو دنگ رہ گئے۔چونکہ وہ ایک گانے کی شوٹنگ کر رہے تھے جس میں بہت ساری لڑکیوں کی ضرورت تھی سوانہوں نے ان لڑکیوں سے پوچھا۔تم لوگ اس فلم میں کام کروگی تو ایک کو چھوڑ کر باقی ساری لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں جب کہ نو سال کی خورشید نے بڑی بے باکی سے کہا ''ہم اس فلم میں کام کریں گے''۔بچی کی خوداعتمادی دیکھ کر ہدایت کار بڑے خوش ہوئے۔

اس ہدایت کار کا نام شوکت حسین رضوی تھا۔یہ نور جہاں کا میاں تھا۔ فلم کا نام ''زینت'' تھا۔اس فلم کے لئے وہ ایک قوالی کی شوٹنگ کرنے والے تھے۔ قوالی تھی۔''آہیں نہ بھریں، شکوے نہ کئے'' اس قوالی میں شمشاد بیگم اور نور جہاں نمایاں تھے،جن کی سنگت میں کئی لڑکیاں تھیں۔خورشید نے جس اعتماد اور خوبی کے ساتھ کام کیا وہ دیکھ کر سب لوگ دنگ رہ گئے۔اُس کی اداکاری کے چرچے اتنی تیزی سے پھیل گئے کہ اگلے دن بہت سارے فلمساز اور ہدایت کار نور جہاں کو دیکھنے نہیں بلکہ اس بچی کو دیکھنے آئے۔یہ وہی خورشید اختر تھی جس کی عمر محض دس سال تھی۔فلم ''زینت'' 1945 میں ریلیز ہوئی۔یہ فلم اُس سال کی سب سے بڑی ہٹ فلم تھی۔خاص طور سے اس قوالی نے دھوم مچادی۔اس قوالی کو نخشب نے لکھا تھا اور اسے گایا تھا نور جہاں، زہرہ بھائی امبالہ والی اور کلیانی نے۔مزے کی بات یہ ہے کہ مشہور ہندی کلاکار رشی کلا نے بھی اپنے فلمی سفر کی شروعات اسی قوالی سے کی۔

1947 میں نور جہاں اور شوکت حسین رضوی پاکستان منتقل ہو گئے جب کہ خورشید کے گھر والوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔خورشید کا جنم 7 جون 1935 کو لاہور (پنجاب) کے ایک قدامت پسند مسلم پریوار میں ہوا تھا۔خورشید نو بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔اُس کے ابا خشک میوے کا کاروبار کرتے تھے۔یہ لوگ بسلسلہ کاروبار لاہور سے بمبئی چلے آئے تھے اور پھر یہیں بس گئے۔خورشید کے والد کٹر قسم کے آدمی تھے۔اُسے جب پتا چلا کہ خورشید نے فلم میں کام کیا ہے تو وہ کافی ناراض ہوئے۔وہ فلموں میں کام کرنے کے حق میں نہیں تھے۔اصل میں خورشید بچپن سے ہی فلموں کی طرف راغب ہوئی تھی اور وہ بھی فلمی اداکارہ بننا چاہتی تھی مگر حالات ایسے تھے کہ نہ صرف گھر والے بلکہ سماج بھی فلموں میں کام کرنے کے خلاف تھا مگر خورشید کا ارادہ اتنا اٹل تھا کہ پریوار اور سماج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس نے فلم میں کام کیا۔''زینت'' کی بے پناہ کامیابی کے بعد خورشید کے بھی بھاگیہ جاگ اُٹھے۔ایک قوالی میں شرکت کرنے والی خورشید کی ترقی ہوگئی۔اُسے ایک بال کلاکار کے طور پر فلم ''پروانہ'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔اس فلم کی ریلیز کے بعد اُسے ایک ساتھ کئی فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔1946 میں اُسکی ایک اور فلم ''پرتھوی راج سنیوکتا'' ریلیز ہوئی جس کے مرکزی کردار میں پرتھوی راج کپور، نینا اور بھرت ویاس تھے۔ 1947 میں اُسکی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ایک فلم کا نام ''میرا بھائی'' تھا جب کہ دوسری فلم کا نام ''بیتے دن'' تھا جس میں موتی لال، شیلا اور ون مالا اہم کردار میں تھے۔ان فلموں میں اُس نے بے بی خورشید اور خورشید جونیر کے نام سے پچاس کے قریب فلموں میں کام کیا۔ایک دن اُس وقت کے جانے مانے فلمساز، ہدایت کار اور فلمی لیکھک وجے بھٹ کی ملاقات خورشید سے ہوئی۔وہ اُس کے نام سے خوش نہیں تھا، کیونکہ اس نام کے کئی فن کار پہلے سے ہی انڈسٹری میں موجود تھے۔جن میں خورشید بہت بڑی اداکارہ تھی تو ایک خورشید گلوکارہ تھی۔اسی نام کا ایک موسیقار بھی تھا۔وجے بھٹ نے اُسے سمجھایا کہ وہ اس نام کے ساتھ اپنی پہچان نہیں بنا پائے گی اس لئے اُس نے اُسے نیا نام دیا۔ ''شیاما''۔خورشید کو یہ نام خوب بھایا کیونکہ اس نام کی کوئی بھی لڑکی فلم انڈسٹری میں موجود نہیں تھی اور وہ اسی نام سے بہت جلد مشہور ہوگئی۔

1948 میں اُس کی ایک نہیں تین فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام تھے ''شہنواز'' ''جلسہ'' اور ''گھر ہستی''۔''شہنواز'' میں نہار، بیگم پارہ اور شیخ مختار تھے۔ ''جلسہ'' میں اوم پرکاش، تیواری اور گیتا بالی تھی جب کہ ''گھر ہستی'' میں فیاضی، کلدیپ کور اور سلوچنا چٹرجی تھے۔1949 ایک ایسا سال تھا جس میں شیاما کی ایک درجن کے قریب فلمیں ریلیز ہوئیں۔یہ فلمیں تھیں ''تارا'' ''شبنم'' ''روشنی'' ''روپ لیکھا'' ''پتنگا'' ''نمونہ'' ''نقلی باپ'' ''ناچ'' ''جل ترنگ'' ''کنیز'' ''ایک تیری نشانی'' اور ''چار دن''۔ان فلموں میں ''شبنم'' (دلیپ کمار، کامنی کوشل) ''نمونہ'' (دیو آنند کشور ساہو۔کامنی کوشل) ''پتنگا'' نگار سلطانہ اور شیام۔''ناچ'' شیام اور ''کنیز'' منور سلطانہ، شیام اور کلدیپ کور۔''جلترنگ'' گیتا بالی، رحمان اور ششی کلا۔''چار دن'' شیام، ثریا، اوم پرکاش اور بدری پرساد۔یہ ایسی فلمیں تھیں جن میں شیاما بہن، بھابی، سالی یا کسی چھوٹے موٹے کردار کی بیوی کے رول میں تھی۔

1950 میں اُسکی آٹھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔یہ فلمیں تھیں، ''سرتاج'' ''سبق'' ''پیار'' ''نشانہ'' ''نیلی'' ''ڈولتی دنیا'' ''چھوٹی بھابی'' اور ''آہوتی''۔ان سبھی فلموں میں اُس کا کوئی اہم کردار نہ تھا۔یہ 1951 کی فلم ''سزا'' تھی جس نے شیاما کی قسمت ہی نہیں زندگی بھی بدل کے رکھ دی۔''سزا'' بڑے اسٹار کاسٹ کی فلم تھی۔اس میں دیو آنند کے ساتھ نمی تھی۔یہ ایک تکونی پریم کہانی تھی جس میں تیسرا کردار شیاما نے نبھایا تھا۔اس فلم کے پروڈیوسر جی پی سپی تھے جب کہ ہدایت کار

جانے مانے فوٹو گرافر فلی مستری تھے۔فلی مستری اول درجہ کا کیمرہ مین تھا جس نے بڑی بڑی فلمیں کیں تھی ۔فلی مستری نے دلیپ کمار نرگس کی فلم ''بابل'' کو اس ڈھنگ سے فلمایا تھا کہ ہر شاٹ ایک پینٹنگ کی طرح لگتا تھا۔اس فلم میں اُس نے کیمرہ اپنے چھوٹے بھائی جال مستری کے حوالے کر دیا جب کہ وہ ہدایت کار کی کمان سنبھال کے بیٹھ گئے ۔اس فلم کے سنگیت کار سچن دیو برمن تھے جس نے اپنی خوبصورت دھنوں سے اس فلم میں چار چاند لگا دئے۔ساحر کا لکھا یہ صدا بہار گانا جسے لتا منگیشکر نے لے بخشی ''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے۔ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے'' آج بھی اُتنا ہی مقبول ہے جتنا اُس دور میں تھا۔اس فلم کی فلمبندی کے دوران فلی مستری اور شیاما ایک دوسرے کے قریب آ گئے ۔فلی مستری ایک پارسی نژاد تھے جب کہ شیاما مسلم تھی۔فلی مستری نے ایک دن شیاما سے کہا کہ ''تمہارا چہرہ کیمرہ کے لئے سب سے موزوں چہرہ ہے۔اسے کسی بھی زاویے سے عکس بند کرو یہ ہر زاویے سے کھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔مجھے تمہارے چہرے کو چمکانے کے لئے فاضل لائٹس کی ضرورت نہیں پڑتی ہے''۔اپنی تعریف سن کر شیاما نہال ہو گئی۔چونکہ فلی مستری بہت بڑے کیمرہ مین تھے اس لئے وہ شیاما کے لئے ایسے لینس کا استعمال کرتے تھے جس سے شیاما کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے تھے۔دھیرے دھیرے وہ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔شیاما شوٹنگ کی تاریخوں کے بہانے فلی مستری کو فون کرتی رہتی تھی۔پھر دونوں بیحد قریب آ گئے۔شیاما کے گھر والے اس رشتے کے مخالف تھے۔وہ کسی بھی قیمت پر اس رشتے کو ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔اُنہوں نے شیاما کو ڈرایا دھمکایا مگر شیاما ٹس سے مس نہ ہوئی۔وہ بڑی ضدی لڑکی تھی۔ایک دن دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔شرط یہ تھی کہ یہ شادی چھپ کے ہوگی۔کسی کو اس شادی کے بارے میں بھنک بھی لگنی نہیں چاہیے کیونکہ یہ وہ دور تھا جب شادی شدہ ہیروئنوں کو فلم بین پسند نہیں کرتے تھے۔1953 میں وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔وہ چپ چاپ شادی کر کے شوٹنگ پر چلے گئے اور سب کو یہی بتایا گیا کہ آج جس سین کی شوٹنگ ہونے والی ہے وہ شادی کا سین ہے۔

اسی بیچ شیاما کی ایک اور بڑی فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''ترانہ'' تھا۔ گو کہ یہ فلم مدھو بالا کے کردار کے گرد گھومتی تھی مگر اس تکونی پریم کہانی میں دلیپ کمار کے ساتھ اُس کا رول بھی بڑا اہم تھا۔''ترانہ'' میں تینوں کی فطری اداکاری اور جادو بھرے سنگیت نے تہلکہ مچا دیا۔فلم نے باکس آفس پر دھوم مچا دی۔یہ فلم بھی 1951 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال اُس کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''ہم لوگ'' تھا۔یہ ضیا سرحدی کی ہدایت میں بننے والی ایک جذباتی فلم تھی جسے چندو لال شاہ نے پرڈیوس کیا تھا۔اس کے اہم کرداروں میں بلراج ساہنی، نوتن اور شیاما تھے۔یہ فلم بھی کاروباری لحاظ سے بہت کامیاب فلم رہی۔یہ اُس سال کی دس کامیاب فلموں میں سے ایک تھی۔

شیاما کے ستارے بلندی کی طرف پرواز کر رہے تھے۔سائڈ رول کرنے والی شیاما کو اب ہیروئن کے رول ملنے لگے تھے۔ایک بات بتانا ضروری ہے کہ شیاما اچھی خاصی ڈانسر تھی۔اُس نے ڈانس ڈائرکٹر بدری پرساد سے ڈانس کی ٹریننگ لی تھی ۔1952 میں فلمستان کی فلم ''شریمتی جی'' میں وہ پہلی بار ہیروئن بن گئی۔اس فلم کا ہیرو ناصر خان تھا جب کہ اس فلم کا ہدایت کار مشہور مزاحیہ اداکار آئی ایس جوہر تھا۔اسی سال اُس کی ایک اور فلم بطور ہیروئن ریلیز ہوئی جس کا نام ''آسمان'' تھا اس میں بھی ہیرو ناصر خان ہی تھا۔اس کے فلمساز اُس وقت کے جانے مانے دل سکھ پنچولی تھے۔اس فلم میں پہلی بار اوپی نیر کو موسیقی دینے کا موقع ملا تھا۔اس کے علاوہ شیاما کی پانچ اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔جن کے نام یوں ہیں۔

''نشان ڈنکا''، رنجن، جیون اور شیاما۔''ماں'' بھوپن کپور۔کسم دیش پانڈے اور شیاما۔''جگو'' کمل کپور، کلدیپ کور اور شیاما۔''بھولے بھٹکے'' بھگوان، دلاری اور شیاما، اور ''بدنام'' جس میں بلراج ساہنی، پربھو دیال اور شیاما تھے۔

1953 میں بھی اُس کی آدھی درجن فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام تھے ''ٹھوکر'' ہیرو شمی کپور، ''سہاگ سندور'' ہیرو سندر، ''لہریں'' ہیرو کشور کمار، ''گل صنوبر'' ہیرو شمی کپور، ''چار چاند'' ہیرو بھگوان، اور ''دلِ ناداں'' ہیرو طلعت محمود۔یہ سبھی فلمیں چھوٹے بجٹ کی فلمیں تھیں۔1954 میں اُسکی تیرہ فلمیں ریلیز ہوئیں۔یہ وہ سال تھا جس میں شیاما کی ایک ایسی فلم ریلیز ہوئی جس نے شیاما کی زندگی بدل کے رکھ دی۔یہ فلم تھی گورودت کی فلم ''آر پار''۔چونکہ گورودت بذات خود ایک اچھا ڈانسر تھا اور وہ بڑا اچھا نظر شناس تھا اس لئے اُس نے سی گریڈ فلموں میں کام کرنے والی شیاما کو اس فلم کے لئے چن لیا۔اصل میں گورودت مالی بحران سے گزر رہا تھا اس لئے کسی بڑی ہیروئن کو نہ لے کر اُس نے شیاما کو لینے کا فیصلہ کیا۔اُن دنوں شیاما بھی کافی مصروف تھیں۔اُس کے پاس درجن سے زائد فلمیں تھیں۔شیاما کو اس فلم میں کام کرنے پر راضی کرنے کے لئے گورودت نے اپنی بیوی گیتادت سے کہا کہ وہ شیاما سے بات کرے۔گیتادت جب شیاما سے ملی اور اُسے فلم ''آر پار'' میں کام کرنے کے لئے کہا تو وہ بھلا گیتادت کو کیسے انکار کر سکتی تھی کیونکہ گیتادت بھی اُن دنوں گائکی کی بلندی پر تھی اور اُس نے شیاما کے لئے کئی فلموں میں پلے بیک دیا تھا اور وہ گانے کافی مقبول ہوئے تھے۔شیاما نے گیتادت سے کہا کہ وہ اس فلم کے لئے وہ معاوضہ نہیں لے گی جو وہ دوسرے فلمسازوں سے لیتی ہے۔جو بھی گورودت دیں گے وہ خوشی خوشی اُسے قبول کرے گی۔اُس کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ فلم اُس کے کیریر کا کایا کلپ کر دے گی۔اس فلم نے شیاما کو راتوں رات اسٹار بنا دیا۔اسی فلم کا یہ گانا ''سن سن سن ظالما۔کیسا پیار کیسی پریت رے'' یہ ایک دوگانا تھا جسے گورودت اور شیاما پر فلمایا گیا تھا۔اس گانے نے خوب دھوم مچائی۔اس فلم کے سنگیت نے تو فلم میں چار چاند لگا دئے تھے۔فلم نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا۔بس پھر کیا تھا۔شیاما جو کل تک ایک سی گریڈ ہیروئن کے طور پر جانی جاتی تھی اب نمبر ایک کی ہیروئن بن چکی تھی۔

1955 میں اُسکی صرف تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ان فلموں کے نام تھے، ''مسافر خانہ''، ''خاندان'' اور ''بھاگوت مہما''۔یہ تینوں فلمیں چھوٹے بجٹ کی تھیں جو شیاما نے ''آر پار'' سے پہلے سائن کی تھیں۔سن 1956 شیاما کے لئے ایک خوشگوار سال ثابت ہوا کیونکہ اس سال اُس کی حالانکہ تین ہی فلمیں

ریلیز ہوئیں مگران میں دو فلمیں کافی اہم تھیں ۔ یہ فلمیں تھیں ''بھائی بھائی'' اور ''چھومنتر'' ''بھائی بھائی'' اے وی ایم کی فلم تھی جس کی کاسٹ میں اشوک کمار، کشور کمار، نروپا رائے، نمی اور شیاما تھے ۔اس فلم کے ہدایت کار ایم وی رمن تھے جب کہ اس فلم کے سنگیت کار مدن موہن تھے ۔اس فلم کا یہ صدا بہار گانا ''میرا سندر سپنا بیت گیا'' جسے گیتا دت نے اپنی مدبھری لے بخشی تھی اُس زمانے کا بیحد مقبول گانا تھا۔ یہ فلم کاروباری لحاظ سے کافی کامیاب رہی ۔اسی طرح فلم ''چھومنتر'' تھی جس کے اداکار جانی واکر، اعیتا گوہا اور شیاما تھے ۔اس فلم کو اپنے مدھر سنگیت سے او پی نیر نے آراستہ کیا تھا۔اس فلم کا یہ گانا ''غریب جان کے ہم کو نہ تم مٹا دینا'' کافی مقبول ہوا تھا۔اس فلم نے بھی اچھا خاصا بزنس کیا تھا۔

1957 شیاما کے لئے کاروباری لحاظ سے کافی سود مند سال رہا کیونکہ اس سال اُس کی آٹھ فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام تھے ''سورن سندری'' ''شاردا'' ''مرزا صاحباں'' ''مائی باپ'' ''جانی واکر'' ''ہل اسٹیشن'' ''بھابی'' اور ''باندی'' ۔اس فہرست میں تین فلمیں بڑی خاص تھیں، جیسے ''شاردا'' ''مائی باپ'' اور ''بھابی'' ۔فلم ''شاردا'' میں حالانکہ راج کپور اور مینا کماری رومانٹک لیڈ میں تھے مگر شیاما کا بھی اس فلم میں ایک اہم کردار تھا۔ مینا کماری کی ہم عمر ہوتے ہوئے اُس نے جس خوبی سے اُس کی بہو کا کردار نبھایا تھا جس کے لئے اُسے اُس سال کا بہترین معاون اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا تھا۔اسی طرح فلم ''مائی باپ'' بھی ایک بڑی فلم تھی جس میں اُس کے مدمقابل بلراج ساہنی تھے ۔اس فلم کے ہدایت کار ایم صادق تھے جب کہ موسیقی سجانے والے او پی نیر تھے ۔اس فلم میں جانی واکر بھی ایک اہم کردار میں تھا۔تیسری فلم ''بھابی'' تھی ۔ یہ فلم بھی اے وی ایم کے بینر تلے بنی تھی ۔اے وی ایم اُس زمانے میں فلمسازی کا ایک معتبر اور مشہور نام مانا جاتا تھا۔ اس فلم میں بلراج ساہنی ایک اہم کردار میں تھے ۔ان کے ساتھ پنڈری بھائی نندہ، شیاما، اوم پرکاش اور درگا کھوٹے تھے ۔اس فلم میں جگدیپ بھی ایک جذباتی کردار میں تھا۔اس فلم کو چترگپت نے اپنی دلکش دھنوں سے سجایا تھا۔اس فلم کا ایک گانا ''چل اُڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیش ہوا بیگانہ۔ یہ گانا جگدیپ پر فلمایا گیا تھا۔ شروع میں یہ گانا طلعت محمود کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا کیونکہ چترگپت اور طلعت محمود کی گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں نے مل کر کئی خوبصورت گیت دئے تھے ۔ چترگپت کو شروع شروع میں سی گریڈ فلمیں ملیں ۔ایک دن اُس کی قسمت نے کروٹ بدلی۔ ہوا یوں کہ مدراس کے اے وی ایم ایک دھارمک فلم بنا رہے تھے جس کے لئے اُنہوں نے ایس ڈی برمن سے رابطہ کیا۔اُن دنوں برمن دا کا طوطی بولتی تھا۔ برمن دا نے دھارمک فلم میں سنگیت دینے سے معذوری ظاہر کی اور اُنہوں نے ہی چترگپت کے نام کی سفارش کی ۔ چترگپت کو کوئی بڑے بینر کی فلم نہیں مل رہی تھی۔اُس نے برمن دا کا شکریہ ادا کیا اور وہ اے وی ایم کی فلم میں سنگیت دینے کیلئے مدراس چلا گیا ۔اُس نے اُس دھارمک فلم کا سنگیت کمپوز کیا۔فلم کا سنگیت کافی مقبول ہوا۔ایک دو سال کے بعد جب اے وی ایم نے ''بھابی'' بنانے کا اعلان کیا تو اُنہوں نے چترگپت کو اس فلم کا سنگیت دینے کے لئے معاہدہ بند کیا یہ چترگپت کی پہلی بڑی فلم تھی ۔اُس نے جگدیپ پر فلمائے جانے والے گانے کو طلعت محمود کی آواز میں ریکارڈ کیا۔اس گانے کی شوٹنگ بھی ہوئی مگر سب کچھ ہونے کے بعد بھی گانے میں کچھ کمی لگ رہی تھی ۔جس طرح کی دھن چترگپت نے بنائی تھی اُس میں طلعت محمود کی آواز ہم آہنگ نہیں ہو پا رہی تھی۔ گانے میں جس طرح کی اُٹھان تھی اُس میں طلعت محمود کی آواز پھس ثابت ہو رہی تھی۔ بعد میں یہی گانا محمد رفیع کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔گانا ایسا کھل اُٹھا کہ اس گانے کی وجہ سے ناظرین فلم پر ٹوٹ پڑے اور فلم نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا 1958 میں شیاما کی صرف چار فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام ''تقدیر'' ''پنچایت'' ''لالہ رخ'' اور ''چندن'' تھا۔ ''پنچایت'' میں فلم کا ہیرو راج کمار تھا جب کہ منوج کمار بھی ایک اہم کردار میں تھا۔ ہیروئنوں میں پنڈری بھائی اور شیاما تھی ۔فلم ''تقدیر'' میں شیاما کا ہیرو کرن دیوان تھا۔ ''چندن'' میں کشور کمار، مالا سنہا، نوتن، پران اور شیاما تھے جب کہ ''لالہ رخ'' میں شیاما کا ہیرو طلعت محمود تھا۔اس فلم کی موسیقی خیام نے دی تھی ۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس فلم کے بیشتر گانے طلعت محمود نے خود گائے تھے جب کہ ایک گانا محمد رفیع کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔وہ ایک گانا بازی مار گیا۔گانا تھا۔ ہے کلی کلی کے لب پر تیرے حسن کا فسانہ''۔ یہ صدا بہار گانا آج بھی اُتنا مقبول ہے جتنا اُس زمانے میں تھا۔

1959 میں شیاما کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں ۔ یہ فلمیں تھیں۔ ''چھوٹی بہن'' ''دو بہنیں'' اور ''بس کنڈکٹر'' ۔ ''چھوٹی بہن'' مدراس کے پرساد پروڈکشن کی فلم تھی ۔اس کے ہدایت کار ساؤتھ کے جانے مانے فلمساز اور ہدایت کار ایل وی پرساد تھے ۔اس میں مرکزی کردار میں بلراج ساہنی، نندہ، شیاما اور رحمان تھے ۔ یہ بھائی بہن کے رشتے پر مبنی بیحد جذباتی فلم تھی جسے مشہور موسیقار جوڑی شنکر جے کشن نے اپنی مدھر اور متوالی دھنوں سے آراستہ کیا تھا۔اس کا رکھشا بندھن والا گیت جو ہر بہن اپنے بھائی کے لئے رکھشا بندھن کے تیوہار پر گاتی ہے۔ ''بھیا میرے راکھی کے بندھن کو نبھانا'' مکیش کا گایا ''جاؤں کہاں بتا اے دل'' محمود پر فلمایا گیا گانا ''میں رکشاوالا۔ میں رکشاوالا'' ایسے صدا بہار گانے ہیں جنہوں نے اس فلم میں چار چاند لگا دئے ۔اس فلم میں شیاما کا منفی کردار تھا۔ وہ اس طرح کے کردار میں کافی مقبول ہوئی تھی اس لئے ہر ہدایت کار کی کوشش ہوتی تھی کہ اس طرح کے کردار کے لئے شیاما کو سائن کیا جائے ۔

فلم ''دو بہنیں'' میں وہ فلم کی ہیروئن تھی جب کہ اُس کا ہیرو راجندر کمار تھا۔اس فلم کے موسیقار روسنت دیسائی تھے ۔ ''بس کنڈکٹر'' میں بھی شیاما مرکزی کردار میں تھی اور اُس کے مدمقابل پریم ناتھ تھا۔جیسی مقبولیت فلم ''چھوٹی بہن'' کو ملی اُتنی قبولیت ان دونوں فلموں کو نہیں ملی ۔

1960 میں بھی شیاما کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں ۔ یہ فلمیں تھیں۔ ''دنیا جھکتی ہے'' ''اپنا گھر'' اور ''برسات کی رات'' ۔ ''دنیا جھکتی ہے'' میں شیاما کا ہیرو سنیل دت تھا جب کہ فلم کا ہدایت کار جے بی ایچ واڈیا تھا۔اس فلم کا فلمساز ہومی واڈیا تھا۔فلم ''اپنا گھر'' میں شیاما کا ہیرو پریم ناتھ تھا جب کہ نندہ بھی اس فلم میں ایک اہم رول ادا کر رہی تھی ۔ان تینوں فلموں میں سب سے اہم فلم تھی ''برسات کی رات'' جس کے فلمساز

بھارت بھوشن کے بھائی آر چندرا تھے جب کہ ہدایت کار اُس زمانے کے مشہور رائٹر اور ڈائرکٹر پی ایل سنتوشی تھے۔ اُسی نے اس فلم کا منظر نامہ بھی لکھا تھا۔ یہ ایک تکونی پریم کہانی تھی اور یہ تین کردار ادا کرنے والے ستارے تھے بھارت بھوشن، مدھو بالا اور شیاما۔ اس فلم میں کل نو گانے تھے اور یہ گانے مشہور گیت کار ساحر نے لکھے تھے اور انہیں اپنی سریلی دھنوں میں باندھنے والے سنگیت کار روشن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مدھو بالا ساحر کے گانوں سے خوش نہیں تھی اس لئے اُس نے ''مجھے مل گیا بہانہ تیری دید کا۔ کیسی خوشی لے کے آیا چاند عید کا'' گانے کو اپنے اوپر فلمانے سے انکار کر دیا۔ چونکہ گانا ریکارڈ ہو چکا تھا اسلئے یہ گانا شیاما پر فلمایا گیا۔ جب شیام سے اس بابت پوچھا گیا تو اُس نے اس بات کی تردید کی۔ اُس کا کہنا تھا کہ مدھو بالا کی صحت بگڑنے لگی تھی اس لئے یہ گانا اُس پر فلمایا گیا۔ چونکہ اس فلم میں وہ بھی بھارت بھوشن سے پیار کرتی تھی اس لئے پی ایل سنتوشی کو یہ گانا شیاما پر فلمانے میں کہانی میں کوئی رد بدل نہیں کرنا پڑا۔ اس فلم کی یہ قوالی ''زندگی بھر نہیں بھولیں گے وہ برسات کی رات'' اس قدر مقبول ہوئی تھی کہ اُس کے بعد فلمسازوں نے اپنی فلموں میں قوالی کے لئے سچوئیشن نکالی لیکن جو مقبولیت اس قوالی کو ملی وہ کسی اور قوالی کو نہیں ملی۔ فلم نے فلمساز کے لئے روپیوں کی برسات کر دی۔ یہ بھارت بھوشن کی سب سے کامیاب فلم تھی۔

1952 سے لے کے 1960 تک شیاما نے محض آٹھ سالوں میں اسی فلموں میں کام کیا۔ ان میں سے بیشتر فلموں میں وہ بطور ہیروئن جلوہ افروز ہوئی۔ اسی طرح 1963 میں اُس کی اٹھارہ فلمیں ریلیز ہوئیں جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ 1964 میں اُس کی سترہ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ اُس نے اپنے پورے کیریئر میں ایک سو پچاس فلمیں کیں۔ اُس نے سارے چھوٹے بڑے ہیروز کے ساتھ کام کیا۔ دلیپ کمار کے ساتھ ''ترانہ'' راجکپور کے ساتھ ''شاردا'' دیو آنند کے ساتھ ''سزا''۔ یہ تو چند ایسی فلمیں ہیں جن میں شیاما کا رول دمدار تھا۔ اُس نے ہر چھوٹی بڑی فلم کی۔ 1950 سے لے کے 1960 کا دور شیاما کے کیریئر کا ایک شان دار دور تھا۔ اس ایک دہائی میں اُس نے کروڑوں دلوں پر راج کیا۔

جانی واکر اور شیاما نے ایک ساتھ کئی فلمیں کیں۔ شروعات ''آر پار'' سے ہوئی۔ اُس کے بعد جانی واکر نے شیاما کے ساتھ ''چھومنتر'' ''مسافر خانہ'' ''کھوٹا پیسہ'' ''جانی واکر'' ''مسٹر کارٹون ایم اے'' ''ٹھوکر'' اور ''کھیل کھلاڑی'' میں کام کیا۔ شیاما بڑی بنداس عورت تھی۔ وہ اپنے بارے میں کھل کے بات کرتی تھی۔ ایک انٹرویو کے دوران جب رپوٹر نے اُس سے پوچھا کہ ''آر پار'' میں آپ گورو دت کی جان من بنی تھی۔ یہ لو میں ہاری پیا اُس فلم کا وہ مشہور گانا جس میں آپ نے اپنا دل گورودت پر نچھاور کر دیا تھا، تب آپ کے دل میں گورودت کے لئے کوئی ایسا احساس جاگا تھا تو شیاما نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ فلم ''آر پار'' میں، میں گورودت کی محبوبہ بنی تھی جب کہ حقیقی زندگی میں میں فلی کی جان من تھی۔ اس فلم کا کیمرہ مین وی۔ کے۔ مورتھی جو ایک زمانے میں فلی مستری کا اسسٹنٹ تھا اُس پر نظر رکھتا تھا کہ کہیں اُس کا دل گورودت پر نہ آجائے۔ بہر حال ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اُس نے پوری طرح فلی مستری کا ساتھ نبھایا۔

شیاما نے دس سال تک دنیا سے اپنی شادی کو چھپائے رکھا۔ جب اُس کا پہلا بیٹا ہوا تب یہ راز منکشف ہوا۔ اُس نے تین بچوں کو جنم دیا۔ دو بیٹے فرخ اور رہمنگٹن اور ایک بیٹی شیرین۔ فروخ نے باپ کا پیشہ اپنا لیا۔ وہ ایک جانا مانا کیمرہ مین ہے۔ شیاما نے اپنے حساب سے اپنی زندگی جی لی۔ اُس نے اپنی کمائی کے ایک ایک پیسے کا استعمال بہت سلیقے سے کیا۔ اُس کے سامنے کئی ایسے ستاروں کی مثال تھی جنہوں نے خوب پیسہ کمایا اور اُسے بے دردی سے لٹایا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ پائی پائی کے محتاج ہو کے رہ گئے۔ اس معاملے میں شیاما بہت ہی ذہین اور چالاک ثابت ہوئی۔

شیاما نے ایک سو پچاس کے قریب فلمیں کیں۔ شادی کے بعد بھی اُس نے اداکاری سے سنیاس نہیں لیا بلکہ وہ مسلسل کام کرتی رہی۔ 1979 میں اُس کے شوہر فلی مستری نے اس جہاں کو الوداع کہہ دیا۔ یہ ایسا المیہ تھا جس نے شیاما کو توڑ کے رکھ دیا۔ فلی اُسکی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ شیاما اندر سے اتنی مظبوط تھی کہ اُس نے فلی کے چلے جانے کے بعد اپنے بچوں کی رہنمائی کی۔ وہ فلموں میں بدستور کام کرتی رہی۔ اُس کی آخری فلم جے پی دتہ کی ''ہتھیار'' تھی جو کہ 1989 میں ریلیز ہوئی۔

شیاما نیپن سی روڈ کے اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی تھی۔ شیاما کے بڑے بیٹے فرخ مستری ایڈ فلموں کے بہت بڑے کیمرہ مین ہیں اور وہ الگ رہتے ہیں جب کہ دوسرا بیٹا رہمنگٹن مستری لندن میں نوکری کرتا ہے۔ بیٹی شیریں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ شیاما ایک دم اکیلی اور تنہا تھی۔ گرتی صحت کے علاوہ اُسے بہت سارے گھریلو مسائل سے جوجھنا پڑا جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان رہنے لگی۔ اپنے آخری ایام اُس نے نہایت ہی تکلیف دہ حالات میں گزارے۔ کوئی اپنا اُس کے قریب نہیں تھا۔ وہ نوکروں کے سہارے جی رہی تھی۔ شیاما کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہ تھی مگر جس چیز کی کمی وہ ہر دم محسوس کرتی تھی وہ تھی اپنے بچوں کی جدائی۔ 14 نومبر 2017 کو شیاما نے اپنے محبوب فلی مستری سے ملنے کے لئے اس جہان فانی کو الوداع کہہ دیا اور وہ اپنے محبوب کے پاس چلی گئی۔ شیاما کی عمر اُس وقت بیاسی سال تھی۔ اُسکے جنازے میں بہت کم لوگ شامل ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیاما کے فلم انڈسٹری میں بہت کم دوست تھے۔ ایک فلم ہیروئن ایتا تھی، ایک شکیلہ تھی، ایک جانی واکر تھے اور ایک تبسم سے ملنا جلنا تھا۔

امّاں

امّاں کا نام صغرا تھا مگر خط کے نیچے انہوں نے کبھی نہیں لکھا۔
میں نے پوچھا: تم خط کے نیچے اپنا نام کیوں نہیں لکھتیں۔
امّاں کہتیں: صغرا کی زندگی تو تیرے آنے تک تھی، اُس کے بعد ساری زندگی تیرے نام ہوگئی اور میں صرف والدہ ممتاز ہو کے رہ گئی۔

ممتاز مفتی

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

محبِ گرامی، گلزار جاوید صاحب۔

تسلیمات۔

''چہارسو'' نے تو ہندوستان کے ادبی حلقوں میں دھوم مچا رکھی ہے ہر کوئی آپ کی بصیرت اور حسنِ نظر کی داد دے رہا ہے۔ زندہ باد مبارکباد ماشااللہ سبحان اللہ آپ کی ادارت کا کوئی جواب نہیں آپ کی محبت آپ کا اخلاص آپ کی بصیرت ہر صفحے پر آپ کا جلوہ دکھا رہی ہے اس عنایت کا تہہ دل سے ممنون ہوں اور دعا گو بھی۔

آپ میری طرف متوجہ کیسے ہوئے جبکہ میں قطعی تشہیر پسند نہیں ہوں اور عموماً میرے بارے میں اردو دنیا بہت کم آگاہ ہے کیونکہ میں نے اپنا قبلہ کبھی نہیں بدلا اور نہ اُن لوگوں کی دربارداری اور چاپلوسی کی جو مختارِ کُل سمجھے جاتے تھے اور جن کے پاس پاور تھا۔

پروفیسر عتیق اللہ (دہلی)

برادرِ مکرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

علم وادب کے روشن مینار پروفیسر عتیق اللہ صاحب سے منسوب چہارسو ہمدست ہوا۔ پروفیسر صاحب کی نسبت تمام مقالے اپنے اندر علم کا سمندر سموئے ہوئے ہیں۔ باقی کی کسر آپ نے سوالات کی شکل میں پروفیسر صاحب کو دعوت کلام دے کر کچھ اس طرح پوری کی کہ مطالعے کے بعد دل ودماغ معطر ہو گئے۔

آپ تخلیق کار کے ذہن اور دل پر اچانک مسلط نہیں ہوتے بلکہ اپنے ممدوح کے ساتھ اس کی مانوس سرزمینوں میں جہاں متعلقہ حوالے موجود ہوتے ہیں محوِ کلام رہتے ہوئے کبھی سرگوشیوں میں کبھی خوفِ فسادِ خلق کے باوجود اپنی بات اچانک خوبصورتی سے کہہ ڈالتے ہیں۔

شاہین (کینیڈا)

محترم گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ بنام عتیق اللہ سید ملا۔ حسب دستور آپ نے رنگا رنگ پھولوں سے سجایا ہے جو دلفریبی کا سبب بنا ہے۔ پھر حسب سابق پس ورق پر راشد صدیقی کا غضنفر پر مختصر مگر پُر اثر مضمون اور شمیم طارق کا شمع اختر کا ظمی مدلل اور قابل توجہ مضمون نے بھی اپنی جانب توجہ کھینچی۔

سب سے پہلے براہِ راست پڑھا، آپ تو انٹرویو کے ماہر ہیں کم وبیش چالیس سال سے آپ ادب کے مشاہیر کے انٹرویو شائع کر رہے ہیں اور آپ نے ان انٹرویوز کو کتابی صورت میں شائع بھی کیا ہے۔ آپ نے عتیق صاحب کے ادبی سفر اور ان کی زندگی کے حالات کا بھی اچھا احاطہ کیا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں یعنی عتیق صاحب جلال آباد (افغانستان) اور سوات (پاکستان) سے ہوتے ہوئے اجین یعنی مدھیہ پردیش اور پھر اورنگ آباد اور دہلی تک پہنچتے ہیں۔ بہت خوب یہ دلچسپ بات ہے یعنی نسل انسانی صدیوں سے اسی قسم کی خانہ بدوشی کرتی رہی ہے یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ لکھ رہا ہوں کہ امریکہ میں سرخ ہندوستانی کے قبائل کے بارے میں تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایشیا کے سرد برفانی علاقوں کے لوگ تھے جو صدیوں پہلے سمندر کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو پار کر کے شمالی امریکہ وکینیڈا میں داخل ہوئے تھے۔ انگریزی کی ایک مثال ہے کہ ''دنیا بحرحال بہت چھوٹی ہے۔''

شمارے کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے اور عتیق صاحب کے ادبی کارناموں اور ان کی تخلیقات کے متعلق مجھے خالد جاوید کا ''میرے عتیق اللہ'' اچھا لگا۔ عمر فرحت کا عتیق اللہ شناسی بھی ایک جامع مضمون ہے۔ پروین شیر صاحبہ قلم سے پھوٹتی کرنیں بھی دل کو پکڑ لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ عتیق صاحب کا ''بین العلومی تنقید کے بنیاد ساز'' ایک پرمغز مقالہ ہے جو بہت متاثر کن ہے۔

افسانوں میں سب سے پہلے آغا گل جو میرے نزدیک اردو ادب کے نہایت بلند پایہ ادیب ہیں اور متواتر چونکا دینے والے افسانے لکھتے ہیں کا افسانہ ''تھیلے میں کشمیر'' حسب سابق دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ انہوں نے چند دلیرانہ موضوعات کو چھوا ہے۔ اس مد میں انہوں نے بلوچستان کے پس منظر میں بھی چونکا دینے والے افسانے لکھے ہیں۔ جاوید خانزادہ یعنی تابش کا خانہ پُری بھی کاٹ دار تخلیق ہے۔

اس شمارے میں آپ نے عبداللہ جاوید کو خاص طور پر خاص عزت دی وہ یقیناً تھے بھی اسی قابل۔ ان پر دو مضامین حسن منظر اور فیصل عظیم کی تحریریں شامل ہیں۔ کرن ڈیسائی پر لکھے تعارف ''یاترا'' میں انگریزی کی بہتات تھی اس لیے میں اس سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔

حصہ نظم وشاعری کچھ کمزور لگا زیادہ تر وہی پرانے خیالات تھے مگر عتیق صاحب کی شاعری کے نمونے میں کچھ نئی اور چونکا دینے والے مضامین باندھے ہیں۔ آلِ انوار کا خاک شفا حسب دستور چٹ پٹی زبان اور جملے ہیں اس قسط میں مجھے لگا کہانی سست ہو گئی ہے۔ شمشاد بیگم پر مضمون معلوماتی ہے مگر چونکہ یہ میرا بھی پسندیدہ موضوع ہے اور میں خود برصغیر کی فلمی صنعت کی تاریخ پر کئی سال سے کام کر رہا ہوں اس لیے میرے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ دراصل لاہور یا یوں کہیں کہ پنجاب کی صنعت کی بہت آبیاری کی ہے خطوط کا کالم بھی خوب تھا مگر اب کچھ نئے نام ہونے چاہئیں۔

فیروز عالم (لاس اینجلس)

''چہارسُو''

عزیزی گلزار جاوید، سلام مسنون۔

چہارسو کے خصوصی نمبر مجھے باقاعدگی سے محترمہ رینو بہل کی معرفت پی ڈی ایف فارمیٹ میں ملتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ آپکی لگن اور مستقل مزاجی کے لئے دل ہی دل میں آپ کو داد اور دعا دونوں دیتی رہتی ہوں۔ بس رابطہ نہیں ہو سکا۔ خیر تو ابھی عتیق اللہ صاحب سے منسوب شمارہ رینو جی نے بھیجا ہے۔ ابھی مزے لے لے کر پڑھ رہی ہوں اور آپ کو داد دے رہی ہوں۔ کیا شاندار ہستی کا آپ نے انتخاب کیا ہے۔ سلامت رہیں

ذکیہ مشہدی (پٹنہ)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (جلد ۳۱، شمارہ ستمبر اکتوبر ۲۰۲۲ء) ۲۷۔ جون ۲۰۲۲ء میں سخت گرمی اور شدید لوڈشیڈنگ کے دنوں میں ملا۔ میر پور خاص میں بلدیاتی انتخابات کے سلسلے میں سرکاری ذمے داریوں کے سبب ایک ماہ مصروف رہا۔ پروفیسر عتیق اللہ صاحب سے ''براہِ راست'' میں ملاقات پہلی اور ایسی ہے جس میں اجنبیت نہیں رہی۔ آپ کے سوالات کے جوابات عتیق اللہ صاحب نے سنجیدگی سے تفصیلی دیے۔ بچپن، لڑکپن، اسکول کالج کے زمانے کو تفصیل سے بیان کیا۔ اُن کا یہ ارشاد کہ ''آٹھویں جماعت میں کہانی کی کتابیں پڑھنا، جمع کرنا اور مسجد میں رحل پر رکھ کر ناول میں کھو جانا مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ یہ ناچیز آٹھ آنے اور ایک روپے والی کہانی کی کتابیں اپنی جیب خرچ سے جمع کر کے خریدتا اور جب رقم زیادہ (اُس وقت کے طالب علم کی نظر میں) تو اشتیاق احمد کے ناول خریدتا ورنہ آنے کرائے پر حاصل کر کے پڑھتا۔ رمضان میں ظہر کی نماز کے بعد ایک پارہ تلاوت کرنے کے بعد مسجد کی پہلی منزل پر جا کر خصوصاً تاریخی کتب کا مطالعہ کرتا مثلاً ''جب امرت سر جل رہا تھا'' ''شہاب نامہ'' ''جلیانوالہ باغ'' اور اس قسم کی کتب۔۔۔ عتیق اللہ صاحب نے نثری نظم، جدیدیت اور ما بعد جدیدیت اور اپنے تنقیدی نظریات پر کھل کر بات کی ہے۔ محترم نے جو اپنے اشعار منتخب کیے ہیں اُس زمانے میں ایسی لفظیات اور بیان ہضم کرنا مشکل تھا۔ احمد مشتاق کنول نے عتیق اللہ صاحب کا خاکہ توجہ سے تحریر کیا ہے اُن کی شخصیت کو پس منظر سے پیش منظر میں لا کر ابھارا ہے عتیق اللہ صاحب کا یہ اعتراف بھی خوب چسپاں کیا ہے:

''شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں رہ کر میں نے سکھانے سے زیادہ سیکھا ہے۔'' (ص۔۸)

یہ بڑے لوگوں کا ظرف اور بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ محمد انعام الحق نے ''گمان کی زد میں'' صاحبِ اعزاز کا تعارف نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ محترم فاری شاعر نے غزلیہ انتخاب انتہائی متنوع اور شاندار کیا ہے۔۔۔ خالد جاوید نے میرے عتیق اللہ کو جدید نقاد اور اہم شاعر قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر انتخاب حمید خان نے ''شعری سفر کی ثقافتی جہتیں'' میں انگریزی ادیبوں کے حوالوں کے ساتھ ایسے غزلیہ اشعار کی تفہیم کی ہے جو معاشرے کے منفی، الجھے ہوئے اور ثقافت میں چھپی ہوئی اذیتیں اور مشکلیں ہیں بہترین تحریر ہے۔ محترمہ پروین شیر صاحبہ نے ''قلم سے پھوٹتی کرنیں'' میں افسانوی اسلوب کا سہارا لیا ہے فن اور شخصیت پر خوب صورت تحریر ہے۔ عتیق اللہ صاحب کی نازک مزاجی کا ذکر بھی خوب ہے۔

''رس رابطے'' اور ''براہِ راست'' کے بعد 'خاکِ شفا'' بڑی توجہ سے پڑھتا ہوں۔ یہ ناول کیا ہے ایک الگ جہان ہے۔ اسلوب، زبان، کردار نگاری، جزئیات اور مکالمے سب متاثر کن ہیں۔ ناول ۱۸۵۷ء تک پہنچ گیا۔ انقلابیوں کا ذکر، مغل شہزادوں کی محلاتی سازشیں، حکمرانی کی ہوس، بھائی کا بھائی قاتل، بیٹا باپ کا دشمن، تاریخ بڑی داغ دار ہے۔ اذان دیتے ہوئے بائیس مسلمانوں کی شہادت کا واقعہ بھی فنی مہارت سے چسپاں کیا ہے۔ جو مسلمانوں کے غدار تھے وہی ہندوستان اور یہاں عیش و آرام سے ہیں۔ منگل پانڈے جو ایک ناقابلِ فراموش کردار ہے اور بھگت سنگھ کا ذکر خوب رہا۔ صفحہ ۹۸ پر پیشوں کے نام کس قدر جمع کیے۔ واہ دلچسپی اور تجسس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

محترمہ شہلا نقوی ''آسیب زدہ کوٹھی'' کہانی کو اچھے افسانے میں بدل نہیں سکیں۔ رئیس صدیقی کا افسانہ ''سسکتا رشتہ'' حرام کی کمائی سے پیدا ہونے والے مسائل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ رعنا کوثر کا افسانہ ''ادھورا جسم'' میں کہانی نے بڑی تیزی سے سفر کیا ہے۔ یہ افسانہ امریکہ میں مقیم غیر ملکی (خصوصاً مسلم خاندان) کے رشتوں کے مسائل، غیر قانونی طور پر امریکہ میں داخل ہونے والے پریشان حال لوگوں کی گرفت مصنفہ نے اہم موضوع پر اچھا افسانہ تحریر کیا ہے۔ عارف نقوی اور حنیف سید کے افسانے اپنی بنت اور اسلوب کے لحاظ سے متاثر کرتے ہیں۔ ''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول نے شمشاد بیگم کی داستانِ حیات و محبت اور اصول پسندی و کامیابیوں کو اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہے۔ شمشاد بیگم کا گانا ''میرے پیا گئے رنگون'' اور ''دیدار'' فلم کا گانا ''بچپن کے دن بھلا نہ دینا'' آج بھی سنے جاتے ہیں۔ کیا آواز تھی۔ غزلوں کا انتخاب خاصی محنت سے کیا گیا۔ میکش امروہوی، ماہر اجمیری، نبیل احمد نبیل، اوصاف شیخ، ڈاکٹر ریاض احمد، نسیم شیخ، نادیہ گیلانی، حمیرا راحت، وشال کھلر، محبوب اصغر، فرح کامران اور نسرین نقاش کی غزلوں کے اشعار دل کے قریب محسوس ہوئے چنیدہ شعر:

شام کاسے میں بھر کے لائی سوال
رات بھر ایک اک جواب سیا
(اوصاف شیخ)

ہے سجدے میں مری گوشہ نشینی
میں اس کی نگہبانی کر رہا ہوں
(نسیم شیخ)

یونہی جو آتے رہے گاؤں شہر کی زد میں
نہ کھیت ہوں گے نہ گندم کی بالیاں ہوں گی
(نسرین نقاش)

نہ جانے ختم کہاں ہو گا یہ سناٹا
جو آبسا ہے محافل میں اُن کے جانے سے
(محبوب اصغر)

اسے بھولی ہوئی کوئی کہانی مار ڈالے گی
تجھے اس دے تری یہ خوش گمانی مار ڈالے گی
(حمیرا راحت)

ڈاکٹر فیروز عالم، رینو بہل اور ڈاکٹر ریاض احمد کے خط اہم ہیں۔ وجیہہ الوقار احباب کے خطوط کو عمدگی سے ترتیب دے رہے ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ڈاکٹر عتیق اللہ صاحب سے منسوب ہے جو اردو ادب کی دنیا میں شاعری اور تنقید کے حوالہ سے ایک بڑا نام ہے۔ پروین شیر صاحبہ نے ''قلم سے پھوٹتی کرنیں'' کے عنوان سے ایک خوبصورت تعارف ڈاکٹر عتیق اللہ صاحب کے حوالہ سے تحریر کیا ہے اور تفصیل سے ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ آپ کے حسن انتخاب کی داد دیتا ہوں۔

شمارہ میں اچھے افسانے، مضامین اور شاعری شامل ہے۔ ''خانہ پُری'' کے عنوان سے تابش خانزادہ صاحب نے اس افسوس ناک صورتِ حال کا ذکر کیا ہے جو وطنِ عزیز میں کرپشن کی وجہ سے درپیش ہے اور بلند بانگ دعوؤں کے باوجود کوئی بھی حکومت بشمول مارشل لاء اُسے ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور ملک کے بہترین دماغ مایوس ہو کر وطن کو اسی وجہ سے خیرآباد کہہ کر دوسرے ممالک میں چلے جاتے ہیں۔

''تاریخ کا پروفیسر'' عارف نقوی صاحب نے اپنے افسانے میں ایک حقیقت پر نظر ڈالی ہے جو بالعموم نظروں سے اوجھل رہتی ہے اور وہ یہ ہے تاریخ لکھنے والے اکثر اپنے زاویہ، عقائد اور قومی نقطہ نظر سے کچھ کمی بیشی کے ساتھ سے تحریر کرتے ہیں۔ مضمون میں بہت سی مثالیں دیکر پروفیسر صاحب نے اپنے دعوی کو ثابت کیا ہے۔ اکثر انسان اور قومیں اپنے مظالم کے دفاع میں وہ سب کچھ بیان کر دیتے ہیں جس کا حقیقت سے تعلق نہیں ہوتا۔

''تھیلے میں کشمیر'' آغا گل صاحب نے کشمیر کی آزادی کے حوالے سے اپنوں کی بے حسی اور غفلت کے حوالہ سے کچھ تاریخی اور حقیقی واقعات کا حوالہ دیا ہے جو انتہائی شرمناک ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور تقسیم ہند کے فارمولا کے مطابق اسے پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا لیکن ہندوستان نے وہاں قبضہ کر کے ظلم مچا رکھا ہے۔ ساری دنیا دیکھ رہی ہے لیکن مذہبی تعصب کی بنیاد پر خاموش ہے اور احتجاج تک نہیں کرتی جیسا کہ یوکرین کے لیے کیا جا رہا ہے۔ پاکستان نے ۱۹۶۲ء میں کشمیر آزاد کروانے کا ایک بہترین موقع گنوا دیا جب چین نے ہندوستان کی سرحدوں پر حملہ کر کے پیش قدمی شروع کی اور ہندوستان کی افواج کلکتہ تک پسپائی اختیار کر چکی تھیں تو ہندوستان کی حکومت کو خدشہ تھا کہ پاکستان کشمیر پر حملہ کر کے آزاد کروائے گا چنانچہ اس وقت کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کو اس وعدہ کے ساتھ پاکستان بھیجا گیا کہ وہ کشمیر کی آزادی کے مذاکرات کے لیے تیار ہے معاملہ کو طول دیکر وہ وقت گزار لیا گیا اور بعد میں نہرو لیاقت معاہدہ کا استصواب رائے کا موقف پھر ترک کر دیا گیا۔ یہ ظلم کی رات کشمیری مسلمانوں پر ہنوز طاری ہے اور دنیا تماشا دیکھ رہی ہے۔

''سسکتا رشتہ'' رئیس صدیقی صاحب نے ایک ایسی صورت حال کا افسوس ناک منظر نامہ تحریر کیا ہے جو باعث سبق اور عبرت ہے۔ اس میں لکھا گیا ہے کہ شراب اور جوئے کی عادت کس طرح ایک اچھے بھلے گھرانہ کو برباد کر دیتی ہے۔ اندازِ تحریر بھی عمدہ ہے۔ ''ادھورا جسم'' رعنا کوثر نے اس عنوان سے کہانی تحریر کی ہے جس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ امریکہ میں میکسیکن (Mexican) لڑکی جو وہاں غیر قانونی طور پر مقیم تھی سے شادی اور پھر لڑکی کا مجبوراً اپنے وطن چلے جانا شوہر کے لیے بھی کتنا تکلیف دہ رہا اس پر روشنی ڈالی گئی ہے جو دوسروں کے لیے ایک سبق ہے۔ ''دھاڑ ممتا کی'' (حنیف سید) نے بڑی دلچسپ کہانی تحریر کی ہے۔ روز مرہ کی زندگی میں خواتین کے ساتھ گھر سے باہر بازاروں اور دوسری جگہوں پر اوباش لوگ چھیڑ چھاڑ اور دوسرے مجرمانہ سلوک کے لیے آمادہ رہتے ہیں اس صورت حال کی بڑی وجوہات میں ایک تو بروقت سزا نہ ملنا ہے اور دوسرا بعض نوجوان لڑکیوں یا عورتوں کا غیر ضروری نیم عریاں لباس، بن سنور کر گھر سے باہر گھومنا اور غیر محتاط رویہ بھی روا رکھنا ہے۔ پردہ دار خواتین میں غیر پردہ دار خواتین کے مقابلہ میں ایسے واقعات بہت کم ہوتے ہیں اس سلسلے میں گھر کے بزرگ اور دوسرے مرد حضرات کو چاہیے کہ وہ اس بات پر نظر رکھیں کہ غیر ضروری میک اَپ اور نیم عریاں لباس پہن کر گھر سے باہر نکلنے سے اجتناب کیا جائے۔

''خاکِ شفا'' پیرزادہ آلِ انوار کے تحریر کردہ ناول کی ساتویں قسط دلچسپی کے ساتھ پڑھی۔ تحریر میں تاریخی معلومات جیسے انگریزوں کی غداری، جانباز انِ وطن اور غدارانِ وطن کے قافلے اور دہلی کا کلچر حیرت انگیز ذخیرہ الفاظ کے علاوہ طرزِ تحریر قاری کے لیے باعث دلچسپی ہیں۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں شمشاد بیگم پر مضمون معلوماتی اور کافی دلچسپ ہے۔ شمشاد بیگم اپنی خوبصورت آواز اور گیتوں کے باعث کئی دہائیوں تک ہندو پاک کی مقبول ترین سنگر کے طور پہچانی جاتی رہیں لیکن آج وہ دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کے گیت اب بھی سننے والوں کے ذہنوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔ مضمون نے قارئین کے دلوں میں ان کی یاد تازہ کر دی۔

شاعری میں متاثر کن کلام شامل ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی، خالد اقبال یاسر، سید صادق حسین کاظمی، میکش امروہوی، فرح کامران، رضیہ اسماعیل کا کلام قابلِ ذکر ہے۔

''چہارسو'' کی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب اور قارئین کو فراہمی ایک

محنت طلب کام ہے اور آپ کے ذوق ادب کی بنا پر ممکن ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

شاید یہ نومبر ۲۰۲۰ء کی بات ہے کہ میرے ایک دوست علی عمران جو کہ ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور میں ایم فل اُردو کے طالب علم تھے اور اپنا تحقیقی مقالہ ''پاکستانی اقلیتوں کا اُردو ادب میں حصہ'' کے عنوان سے لکھ رہے تھے۔ ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ گلزار جاوید صاحب ایک ادبی رسالے ''چہارسُو'' راولپنڈی کے مدیر ہیں اور بہت اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ اُن کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر میرے دل میں آپ سے گفتگو کرنے کی خواہش جاگی اور پھر آپ سے ٹیلی فون پر رابطہ بھی ہو گیا۔ دوران گفتگو آپ نے کوئی غیر مطبوعہ افسانہ بھیجنے کے لیے کہا۔ جب افسانہ ملا تو آپ نے نہایت مہربانی سے اُسے اگلے شمارے میں شاملِ اشاعت بھی کیا اور چہارسو کی پی ڈی ایف فائل بھی بھیج دی۔ ''چہارسُو'' سے یہ میرا پہلا تفصیلی تعارف تھا۔ متاعِ چہارسو پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ رسالہ اہلِ ذوق کے لیے ایک اچھا ادبی پیکج ہے اور پھر یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ یہ جناب سید ضمیر جعفری صاحب بانی مدیر اعلیٰ کا لگایا ہوا پودا ہے جو کہ تقریباً تین دہائیوں سے اردو ادب کی خدمت کرنے والا رسالہ باقاعدگی سے منظر عام پر آ رہا ہے اور اب جیسے آپ کی ذاتی کاوشیں اور آپ کی پوری ٹیم کی محنت، سنجیدگی اور خلوص سے معیاری تخلیقات کے ذریعے ہر شمارے کو خاص شمارہ بنا دیتی ہیں، اس کام کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔

''چہارسُو'' کی خاص بات قرطاسِ اعزاز ہے جس کے لیے آپ نابغہ روزگار شخصیت کو تلاش کر کے اسے خوبصورت مضامین اور بامعنی و باکمال مکالمے سے اس کی شخصیت و فن کو ہمیشہ عمدگی سے متعارف کرانے میں کامیاب رہتے ہیں ساتھ ہی ''براہِ راست'' مکالمے کے ذریعے تخلیق کار کے دل کے گوشے میں پنہاں کئی حقائق اور فنی گہرائیوں کو چھوڑ کر اور اُس کی صلاحیتوں کا اعتراف کر کے ادب دوستی کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں جس سے وہ شمارہ تخلیق کار شخصیت کے لیے ایک دستاویزی حوالہ اور اثاثہ بن جاتا ہے۔

معیاری تحریروں کے حصول کے لیے ادبا اور شعراء سے مسلسل رابطہ آپ کا وصفِ خاص ہے۔ خدا آپ کو مزید ہمت، صحت اور توفیق عطا کرے کہ ''چہارسُو'' کی اشاعت کا خوبصورت سفر اسی طرح جاری و ساری رہے اور یہ روشن چراغ یوں ہی چمکتا دمکتا رہے۔ گلستانِ شعر و ادب میں محبتوں کے پھول مہکتے رہیں۔ شجرِ ادب کی شاخوں پر ہر قسم کے پرندوں کی سریلی آوازیں چاروں طرف پھیلتی رہیں۔

آصف عمران (لاہور)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسو کا تازہ شمارہ پروفیسر عتیق اللہ نمبر نظر نواز ہوا۔ آپ کی ہمت اور حوصلے کی داد دینی پڑے گی کہ آپ نے ایسی نامور ہستی کو گوشے کے لیے راضی کر لیا جس نے کبھی کسی رسالے کو اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کا خود انہوں نے اپنے انٹرویو میں اعتراف کیا ہے۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی براہِ راست دلچسپ رہا۔ پروفیسر صاحب کی شاعری بھی عام روش سے ہٹ کر محسوس ہوئی۔ ایک اور کامیاب گوشے کے لیے بے حد مبارک۔

افسانے سارے دلچسپ ہیں۔ عارف نقوی نے صحیح فرمایا ہے کہ حق کی بات کرنے والے کو دنیا پاگل ہی سمجھتی ہے۔ شہلا نقوی صاحبہ نے عورت کے درد کو خوب بیان کیا ہے۔ گھٹن بھری زندگی گزارنے کے بعد عورت کی بدحالی دل کو چھو جاتی ہے۔ آغا گل کا افسانہ کشمیر کے حوالے سے ملک کے حالات بیان کرتا ہے تو تابش خانزادہ کا کرپشن پر بیان کیا قصہ تھر ڈ ورلڈ کے ہر ملک کی تصویر کشی کرتا ہے۔ معذرت کے ساتھ جمیل صاحب کا افسانہ مجھے پکڑ نہ سکا۔ آصف عمران کا افسانہ انتظار پسند آیا اور اُس میں پنجابی الفاظ کی آمیزش اچھی لگی۔

رئیس صدیقی نے شراب نوشی کو رشتہ توڑنے کا الزام دیا ہے تو رعنا کوثر نے بیرون ملک میں رہنے والوں کے لیے رشتوں کی کیا قیمت ہوتی ہے دلچسپ انداز میں بتایا ہے۔ ویسے تو حنیف سید کے پہلے بھی کئی افسانے پڑھے ہیں مگر اس بار افسانے میں کئی جگہ جملوں میں الفاظ کی بے ترتیبی کھٹکی۔ ڈاکٹر صوفیہ شیریں نے مذہب کے نام پر اپنا الّو سیدھا کرنے والوں کو بے نقاب کیا ہے۔ آج کے دور میں یہ ہر مذہب کا چلن ہو گیا ہے۔ سبھی افسانہ نگاروں کو میری جانب سے مبارک۔

شاعری کا حصہ بھی حسب معمول معیاری اور دلچسپ ہے۔

اب ناول کی بات کریں تو ہر قسط پہلی قسط سے زیادہ دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ مصنف کی گرفت مضبوط سے مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی منظر کشی خوب کی۔ اپنے ہی لوگوں نے انقلابیوں پر ظلم ڈھائے۔ مختلف پیشوں اور مختلف ہتھیاروں کی جو تفصیل دی ہے وہ لاجواب ہے۔ بھگت سنگھ، سوکھ دیو اور راج گرو کی پھانسی کا واقعہ دل کو دہلا جاتا ہے۔ دوسری طرف شاہجہاں کی بنائی ہوئی عمارتوں کی تفصیل دے کر مصنف نے نہ صرف اس باب کو واقعات اور شاعری سے دلچسپ مگر معلوماتی بھی بنا دیا ہے۔ زبان و بیان کا کمال حاصل ہے۔ تاریخ کے اہم واقعات سے پردہ ہٹانے کی کوشش کامیاب رہی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔

دیپک کنول کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں نایاب شخصیات کو۔ شمشاد بیگم لاجواب۔ فلمز معلوماتی بھی ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ سب سے پہلے میں سارے فلمز ہی پڑھتی ہوں۔ باقی رسالے کا مطالعہ رفتہ رفتہ ہوتا ہے۔ میری جانب سے آئندہ شمارے کے لیے شبھ کامنائیں اور اس شمارے کے لیے بہت بہت مبارک۔ پرماتما آپ کو صحت یاب رکھے اور آپ کا یہ جنون برقرار رکھے۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

برادرِ مکرم جناب گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی چہارسو کا تازہ شمارہ اپنے ساتھ ڈھیروں خوشیاں سمیٹ کر لایا۔ پروفیسر عتیق اللہ صاحب اردو ادب کا بے حد قیمتی سرمایہ ہیں اور اُن کے علم و فضل سے اہلِ اردو کو متعارف کرانا ایک طرح سے کارِ ثواب ہے۔ بے حد خوشی کا موقعہ ہے۔ آپ کی نظرِ انتخاب کی داد۔

مبارک باد قبول فرمائیں۔

پرویز شہریار (دہلی)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی چہارسو تمام تر حشر سامانیوں سے لیس ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ صاحب بلند قامت ادیب، شاعر اور نقاد ہیں۔ ان کا انتخاب بجائے خود اعتبار کا حامل ہے۔ جسے آپ کی پیشکش نے دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ چہارسو کی اپنی ایک روایت ہے اور وہ اسی کے تسلسل میں سانس لے رہا ہے۔ آپ یقیناً اس روایت کے قیام و استحکام کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اشرف جاوید (لاہور)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

ستمبر اکتوبر ۲۰۲۲ء کا شمارہ موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح دلچسپ اس دفعہ شعیب حیدر زیدی، عظمیٰ رشید اور محمد عبداللہ کو دادِ تحسین دینا چاہوں گی کہ رنگا رنگ صفحات اور تدوین ان کی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر شمارے میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ امریکہ میں گرمیوں کا موسم پورا مہینہ گھومتے پھرتے گزرا۔ شمارہ پورا پڑھنے کی کوشش کی مگر پھر بھی شاید اتنا لکھ نہ پاؤں جتنا پڑھا۔

شروع کرتے ہیں براہِ راست سے آپ کے عتیق اللہ صاحب سے بہترین سوال اور ان کے بہترین جواب۔ بہت خوب۔ میں نے ان جوابات سے بہت کچھ سیکھا خاص طور سے افسانہ نویسی کے بارے میں جو کچھ کہا اسے کئی دفعہ پڑھا کہ میں خود افسانہ لکھنا سیکھ رہی ہوں۔ ''گمان کی زد میں'' ان کے تعلیمی پس منظر پیشے اور تخلیقات سے واقفیت ہوئی۔ بے شمار اعزازات ان کی معزز شخصیت کا پتہ دیتی ہے۔ مزید معلومات ان مضامین سے ملیں ''اردو کا خوش پوش ناقد''، ''میرے عتیق اللہ''، ''قلم سے پھوٹتی کرنیں'' اور ''عتیق اللہ شناسی'' یہ شعر بڑا بامعنی ہے۔

زمین کے اتنے سے ٹکڑے پہ اتنی دیواریں
کہ ایک شخص ادھر سے ادھر نہیں جاتا

افسانوں میں تمام افسانے تو نہ پڑھ سکی کوئی افسانہ بھی غیر معیاری نہ ہوگا جو پڑھے ان میں شہلا نقوی کا افسانہ ''آسیب زدہ کوٹھی'' اچھا لگا۔ شہلا ایک اچھی اور پُر اثر بات کہنے والی افسانہ نگار ہیں۔ بے زبان دوسری بیوی آسیب زدہ کوٹھی ہی ہو کر رہ جاتی ہے۔ حنیف سید کا ''دہاڑ ممتا کی'' ایک جذباتی افسانہ ہے ڈاکٹر شیریں کا ''یاترا'' دلچسپ افسانہ تھا۔ عارف نقوی کا ''تاریخ کا پروفیسر'' دل دکھانے والی حقیقت ہے ''سسکتا رشتہ'' رئیس صدیقی نے ایک عام سی کہانی لکھی ہے۔ آصف عمران کا ''انتظار'' تھوڑا پیچیدہ تھا مگر اچھا تھا۔ تابش خانزادہ کا افسانہ دورِ حاضر پہ نہایت خوبصورتی سے طنز ہے پسند آیا۔

غزلیں بھی اچھی لگیں۔ فرح کامران کی ''زخم بھریئے اور اسے رفو کیجیے بہت پیاری غزل ہے۔ عطیہ سکندر کی نظم بڑی نظم کا کنارہ بہت اچھی ہے ڈاکٹر ریاض احمد کی تیری محفل میں جو کچھ لمحے گزار آتے ہیں بہت خوبصورت۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر شاعر کو خراجِ تحسین دینے کو دل چاہتا ہے ''کرن ڈیسائی سے مکالمہ'' دلچسپ رہا۔ ایک صدی کا قصہ بہت پسندیدہ مضمون ہوتا ہے۔ عبداللہ جاوید پر لکھے تمام مضامین پڑھے بہت اچھے لگے۔

ناول خاکِ شفا میں ناول نگار جس طرح تاریخی پس منظر بیان کرتا ہے قابلِ ستائش ہے لکھنے کا انداز نہایت دلچسپ اور ڈائیلاگ لا ابالی لڑکوں کی تربیت کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ مصنف کامیابی سے ناول کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گی کہ آپ نے میرے افسانے ''ادھورے جسم'' کو پسند کیا جگہ دی شکریہ۔ مگر بقایا حصہ جو دوسرے صفحے پر تھا وہاں افسانے کا نام تبدیل ہو گیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سے قاری اختتام نہ پڑھ سکے ہوں گے۔ اب مکتوب کے ذریعے تمام افسانہ نگار، شعراء اور مضمون نگاروں کے لیے سلامتی کی دعا۔

رعنا کوثر (نیویارک)

- بقیہ -

ہجرتوں کا عذاب

فروری 1994 میں اباجی کے پراسٹیٹ کینسر کی تشخیص ہوئی۔ ان کی سرجری ہوئی۔ عید قربان کا زمانہ تھا۔ میں چھٹی پر کراچی گیا تھا۔ ابا جی بیماری سے صحتیاب ہو گئے تھے۔ میں جب واپس جدہ جانے لگا تو ان کے کمرے میں گیا۔ بستر پر دوسری طرف منہ کیے لیٹے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ " آپ جلدی سے مکمل طور پر ٹھیک ہو جایئے تو آپ کو ایک مرتبہ پھر جدہ بلاؤں گا۔ "انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا۔ فلائٹ کو دیر ہو رہی تھی اس لئے میں چلا آیا۔ میرے جدہ آنے کے آٹھویں دن 14 جون 1994 کو ابا جی کینسر سے ہار گئے۔ ہم دونوں بھائی باہر تھے۔ ابا جی کے جنازے کو کاندھا بھی نہیں دے سکے۔

1928 میں احسان خلیفہ نے دعا کی تھی کہ اللہ انہیں پوتا دے تا کہ ان کے جنازے کو کاندھا دینے والا کوئی ہو۔ نہ وہ پوتا اپنے دادا کے جنازے کو کاندھا دے سکا نہ ہی اس کے بیٹے خود اس کا جنازہ اٹھا سکے۔ یہ کیسا ہجرتوں کا عذاب ہے!

..... آوازوں کا شور .....

شہلا نقوی کی اپروچ مختلف اور تازگی بھری ہے۔انہوں نے عورت کو ہر زاویے سے دیکھا اور پرکھا ہے۔اس مجموعے میں عورتوں کا ایک مجمع ہے جس میں وہ ہر کردار کو اس کے انفرادی ماحول اور تجربوں کے تناظر میں رکھ کر مشاہدہ کرتی نظر آتی ہیں۔ان کا یہ مشاہدہ بہت سے سوال کھڑے کرتا ہے جو ادب کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔کسی مصلح کی طرح وہ جواب نہیں دیتی ہیں، بس فکر کو مہمیز دینے کا کام کرتی ہیں۔علاوہ ازیں اس مجموعے میں سانس لیتی زندہ عورتیں محض روتی دھوتی اور زخم چاٹتی نظر نہیں آتیں وہ اپنے اپنے طور پر اس دنیا سے نبرد آزما بھی ہیں اور اس دنیا کے سکھائے ہوئے طریقوں سے بھی۔ ''برنس'' کی خالہ، ''فیروزہ'' کی فیروزہ اور ''شناخت کی چوری'' کی دیبا جو زندگی کرنے کا ڈھب خود تلاش کر لیتی ہیں۔کچھ کہانیاں کرداروں کا عمدہ نفسیتی تجزیہ کرتی ہیں۔''آسیب زدہ کوٹھی'' کی ذکیہ خالہ جس طرح خاموشی سے ساری زندگی زہر پیتی ہیں اور ایک بارگی ہی اسے اُگلنا شروع کر دیتی ہیں۔یہ بیانیہ قابلِ داد ہے اور فوری طور پر قاری کو ذکیہ خالہ سے جوڑ دیتا ہے۔مصنفہ نے کہیں بھی ہم دردی جتائے بغیر جس ہمدردی سے یہ کردار خلق کیا ہے وہ قاری میں پوری طرح منتقل ہو جاتی ہے۔غلیظ گالیاں بکنے والی اس عورت پر نہ غصہ آتا ہے نہ اس سے نفرت ہوتی ہے۔نفسیات کے علاوہ طبقاتی فرق اور اس کے مضمرات بھی آپ کو ان افسانوں میں مل جائیں گے۔ان عورتوں کے ذریعے آپ کو پورا معاشرہ سانسیں لیتا نظر آئے گا۔مجھے نہیں معلوم کہ شہلا نقوی کتنے عرصے سے اپنی جڑوں سے دور ہیں لیکن ان کی سلیس اور بامحاورہ زبان میں اپنی مٹی کی خوشبو ہے، ادبی چاشنی کے ساتھ بڑا گھریلو پن ہے۔سچ کہوں تو کئی بھولے بسرے محاورے مجھے یاد آ گئے اور بڑا لطف آیا۔مثال کے طور پر چیونٹیوں بھرا کباب اور پھلکا سی ناک۔۔۔

ذکیہ مشہدی

قیمت: ۶۰۰ روپے، دستیابی: اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی

..... بنت داہر .....

THE STORY OF A CROWN PRINCESS OF SINDH

صفدر زیدی ہالینڈ میں مقیم ہیں اور تاریخ سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔قبل ازیں ان کا ناول بھاگ بھری بھی مقبول عام ہو چکا ہے۔عموماً کہا جاتا ہے کہ تاریخ ہمیشہ فاتح لکھتے ہیں لیکن زیرِ نظر ناول میں مصنف نے مفتوح کی کہانی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔نیز بنتِ داہر محض راجہ داہر، حجاج بن یوسف، محمد بن قاسم اور خلیفۃ المسلمین کے گرد نہیں گھومتا۔بلکہ اس ناول کے ذریعے صدیوں پر پھیلی متنازعہ تاریخ کو فکشن میں بیان کر کے عام قاری کے لیے ڈائجسٹ بنا دیا گیا ہے۔بنت داہر ریاستی بیانیے کے برعکس سندھ کی متبادل تاریخ ہے۔جو کہ چچ نامہ کی طرح شاید رقم تو نہیں ہوئی لیکن صدیوں سے باشندگان سندھ کی یادداشتوں میں محفوظ ہے۔یہ ناول دراصل ایک علمی بحث کا آغاز ہے، جو بہت سے تاریخی حقائق اور پہلوؤں کے از سرِ نو جائزے میں معاون ثابت ہوگی۔سو اگر آپ ایک عمدہ کتاب کی تلاش میں ہیں تو بنت داہر یقیناً آپ ہی کے لیے ہے۔

..... ساجد رشید .....

ساجد رشید کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق اردو افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تھا جو 1970 کے بعد ابھری۔ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ان کی دلچسپی ہندی اور مراٹھی زبان و ادب میں بھی تھی۔ہندی میں ان کا افسانوی مجموعہ 'سونے کے دانت' شائع ہو چکا ہے اور مراٹھی کے مشہور ناول 'جھاڑا جھڑتی' کا ترجمہ انھوں نے اردو میں کیا تھا جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی کا انعام برائے ترجمہ دیا گیا۔ساجد رشید کے افسانے ''ایک چھوٹا سا جہنم'' اور ''چادر والا آدمی اور میں'' کے لیے انھیں کتھا ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ساجد رشید ایک بے باک اور اصول پسند صحافی اور سوشل ورکر بھی تھے۔انھوں نے معاشرتی، سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل پر تقریباً چار دہائیوں تک بے لاگ مضامین لکھے جو ''زندگی نامہ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ادبی صحافت میں ان کا کارنامہ 'نیا ورق' تھا جس کے وہ مدیر تھے۔یہ بہت جلد اردو کا ایک اہم رسالہ بن گیا۔ساجد رشید پر مونوگراف رحمٰن عباس نے تیار کیا ہے۔رحمٰن عباس اردو کے اہم کہانی کار اور ناول نگار ہیں۔''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی''، ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' اور ''روزن'' کا شمار ان کے اہم ناولوں میں کیا جاتا ہے۔اگر آپ اس کتاب کی پرنٹڈ کاپی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو رابطہ کریں:

R. K. Puram, New Delhi

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
کلیاتِ جاوید
عبداللہ جاوید
نقش برآب
منٹو کا بھگت
(افسانے)
سید تحسین گیلانی
اردو میں قومی شاعری
ساجد رشید
UNDER THE SUN
Chander Bhan Khayal